

دولت



دورنگی

حبیب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تو شام کی بوند ابادی میں مال روڈ بیسک
ری تھی۔

میں جوتوں کی دوکان میں داخل ہوا، اس کے بڑے دروازے پر سونے جاپ
پلاندہ کی طرف پیش کشا ہوا تھا۔ دوکان میں ایڑکے پھٹکے دھڑکے ٹنگے اور شند
تھی۔ میں اندہ پہنچا تو میری نظر سب سے پہلی کسی کے پیروں پر پئی، وہ گری پریشی
تھی۔ سٹول پر اس کا برہنہ پاؤں تھا۔ ناکھوں پر آؤ کے ٹنگوں جیسی کیوٹس لگی تھی۔
اور سٹول کے پاس پانچ قبر کی سینڈلوں کا انبار دھرا تھا۔ اس پاؤں کو دیکھ کر مجھے
خیال آیا کہ کچھ عورتوں کی ساری زینت ان کے پاؤں ہوتے ہیں۔ ان کا چہرہ بے نقاب
ہے تو کوئی قیامت برپا نہیں ہوتی لیکن اگر ان کے پاؤں بے عجب سامنے آجائیں
تو دل خود شوک سکڑ کر مرجھانے لگتا ہے۔

میں جوتوں کی دوکان میں گھومنا داخل ہوا تھا۔ میری جیب میں اس قدر پیسے
نہ تھے کہ ٹائیٹوں کی جڑیں ہی خرید سکتا۔ لیکن میں نے اس کے سامنے بیڑ کر مار
اور پیٹتے بعد کے بوٹ پہننے اور ٹانگے شروع کر دیئے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے

گنی اور گھری طرف چل پڑا۔

تیسری مرتبہ میری ملاقات اُس سے دن کے ساڑھے دس بجے ایک لمبے برآمدے میں ہوئی۔ میں اپنی بہن کو ایف اے میں داخل کروانے کی غرض سے کالج کے برآمدے میں بیٹھا تھا۔ یہ برآمدہ پرنسپل صاحبہ کے دفتر سے ملحق تھا اور دفتر سے بار بار گھنٹی بجنے کی آواز آتی تھی۔ برآمدے میں لڑکیوں کے ہجوم کے ساتھ ساتھ ان رشتہ داروں کا انہو بھی موجود تھا جو بطور سفارشی آنے ہوئے تھے۔ ایک بار جب اس گھبرائے ہوئے گروہ سے میری نظر چیر کر آگے نکلی تو میں نے دیکھا وہ پروفیسر والاسیہ گاؤن پہنے سیاہ تختے پر کوئی نوٹس لگانے میں مشغول تھی۔ کاغذ پر غالباً گوند لگی تھی جو بورڈ پر چپکانے کے باعث اس کی انگلیوں پر اتر آئی تھی۔ اس چپچاپ ہٹ کو چھوٹے سے چمک رومال سے پونچھتی وہ میرے پاس سے گزری تو خوشی کا ایک ہلکا سا جھوڑکا ادھر ادھر پھیل گیا۔ میں نے جسارت کرتے ہوئے آواز دی —
”بس!“

وہ ذرا سی گردن پیچھے کو موڑ کر رُکی اور انگریزی میں بولی۔ ”یس میں آپ کے لئے کیا کر سکتی ہوں۔“

اس کی انگریزی پر کونونٹ کا مانجھا چڑھا ہوا تھا۔ آواز میں ایک ترنم تھا۔ جو غالباً نشاط آرا ریڈیو اور فلم فیم سے ورثے میں ملا تھا۔

میں نے اپنی بہن کے داخلے کی مشکل بیان کی تو وہ خالصتہً سرکاری لہجے میں بولی۔ ”دیکھئے اگر ان کی فیسٹ ڈویژن نہیں آسکی تو انہیں کچی اور کالج میں کوشش کرنا چاہیئے داخلے کے لئے۔ یہاں تو ہم سینڈ ڈویژن کو بھی ENTERTAIN نہیں کر رہے۔“ یہ جواب سن کر میری بہن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”اور اگر کوئی لڑکی اسی کالج میں پڑھنا چاہے، تھرڈ ڈویژن کے باوجود۔ تو؟“

ایک سفید سینڈل پیروں میں پھنسا یا اور جوٹ کے قالین پر اٹھ کر چلنے لگی۔ گہرے نیلے قالین پر سفید سینڈلوں میں اُٹھتے اور پڑتے سفید پاؤں! میرے دل کو یک دم بریک لگ گئی۔

اس کی ایک ٹانگ میں کچھ نقص سا تھا۔ غیر واضح سا نقص۔ شاید بچپن میں پولیو ہوا ہو اور اس کے کچھ اثرات باقی رہ گئے ہوں۔ وہ کوہلے پر بوجھ ڈال کر اور ایک پاؤں دبا کر چلتی تھی — سفید سینڈلوں میں سفید ڈونگے میری نظروں سے قید آؤٹ ہو گئے۔ میں نے آنکھ کا کیمرا بند کیا اور نیا سیکونس شروع کرنے کے لئے بڑا آئینہ دروازہ کھول کر اس برآمدے میں نکل آیا۔ جہاں بے بی چپس بیچنے والا بارش کے رکنے کا منظر کھڑا تھا۔

دوسری مرتبہ جب میں گھروالوں کے لئے کاغذی بکروں کے پائے خریدنے لوہاری تک پہنچا تھا تو وہ مجھے نظر آ گئی۔ آج اُس نے برقعہ پہن کر نقاب الٹ رکھا تھا۔ مجھے پہلی بار اُس کی چال پر اعتراض ہوا تھا۔ لیکن اس بار اس اعتراض پر ہلکی سی گرد پڑ گئی اور میں کچھ فاصلے پر رہ کر اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ وہ ایک چھوٹی سی بچی کے ساتھ مسلسل بائیں کئے جا رہی تھی۔ ان باتوں کے علاوہ اُن دونوں کے منہ میں پان تھا۔ جس کا رنگ اُن کے ہونٹوں پر اس طرح اتر آیا تھا۔ جیسے شہد میں کسی نے زعفران گھول کر ملا دیا ہو۔ بالآخر وہ ایک ایسے مکان کے سامنے جا کر رک گئی جس کے باہر ایک مشتبہ سے بورڈ پر لکھا تھا۔ نشاط آرا ریڈیو اور سیٹج فیم بچی نے دروازہ دھڑ دھڑایا۔ ایک قوال صورت آدمی نے دروازہ کھولا اور وہ دونوں اندر داخل ہو گئیں۔ میں نے دل ہی دل میں لا حول پڑھی اور سوچنے لگا کہ کون جانے اس کا نام بے بی مشتری ہو اور یہ مویشیوں کے میلے پر گھنے والے تھیسڑ میں ناچتی گاتی ہو؟ ٹانگ میں نقص رکھنے والی طوائف کا تصور آتے ہی میں نے کاغذی پائے سے بھرا تھملا کھولا۔ جیب کی ریڑکار کا

”دیکھئے چاہتا تو انسان بہت کچھ ہے لیکن عموماً بہت کچھ مل نہیں جاتا۔“
وہ یہ جواب دیتے ساتھ ہی آگے کی جانب بڑھ گئی۔

”لنگر دین! بجائے یں! — اُتراتی کس قدر ہے۔“ میری بہن کی آواز آئی۔

جس وقت میری بہن پرنسپل صاحبہ کے دفتر سے بھیگی ہوئی آنکھیں پونچھتی باہر نکلی تو مجھے عجیب قسم کی خوشی ہوئی۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے لنگر دین پکالنے والی کو کالج میں داخلہ نہ دے کر پرنسپل صاحبہ نے مجھ پر کوئی احسان کیا ہو۔

ملاقاتوں کا سلسلہ یہاں سے یوں پھیلا کہ پاؤں تو اس کے دھنک کی طرح دھرتی پر جیسے رہے اور رنگ اس کے آسمان تک تن گئے۔ ان ہی رنگوں کا جادو تھا کہ میں ہر شام ہوسٹل کے سامنے نواڑی کرسی پر بیٹھتا اور مس دلبری حیدر کی راہ نکلتا رہتا۔ ایسی ہی ایک ملاقات کے دوران میں نے ایک دن دلبری حیدر سے کہا — ”تمہارا نام دلبری کس نے رکھا ہے۔ بڑا اداہیات نام ہے۔“

اس نے میری صاف گوئی پر بُرا مان کر جواب دیا۔ ”میری چچی جان نے میرا نام رکھا تھا۔“

”چچی جان نے؟“

”اُن کی چھوٹی بہن کا نام دلبری تھا، بیپاری کی ابھی ننھنی بھی نہ اُترتی تھی کہ مر گئی۔“

ننھنی کا ذکر ایک پروفیسر قسم کی عورت کے منہ سے سن کر میرے کان ہلنے لگے۔

”ننھنی؟ — لیکن — ننھنی تو کنواری کوٹھے والیاں پہنتی ہیں۔“
”تو میری چچی وہیں کی ہیں ناں — نشاط آرا نام ہے اُن کا چچا جان سے

شادی کر لی ہے انہوں نے اب“ میں محبوب سا اس کا منہ تکیے لگا — خدا قسم آپ نہیں جانتے وہ کس قدر نیک اور پاک باز عورت ہے، ساری عمر کی کمائی میرے چچا کے پیروں میں لا ڈالی، گریٹ عورت ہے گریٹ — مجھے تو جو کچھ نشاط چچی کہہ دیں میرے لئے پتھر پر لکیر ہو جاتی ہے۔“

لیکن میرے دل کے سنگ مرمر پر اتنی جلدی لکیر نہیں پڑتی اسی لئے میں بد دل ہو کر وہاں سے اُٹھ آیا۔

اس واقعے سے پہلے ہمارے گھر کی نائین دلبری خانم کے گھر میرا رشتہ لے کر جا رہی تھی۔ واپسی پر علم ہوا کہ دلبری خانم کی ماں تو رشتہ کرنا چاہتی ہے لیکن باپ چونکہ پھر برس سے اس کی کمائی کھا رہا ہے اس لئے اسے بہت پس و پیش ہے اور وہ کہتا ہے کہ ہاں سے باہر ہر گز شادی نہ کرے گا اور سید بھی بخاری ہوں، تبھی شادی ہو سکتی ہے۔

ابھی ملاقاتیں شوکیں کی طرح آراستہ اور جگمگاتی تھیں اس لئے مجھے اپنے گھر والوں پر بہت جائز غصہ چڑھا اور میں نے گھر میں وسعتِ قلب پر وہ لیکچر دیئے کہ پنڈال ہیں اور کسی کو بولنے جو گانہ چھوڑا۔ مگنی ہو جانے کے دسویں روز پتہ چلا کہ دلبری کے گھر والے سید نہیں ہیں۔ مرثی ہیں اور اُن کا شجرہ نسب جھوٹا ہے۔ گھر والے مورچکھ اکالنے ہوئے کوؤں پر تبصرہ کرتے رہے اور میں ہوسٹل پہنچا۔ دلبری چند پروفیسر نما ایلیوں کے ساتھ فلم دیکھنے جا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر لان کی طرف آئی۔ مجھے تھوڑی دیر کے لئے اس کی کید و نما چال پر بہت غصہ آیا۔

”مزاج بخیر ہیں آپ کے، کچھ تیوری چڑھی ہے آج۔“ دلبری نے نواڑی کرسی پر پاؤں رکھ کر سینڈل کا بکل لگایا اور میری جانب دیکھنے لگی۔
”کچھ جواب نہ دیجئے گا؟“

میں پھر بھی چپ رہا۔

”دیکھئے میری ہیلیاں منتظر کھڑی ہیں، پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے آپ وجہ تو بیان کیجئے منہ تھمتھانے کی“

”آپ وجہ نہ پوچھئے، فلم دیکھئے۔ پہلا، دوسرا اور تیسرا شو“ یہ کہہ کر میں اٹھا اور موٹر سائیکل کی جانب چل دیا۔

”خیر پہلا شو تو اب تک ختم ہو چکا ہو گا آپ کہیں تو دوسرا شو بھی چھوڑ سکتی ہوں“ اُس کی آواز میں ایک دبی سی التجا تھی۔ میں واپس لوٹ آیا۔

”آپ کے گھر والے سچ کیوں نہیں بولتے؟“

”اور آپ کے گھر والے سچ کا اس قدر مطالبہ کیوں کرتے ہیں؟“

”سچ کے بغیر کوئی رشتہ قائم نہیں ہو سکتا ہے۔“

اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آگئی اور وہ اہستہ سے بولی۔ ”خیر میں آپ کے ساتھ یہاں اتفاق نہیں کر سکتی، میرے نزدیک جو رشتہ سچ پر قائم ہوتا ہے۔ ہمیشہ شکست و ریخت سے دو چار ہوتا ہے۔ کوئی شخص بھی سچ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ عزیز سے عزیز شخص کو بھی ہمیشہ کوئین CAPSULE میں بند کر کے پلانا پڑتی ہے۔“

اب ہم دونوں بڑی گرم بحث کرنے لگے۔ جیسی بحث عموماً دو تازہ تازہ ایم اے پاسوں میں ہوا کرتی ہے۔ اس بحث میں برنڈرسل اور ہکسل کے نام بلا تکلف آنے لگے ڈیو ما اور یوجین اونیل کے اقتباسات پیش کئے جانے لگے۔ ہماری بحث کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی پروفیسر ہیلیاں راہ دیکھ دیکھ کر رخصت ہو گئیں اور لان کی سبز گھاس رات کے پہلے اندھیرے میں کافی مائل نظر آنے لگی۔ جب اندھیرے نے اپنی نرم سترویش چلا کر پھیلائی اور بحث میں ہم دونوں کی تمام بھاپ نکل گئی تو میں نے دل برداشتہ ہو کر کہا۔

”لیکن اگر آپ لوگ سید نہیں تھے تو پھر آپ نے کیوں کہا کہ“

”میں سید ہوں ماں کی طرف سے۔“

”گوٹ ہمیشہ باپ کی چلتی ہے۔“

”لیکن روزِ محشر ہر انسان ماں کے نام سے پکارا جائے گا۔“

معاملہ پھر روزِ محشر، صورِ اسرافیل اور معجزوں کی طرف جانکلا اور اصل موضوع کی پہچان پھٹک نہ ہو سکی۔ اتنا ضرور ہو کہ مجھے اُس سے ملنے کے بعد اُس کی ذات سے کوئی علاقہ نہ رہا۔

شادی کی اولین تیاریوں کے دن تھے۔ میرے گھر والے چونکہ اس شادی میں اپنے آپ کو مجروح پارٹی تصور کرتے تھے اس لئے تمام اخراجات آبا جان کی طرف سے ہونے کے بجائے مجھ ناتواں کے کندھوں پر آ پڑے۔ میں نے اپنی کمپنی سے چھ بیٹے کی تنخواہ ایڈوانس لی۔ لیکن اخراجات کی فہرست اتنی طویل تھی کہ چھ ماہ کی تنخواہ تو انا چھ سال کی پیشگی بھی اس کی متحمل نہ ہو سکتی تھی میں پیسوں کے جوڑ توڑ میں لگا رہا تھا اور ہر نرم دل آدمی سے زمانے کی مہنگائی کا ذکر اس لئے لے کر بیٹھ جاتا تھا کہ اس کے تلوں کا تیل جانچ سکوں۔ لیکن شاید ان دنوں تلوں میں تیل ہی نہیں رہا، یہ سی مصنوعی ہی بننے لگے ہیں۔ کسی نے میری مدد گوارا نہ کی۔

جس روز میں نے دلبری سے ایک ہزار روپے مانگے اُس روز میری والدہ بڑی اذیلہ لینے سوہنے بازہ جانا چاہتی تھیں، وہ روپے کا ذکر سن کر کبھی بچی رہ گئی۔

”میں تم سے ایک ہزار روپے مانگ رہا ہوں خدا قسم ادھا، پانی پانی لوٹا دوں۔“

وہ تنکے سے دانت کریدتی رہی اور منہ سے کچھ نہ بولی۔

”ایک دوست نے چار ہزار دینے کا وعدہ کیا ہے۔ جتنی جلدی وہ رقم مل گئی۔

ہارے روپے لوٹا دوں گا۔“

”میرے پاس ہوتے تو کیا میں انکار کر دیتی؟“
 ”آخر اتنے سال کی سروس ہے تمہاری، کچھ نہ کچھ تو پس انداز کیا ہی ہوگا۔“
 اب وہ بڑے بچے ہوئے لہجے میں بولی: ”اگر تنخواہ میں پوری پرتی تو شادی کون
 کافر کرتا۔؟“
 اس کے انکار نے گویا پہلے ہی چھپکلی کی دم کاٹ دی تھی۔ اب دھڑ بھی مفلوج
 ہو گیا میں بھرک کر بولا۔ یعنی تم محض پوری ڈالنے کے لئے شادی کر رہی ہو۔ تمہیں
 مجھ سے محبت نہیں ہے۔“

اس وقت جب درختوں سے رین بسیرا لیتی چڑیوں کی آوازیں آنی بند ہو گئی تھیں۔
 اور لڑکیاں ٹینس کے بلے اٹھائے سفید کپڑوں میں ملبوس ہوسٹل کی جانب جا چکی تھیں۔
 ہم دونوں سمجھوتے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ بحث میں سے تمام تر بھاپ نکل چکی تھی اور اس
 کی اور میری آواز میں پشیمانی کا عنصر غالب تھا۔ وہ مجھے کچھ اپنی مجبوریاں اور میں اسے
 اپنی مجبوریاں سمجھانے پر آمادہ تھا کہ ہیڈ گرل اچانک آگئی اور آتے ہی بولی۔
 ”مس حیدر۔ ایکس کیوز می۔ آپ کا فون آیا ہے۔ جلدی آئیں۔“

”آپ میرا انتظار ضرور کریں۔“ دلبری یہ کہہ کر جلدی سے آڈیوں کے جھنڈ
 کی طرف چل دی۔ اس کے جانے کے بعد صرف اس کا پرس کرسی پر پڑا رہ گیا۔
 اندھیرا تھا اور ایک عورت کا پرس سامنے پڑا تھا۔ میں اسے کھولنے کی رغبت پر
 قابو نہ پاسکا۔ پرس کھولتے ہوئے ایک بار مجھے ہلکی سی ملامت کا احساس ہوا جیسے اپنے
 دست کی چغلی کرتے وقت ہوا کرتا ہے۔ پھر جب پرس کھلا اور سستے یو ڈی کو لون
 کی خوشبو اٹھی تو میں ندامت بھول کر سارے خانوں کی کنسوئیاں لینے لگا۔ اندر کی غیر ضروری
 مٹا، تین لپ سٹیکس دو ٹوٹی ہوئی کنگھیوں کے علاوہ ریز گاری سے بھرا ہوا ایک چھوٹا
 تہہ اور سو سو کے دس نوٹ تھے۔ میں نے پرس کو ان مانے جی سے بند کر دیا۔
 جب دلبری حیدر واپس آئی تو اس کے چہرے کی لپ شک بالکل تازہ تھی اور
 بہرہ دہلا دھلایا تھا۔

”آپ میرا غلط مطلب نہ لیجئے۔“
 ”آپ کا کبھی کوئی صحیح مطلب نہیں ہوتا اور نہ میں اسے آج تک سمجھ گیا ہوتا۔“
 وہ بھی انگریزی کی پروفیسر تھی، انگریزوں کا سا غصہ تھا اس کا۔ فر فر انگریزی
 میں محققانہ قسم کا غصہ اُتارنے لگی۔
 ”آپ اتنی ساری انگلش بول کر مجھے مرعوب نہیں کر سکتیں۔ ایک ہزار کی تو آپ
 مدد کر نہیں سکیں۔ ساری عمر کیونکر آپ میرا ساتھ دیں گی؟“
 ”آپ کیا مجھ سے اسی لئے شادی کر رہے ہیں کہ میں ساری عمر آپ کی مدد کروں۔“
 مالی مدد۔“

”اب فقط مالی مدد کے لئے تو انسان شادی نہیں کرتا۔“ میں غزایا۔
 ”میرے کالج کی تین پروفیسروں کی شادی اسی طرح ہوئی ہے۔ بیچاریوں نے
 شادی اس لئے کی تھی کہ ملازمت سے چھٹکارا ہوگا۔ اگلوں نے دم نہیں مانے دیا۔
 بیچاریاں تین تین بچوں کے باوجود پڑھانے آتی ہیں۔ ہر روز۔“
 ”خیر اگر میاں بیوی دونوں کام کریں تو کچھ ایسی قیامت نہیں ٹوٹتی۔“
 ”ٹوٹتی ہے۔ عورت پر۔“ وہ بھرائی آواز میں بولی۔

”سیدھی فون کر کے آدھی ہوں خدا قسم فون تو ٹیلی گرام سے بھی بدتر ہے۔ خون خشک ہو جاتا ہے میرا تو۔“
”دلبری۔“

”جی۔“

”شام کے دھندلکے آڑے آئے اور میں نے از سر نو مٹھا کر کہا ”مجھے ایک ہزار کی ضرورت ہے۔“

”خدا قسم میرے پاس دس روپے بھی نہیں۔ پرس خالی ہے۔ بالکل آپ ایک ہزار کہہ رہے ہیں۔“

”تمہیں پچھلے دو سال کے AREARS نہیں ملے؟۔ ابھی؟“

”ابھی کہاں جی ابھی تو سٹیٹ بینک سے خط ہی نہیں آیا۔“

میں نے چپ چاپ اس کا پرس سامنے کیا اور سلام کر کے چلا آیا۔
منگنی نہیں ٹوٹی تھی۔ لیکن سرد جنگ دونوں طرف جاری تھی۔ میں اپنا اپنا مورچہ مضبوط کرتے دوسرا ہفتہ تھا کہ ایک روز مجھے اپنے دفتر میں اس کا خط ملا لکھا تھا۔

”خدا قسم میں اس روز کی حرکت پر نادام ہوں۔ دراصل آپ کی مدد نہ کرنے کی ایک بڑی گہری اور نفسیاتی وجہ ہے۔ میری ایک دوست جو میرے ساتھ یہاں جغرافیہ کی پروفیسر ہے۔ تین سال تک ایک آدمی کی مدد کرتی رہی ہے۔ اب جبکہ اس آدمی کی حیثیت قابل رشک ہو چکی ہے اس نے میری دوست سے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ روپے کو درمیان میں لا کر رویہ بھی گنواؤں اور آپ کو بھی ویسے آپ مجھے ملنے آئیں تو مجھے چشم براہ پائیں گے۔“ دلبری

دلبری کو اپنے لئے چشم براہ دیکھنے کا شوق مجھے سٹاف ہاؤس لے گیا۔
میں پورے دو گھنٹے لان پر بیٹھا ہوا۔ شام کی سیاہی میں لان کافی مائل ہوئی پھر سیاہ نظر آنے لگی۔ لیکن دلبری نہ آئی حالانکہ وہ اندر موجود تھی۔

دوسری صبح دفتر میں مجھے اس کا فون ملا۔ ہیلو کے ساتھ ہی وہ شروع ہو گئی۔ ”ذرا دیکھئے جو قدم میں نے اٹھایا تھا۔ دراصل وہ آپ کو اٹھانا چاہتیے تھا۔ اگر آپ شادی سے پہلے مجھے نہیں منا سکتے تو غالباً شادی کے بعد تو آپ کا رویہ اور بھی سخت ہو جائے گا۔“

میں نے بات کا سلسلہ توڑنے کے لئے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن وہ فون آپریٹروں کی سی خوبصورت آوازیں بولتی گئی۔ ”میں کل شام آپ کو بلا کر نہ ملنے کی معافی چاہتی ہوں۔ لیکن یہ قدم میں نے بہت سوچ سمجھ کر اٹھایا تھا۔ غالباً آپ مجبوراً آئے تھے میری خوشی کی خاطر۔“ آپ کو اپنی خوشی کے لئے آنا چاہیے تھا۔
اب میں کڑک کر بولا۔ ”اور اس بات کو کیسے پایہ ثبوت تک پہنچایا جا سکتا ہے کہ میں اپنی ہی خوشی کے لئے آیا تھا۔“

وہ شدہ آکسفورڈ کے لہجے میں بولی۔ ”یہ ثبوت تو آپ کو ہم پہنچانا چاہیے۔“
نشاط آد کی جھنجھکی ایک ایسا اونٹ تھی جو کسی کروٹ نہ بیٹھ رہا تھا۔
”میرے پاس ایسے ثبوت کے لئے کوئی مؤثر طریقہ نہیں ہے۔“
”دیکھا۔ دیکھا۔ دیکھا۔“

فون میں یک دم کسی آدمی کی آواز آنے لگی وہ جھینگا مچھلی کا بجھاؤ پوچھ رہا تھا۔
میں نے فون بند کر دیا اور دلبری کی لنگڑی شخصیت کو بھلانے میں مصروف ہو گیا۔
اسی تناہی میں شادی کی تاریخ ٹھہر گئی اور ہم میں سمجھوتے کی صورت نہ نکل سکی۔
تیاریاں دونوں جانب بڑی طرح جادی تھیں۔ ایک روز وہ اچانک مجھے سینا گھر کے

سامنے سٹلنڈ دیکھتی نظر آگئی۔ اس کے ساتھ گدی پر بڑا سا جوڑا بناٹے ایک اور پروفیسر صورت لڑکی موجود تھی۔ دونوں ایک وجہ صورت ہالی وڈ ایکٹر کو دیکھنے میں محو تھیں۔ جو مجھے بالکل احمق نظر آ رہا تھا۔ میں اُس کی پشت پر کھڑا ہوا اور جب وہ بیٹھی تو مجھے اس قدر نزدیک پا کر ڈولی ہوا کے جھونکے سے یو کلیٹس کی کونسل۔

دلبری نے زرد سوٹ پہن رکھا تھا۔ ہاتھوں میں زرد چوڑیاں تھیں۔ بازو پر زرد سا برکاپر س تھا۔ ساری نشانیاں لمبے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے کے، مایوں بیٹھی ہوئی لڑکی کی سی تھیں۔

”آپ —“

میں نے شائستگی سے اس کی دوست کو سلام کیا اور خوش خلقی سے پوچھا۔ ”آپ پنجابی فلم دیکھنے آئی ہیں؟“ اس کی دوست جو غالباً جغرافیہ کی پروفیسر تھی اور دلبری کی روحانی پیشوا تھی اور جو غالباً کسی قسم کے مرد کی تین سال مدد بھی کر چکی تھی۔ مسکرا کر بولی۔ ”جی جب ہم دونوں بہت اُداس ہوتی ہیں تو ہمیشہ پنجابی فلم دیکھتی ہیں۔ ہنسنے کا موقع ملتا ہے۔“

میں نے کنکھیوں سے دلبری کی طرف دیکھا۔ وہ لا تعلقی سے ابھی تک پوسٹر دیکھے جا رہی تھی۔

”ٹکٹ خرید لئے ہیں آپ نے؟“ میں نے روحانی پیشوا سے پوچھا۔

”کھڑکی نہیں کھلی ابھی۔“

”آپ میرا انتظار اوپر چل کر کریں۔ میں ابھی ٹکٹیں لے کر آتا ہوں۔“

جب میں ڈریس سرکل کی تین عدد ٹکٹیں لے کر پہنچا تو وہ اوپر والے برآمدے میں دیواروں کے ساتھ لگی ہوئی سٹلنڈ دیکھ رہی تھیں۔ اُن کی منہی کا مجھ پر خوشگوار اثر ہوا اور میں نے پاس جا کر کہا ”آئیے چلیں۔“

روحانی پیشوا درمیان میں، دلبری اور میں اس کے دائیں بائیں چلنے لگے۔ اسی طرح ہم سینما ہال کے اندر پہنچے اور پھر جغرافیہ کی پروفیسر کی کو درمیان والی سیٹ پر بٹھا کر بیٹھے۔ جب انعامی بونڈز خریدیے، کی سٹلنڈ نیم اندھیرے میں سکریں پر آئی تو میں نے اپنا بازو روحانی پیشوا کی سیٹ کی پشت پر رکھا۔ جب قومی بحبت کے ہفتے کا اشتہار آیا تو میرا ہاتھ دلبری کی پشت پر تھا۔ جب سگریٹ پینا منع ہے کی سٹلنڈ دکھائی جانے لگی تو میں نے اپنی انگلیاں دلبری کے جوڑے پر رکھیں۔ لیکن جب اصل فلم کے سنسکراٹھ ٹیفیکٹ دکھایا گیا اور ٹائٹل شروع ہوا تو یکدم دلبری سیٹ پر بالکل آگے کو ہو بیٹھی اور میرا بازو اس کی سیٹ کی پشت پر لٹکا رہ گیا۔ سوکھی ہوئی توری منڈیر پر سے لنک آئی۔

اس کے بعد فلم کی ہیروئن پہلی ملاقات میں ہیرو سے دوچار ہوئی۔ دوچار لمحے بعد وہ ملکِ خدا سے راست سمجھ کر ساری سکریں پر ہڑونگے بھرتی، درختوں سے لنگتی، بچوں کی طرح ٹھنڈے زمین پر گر گئی لبوڑتی آنکھیں بناتی محبت کا گیت گانے لگی۔ ہال میں بودا فلمی ماحول طاری ہو گیا۔

انٹرول تک پورے پانچ گانے ہو چکے تھے۔ کہانی جہاں سے چلی تھی وہیں آ کر تھی۔ البتہ ہیرو اور ہیروئن دو ڈویٹ کا چکے تھے۔ گاؤں کی کنوایاں گھڑے بجا بجا کر ناچ چکی تھیں اور ویلن ہیرو اور ہیروئن کو محبت کرتے دیکھ چکا تھا۔ یہ بات البتہ امید افزا تھی۔ کیونکہ روحانی پیشوا کا خیال تھا کہ اب فلم میں ڈراما اور سسپنس پیدا ہو گیا ہے۔ میلوڈراما اور لمبے لمبے مکالموں کا روشن مستقبل نظر آنے لگا تھا۔

انٹرول کے دوران میں نے چائے منگوائی۔ روحانی پیشوا نے چائے بنائی۔ میں نے دلبری کی نقل میں ایک عدد کریم رول کھایا۔ جس کی کریم سے باسی ہونے کی وجہ سے کھٹی لسی کی بو آ رہی تھی۔ انٹرول کے بعد سارا وقت گھوڑے دوڑتے رہے۔ دوچار بار لڑائیاں ہوئیں۔ ہر بار ہیرو کا پلہ بھاری رہا۔ ہیروئن نے ایسے گھر میں جہاں بہت سارے غیرت مند

لوگ برچیاں اور بلم لئے غیرت کے ڈائیلاگ بولا کرتے ہیں۔ ایمن کے راگ میں بھرپور گلے کے ساتھ سیڈ سوئنگ گایا۔ انٹرول کے بعد میں اور روحانی پیشوا باتیں کرتے رہے۔ مائیں بیٹھی دلبری نے ایک بار بھی ہم سے کلام نہ کیا۔ جغرافیہ کی پروفیسر فی فلموں کی کافی رسیا لگتی تھی اور مختلف ایکٹروں کے نام اور ان کے گھریلو حالات بھی اچھی طرح جانتی تھی۔ اس لئے وہ مجھے ساتھ ساتھ ایسی باتیں بتاتی گئی جو مجھے معلوم نہ تھیں۔

جب سکریں پر چاند تارے والا سبز جھنڈا آیا اور ہم پاک سرزمین کی تعلیم میں اُٹھے تو دلبری روتی روتی سی نظر آ رہی تھی۔ لمحہ بھر کو میں حیران سا رہ گیا۔ انگریزی پڑھانے والی پروفیسر اور پنجابی فلم دیکھ کر روئے۔ یہ بات کچھ عجیب سی لگی۔ بہر کیف دلبری کے ساتھ عجیب باتوں کا رونما ہونا عام سی بات تھی۔

جب ہم سیر میوں سے اتر کر برآمدے میں آئے تو رش کی زیادتی کے باعث میں آگے آگے ہو گیا۔ میرے بعد روحانی پیشوا اور اُس کے بعد میں دلبری تھی۔ ایک بار دائیں بائیں سے اس قدر لوگوں کا دباؤ پڑا کہ جغرافیہ کی پروفیسر نے میرے بازو پیچھے سے پکڑ کر سہارا بھی لیا۔ جب ہم ٹیکسی میں داخل ہوئے اور ٹیکسی مال روڈ پر پہنچی تو دلبری نے پرس کھولا اور ہتھیلی میری طرف بڑھا کر بولی۔ ”یہ مجھے ٹکٹوں کے پیسے“

”معاف کیجئے میں آپ کی طرح نہیں ہوں کہ اپنے اور آپ کے پیسوں کو الگ الگ

سمجھوں“ میں نے کہا۔

”حساب حساب ہوتا ہے“ وہ کہنے لگی۔

”دوستی میں حساب بے معنی چیز ہے۔“ میں نے پنجابی میں جواب دیا۔

وہ چپ ہو گئی پھر دونوں کالج کے بڑے پھانک پر آہستہ آہستہ انگریزی میں کھسک پھنس کر رہیں۔ متورمی دیر بعد روحانی پیشوا اندر چلی گئی اور دلبری پھانک میں آدھی اندر اور آدھی باہر ہو کر بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ ۱۰۰۰۰ یہ شادی جو ہونے والی ہے

کا میا ب نہیں ہو سکتی۔“

”کیا کہہ رہی ہیں آپ۔؟“

”میری اور آپ کی سوچ میں بہت فرق ہے۔“

”آپ اپنی اس دوست کو چھوڑ دیجئے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

وہ لمحہ بھر کو سوچنے لگی اور پھر بولی۔ ”در اصل میں کسی ایسے آدمی کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی جو۔۔۔ دیکھئے میں ہوسٹل میں رہتی ہوں۔ کیونکہ میری طبیعت گھروالوں سے مختلف ہے۔“

”دیکھئے میری پیدائش نومبر کے مہینے میں ہوئی ہے۔ نومبر میں جنم لینے والے لوگ عموماً ہر طرح کے لوگوں کے ساتھ نباہ کر لیا کرتے ہیں۔“

اب وہ ابرو چڑھا کر بولی۔ ”لیکن میرے نزدیک نباہ کرنا خوشی کی معراج نہیں ہے۔“

یہاں سے پھر انگریزی میں بحث کا آغاز ہوا۔ خوشی پر جو جو تھیودیاں موجود تھیں، ان پر بحث اس قدر پھیلی کہ بیچارہ ٹیکسی والا ہلن بجانے پر مجبور ہو گیا۔ میں واپس چلنے لگا تو وہ بولی۔

”دیکھئے میں سمجھتی ہوں کہ میں کسی آدمی کے ساتھ رہ ہی نہیں سکتی۔ میں

MAN HATER ہوں۔۔۔“

”ایسی کوئی جنس موجود نہیں ہے۔“

”مجھے بڑے کو مپلکس ہیں۔ ٹانگ کی وجہ سے۔“

”سب دور ہو جائیں گے۔“

اب اُس نے نظریں جھکا کر کہا۔ ”جس سے بھی شادی کروں گی اُسے پنجرے میں بند کر کے رکھوں گی۔ اُس کی نظروں کو باندھ کر رکھوں گی اور چونکہ ایسا

مکن نہیں اس لئے بہتر یہی ہے کہ —

”دیکھو دلبری کوئی واضح وجہ ہو تو میں پیچھے ہٹ جاؤں یہ جو تم شاخسانے چھوڑتی ہو بلا وجہ....“

”آج ہی کی مثال لیجئے۔ آپ جب مس ترمذی سے باتیں کر رہے تھے تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔ حالانکہ میں خوب جانتی ہوں کہ مس ترمذی کے ساتھ آپ کو کیا؟ میں اپنی نیچر کو کیا کروں۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔“

”تم اپنی ترمذی کو حاق پر رکھو — خدا قسم مجھے دلی صورتوں سے وحشت ہوتی ہے۔“

اب وہ پچانک سے سر لگا کر بولی — ”ایک بات اور بھی ہے۔“

”اب اور کیا بات ہے؟“

”آپ نے میری کرسی پر بازو رکھا اور — دیکھئے میں شادی سے پہلے آزاد یوں کی قائل نہیں۔“ پھر وہ فر فرانگریزی بولنے لگی۔

اب جیسی بے راہ روی اور اس کی روک تھام پر دھواں دھار بحث ہونے لگی۔ ٹیکسی والا پہلے ہارن بجاتا رہا پھر وہیل پر سر رکھ کر سو گیا۔

جب عورت بے پناہ خوبصورت ہو تو اسے معاف کرنا بہت سہل ہوتا ہے۔ لیکن جب عورت میں صرف کشش ہو تو کوئی باریہ کشش تلاش کرنے میں مشکل درپیش ہوتی ہے۔ دلبری بحثوں میں ہمیشہ مجھ سے جیت جایا کرتی تھی۔ شاید اس کی وجہ اس کا مطالعہ تھا یا شاید اس کی وجہ اس کی وہ آواز تھی۔ جس میں نشاط آرا ریڈیو اور فلم فیم کے سُر گونجتے تھے۔ میں ہارتو جاتا تھا۔ لیکن خوش خلقی کے ساتھ ہارنا مرد کی فطرت میں شامل نہیں ہے۔ اس بار جو دلبری نے امریکی کلچر سے حوالے دے دے کر باتیں کیں اور بیٹکنز اور ہیپیز

HIPPIES BEATLES

جواب نہ بن پڑا۔ اگر وہ خوبصورت ہوتی تو میرا فیصلہ کچھ اور ہوتا۔ لیکن اس وقت اس کی کشش کچھ مانند پرٹچی تھی۔ مجھے اس کی ٹانگ کا نقص صاف نظر آ رہا تھا۔ اس پر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کے پڑھے لکھے پن سے مجھے اللہ واسطے کایر پیدا ہو چکا تھا۔ میں نے ٹیکسی کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ ”آپ ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ مس حیدر۔ میرا اور آپ کا گذر بہت مشکل سے ہوگا۔ دراصل جس شیر کے منہ کو آدمی کا لہو لگ جائے وہ آدم خود ہو جاتا ہے۔ اور جس عورت کے منہ کو

CAREER

لگ جائے وہ آدم بیزار ہو جاتی ہے۔ آپ شوق سے ساری عمر پروفیسری کریں۔ زندگی میں بڑا عہدہ پائیں اور بڑی موٹی پنشن پر ریٹائر ہوں۔ بندہ ایک سیدھی سادی ان پڑھ عورت کے ساتھ زندگی بسر کرے گا۔“

اس کے بعد میرے گھر تو شادی کے انتظامات جاری رہے خدا جانے دلبری کے گھر کیا ہوا۔ وہاں کوئی نیا دولہا دستیاب ہو سکا کہ نہیں۔ ہاں میرے لئے گھروالوں نے ایک خوش شکل کم پڑھی لکھی نہایت اطاعت گزار محبت کرنے والی بیوی مجھے تلاش کر دی۔ ایسی بیوی پا کر پہلے میں خوش ہوا پھر مطمئن ہوا اور بالآخر ایک ایسی زندگی گزارنے لگا۔ جس میں کوئی اشتہام موجود نہ تھی۔ ایک ذہین عورت سے شادی کرنے میں ایک خطرہ موجود ہے۔ جس طرح وہ ہر وقت آپ کو چوکنا رہنے پر مجبور کرتی ہے، وہ بذاتہ خود ترقی کی ٹریننگ ہے۔ شخصیت کی جلا کا بڑا کارآمد نسخہ ہے۔ سیرازا آدمی کے ہتھیار کبھی زنگ آلود نہیں ہوتے۔ شادی کے بعد میں اس طرح اپنے شب و روز سے لطف اندوز ہونے لگا۔ جیسے بے نمک کی دعوت درپیش ہو۔

اس دعوت کو کھاتے کھاتے اچانک ایک شام عجیب واقعہ ہوا۔ میری بیگم نے مجھے دفتر فون کیا کہ میں چار سیٹیں شمع میٹھا میں بک کروالوں۔

وہ مسکرا دی۔ بتیاں بچ گئیں اور سکریں پر پہلی سلائیڈ آئی۔ ”پاک وطن کو پاک صاف رکھیے“

اندھیرے نے باتوں کو آسان کر دیا۔

”لیکن آپ نے شادی کیوں نہیں کی ابھی تک؟“

ہلکی سی آہ بھر کر وہ بولی۔ (زندگی میں بار بار اپنی پسند کا آدمی بھی تو نہیں ملتا)

”یعنی آپ — آپ —“

”فی الحال تو میری بس چھوٹ چکی ہے“

اس وقت نیم اندھیرے میں انعامی لونڈن کی سلائیڈ کے ساتھ میری بیوی اپنی دو سہیلیوں کے ساتھ گیلری کے دروازے پر برآمد ہوئی۔ یکدم اندھیرے میں آجائے کے باعث وہ سب سن سی گیلری کے شروع میں کھڑی تھیں۔ میں چپکے سے اٹھا اور پہلی قطار میں آکر بیٹھ گیا۔ جب سگریٹ پینا منع ہے کی سلائیڈ جاری تھی تو ایک لمبا سا آدمی میرے پاس سے گزرا اور سامنے دلبری کے پاس والی سیڈ پر جا بیٹھا۔ پھر اس نے اپنا بازو پھیلا کر دلبری کی سیڈ پر رکھا۔ دونوں کے ہنسنے کی آواز مجھ تک کوڑیا لے سانپ کی طرح لہرائی۔

دلبری نے اپنا سر اس بازو پر ٹیک لیا۔

جس وقت فلم کے سنسکرا سرٹیفکیٹ دکھایا جا رہا تھا۔ میں نے اپنی بیوی سے مہذرت طلب کی اور ہال سے باہر نکل آیا۔

خدا جانتا ہے کہ آج تک پھر کسی سینما گھر میں گھسنے کا حوصلہ ہی نہیں پڑتا خدا جانے کیوں؟



وہ اپنی دو سہیلیوں سمیت پونے چھ کے قریب گیلری کے پاس دائیں ہاتھ کی سٹلنز دیکھ رہی ہوں گی۔ وہیں میں انہیں تلاش کر لوں۔ میں پوئے پونے چھ آدمی بس سے آگے والے پل پر تھا۔

ماڑ دھاڑ سے بھرپور ایک پنجابی فلم کا بائیسواں ہفتہ تھا۔ میں نے سٹلنز کے پاس اپنی بیوی کو تلاش کیا پھر برآمدے میں دیکھا، بیٹریاں چڑھ کر اوپر دھونڈا۔ اسی تلاش اور انتظار میں سارے چھ ہو گئے تو میں گیٹ کیپر کے پاس پہنچا اور اسے سمجھا دیا کہ ابھی تھوڑی دیر میں کچھ خواتین آنے والی ہیں۔ اُن کی ٹکیٹیں میرے پاس تھیں۔ میں اندر اُن کا انتظار کروں گا۔ ہاں میں ابھی اندھیرا نہ ہوا تھا۔ موسیقی جاری تھی۔ مجھے سگریٹ پینے کی طلب ہو رہی تھی۔ لیکن ہاں کی خشکی نے ایسا سکون پہنچایا کہ میں اپنی سیڈ میں جا بیٹھا۔ پاس کی پانچ سیٹیں خالی تھیں اور سامنے والی قطار میں ایک جانا پہچانا سر نظر آ رہا تھا۔ وہی نیم سنورے نیم بکھرے بال وہی گردن پر بڑا سا جوڑا — میرا دل بچ گیا۔ پھر دلبری نے مڑ کر مجھے سلام کیا اور مسکرا دی۔

میں اپنی سیڈ چھوڑ کر اگلی قطار میں پہنچا اور اس کے پاس والی سیڈ پر بیٹھ گیا۔ مجھے اسے دیکھ کر ایسی خوشی ہوئی جیسے اپنا کوئی موطن دیا غیر میں مل جائے۔

”کیسی ہیں آپ —“

”ٹھیک ہوں —“

”اسی کالج میں ہیں ابھی تک —“

”ابھی تک وہی ہوں —“

”اور کوئی قابل ذکر بات؟“ — میرا اشارہ اس کی شادی کی طرف تھا۔

”کوئی قابل ذکر بات نہیں — ہوئی فی الحال —“

”آپ — نے شادی نہیں کی ابھی تک؟“

پایند

ڈی سی ٹن بیگانہ وار اُڑتا جا رہا ہے۔ اس وہیل مچھلی کو کیا معلوم کہ اس کے
سفید پیٹ کے اندر حضرت یونسؑ کی طرح کئی ذی روح رہائی کی آرزو میں تڑپ
رہے ہیں۔ اُن کے دلوں میں کسی اور ساحل پر اُگلے جانے کی آرزو ہے اور وہ کسی اور
سمت میں اس پکھال کے اندر سوار چلے جا رہے ہیں۔ چلے جا رہے ہیں۔ کوئی نکل نہیں
سکتا، اتر نہیں سکتا، سمت بدل نہیں سکتا!

مصیبت اس ہوائی جہاز کی وجہ سے پیدا نہیں ہوئی۔ ہوائی جہاز کا تو محض اتنا
قصور ہے کہ وہ مجھے ایک ایسی سمت اڑائے لئے جا رہا ہے۔ جدھر میں جانا نہیں چاہتا
اصلی فرشتہ تو کسی اور بات سے پیدا ہوا، ساری تباہی تو اُس وقت آئی جب میں نے
پلے اندر جہاڑ پھیر کر اگر بتیاں سلگائیں، عرق گلاب چھڑکا۔ پھر کسی پوست پوش فیکری
طرح زائونیک آسن میں بیٹھی اور اپنے آپ سے قسم کھالی.....

قسم انسانی دل کو عجیب طور پر شکنجے میں کس دیتی ہے۔ قسم جھوٹی بھی ہو تو بھی بیگناہ
میں پکڑ لیتی ہے۔ وعدہ چاہے توڑنے کی آرزو سے ہی کیوں نہ کیا جائے آخر کو بے تقصیر!

ہی آدمی پکڑا جاتا ہے۔ قسم چاہے اندر کھائی جائے کسی کے روبرو، یہ ہمیشہ جی کا خیال بن جاتی ہے۔ آدمی بوتل میں بند ہو جاتا ہے اور انسان کب تک بوتل میں بند رہ سکتا ہے۔ چاہے وہ بوتل کٹ گلاس کی ہی کیوں نہ ہو؟

قصور اس سفید و ہیل مچھلی کا نہیں جو مجھے کراچی کی طرف اڑائے لئے جا رہی تھی بلکہ سارا ٹٹنا اسی قسم کا ہے۔ اس گھر کے بھیدی نے مجھے ایسے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ جیسے بڑا اژدہا سرخ بندر کو اپنے بلوں میں بلوتا ہے۔ جس وقت میں نے اپنے آپ سے قسم کھائی تھی بارہ بارہ کلومیٹر پر کوئی انسان گواہی کے طور پر موجود نہ تھا۔ کوئی ثبوت، شام، کاغذ ایسا نہیں جو مجھ پر میری قسم کا دعویٰ کر سکتا ہو۔ لیکن کسی انہونی قوت نے مجھے پوری طرح دبوچ رکھا ہے اور میں اس جھنور جال سے نکل نہیں سکتی۔

پتہ نہیں کیوں قسم سے آدمی تعویذ جاتا ہے؟۔ وہ لوگ بھی جو بار بار قسم کھا کر توڑنے کے عادی ہیں، وہ بھی قسم توڑنے وقت اپنے ثقل سے ضرور ہل جاتے ہیں۔ قسم میں سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ اس میں دعویٰ کی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر اس دعویٰ پر نظر ثانی، تخفیف و اضافہ، کسی قسم کی تحریف و تصرف کا مجاز نہیں رہتا یا یوں سمجھ لیجئے کہ انسان جو محرک پیدا ہوا ہے۔ یکدم میخا جاتا ہے۔ جو چیز طبعاً سیال ہے۔ ٹھوس میں بدل جاتی ہے۔ ثقل سے آزاد رہنے کی خاصیت ختم ہو جاتی ہے اور آدمی دعویٰ کی سمت کا پابند ہو جاتا ہے۔ قسم کھاتے ہی وعدے کی متوازی پسٹریاں بچھ جاتی ہیں اور ان پر قسم کا سیاہ ڈیزل انجن بڑے ٹکدر سے اُن مانے جی سے رُک رُک کر چلنے لگتا ہے۔ قسم کھاتے ہی پابندی کا حصار خود بخود راہ کھولی کرنے کو کھڑا ہو جاتا ہے۔ جس طرح مادرِن چوٹا بچہ اپنے بی بی داکر میں چلتا تو ضرور ہے لیکن وہ دائرے سے آزاد نہیں ہو پاتا۔ ایسے ہی قسم کھاتے ہی وعدے کا ہالہ کہیں سے آکر گیرا ڈال لیتا

ہے۔ چاند کے گرد بھی ایسا ہی ہالہ ہوا کرتا ہے۔ جہاں کہیں بھی چاند خوش خرامی کرتا چلا جائے ہالہ رسی ٹاپتا ساتھ ہی پہنچ جاتا ہے۔

چھوٹے موٹے وعدے، چھوٹی چھوٹی قسمیں — سب ریگال کی طرح دل کے ہونٹوں پر پھرتی رہتی ہیں، اور جب تک زندگی دل کے اوپر ہاتھی کے چڑے کا کیس نہیں پر سادتی تکلیف دیتی ہیں۔

ہوائی جہاز نیلے آسمانوں کو چیرتا آگے بڑھ رہا ہے۔ مجھے وہ دعائیں یاد نہیں جو اس وقت پر پڑھنی چاہئیں صرف میرے اندر کی قسم مجھے ایسے گھسیٹے لئے جا رہی ہے جیسے میں ایک باد پار ہوا کی کاٹھی سے گر کر صرف ایک پاؤں اس کی رکاب میں پھنسا گئے گھسنتی جا رہی ہوں۔ جب میں نے قسم کھائی تھی تو مجھے معلوم نہ تھا کہ حصول وعدہ دنیا کی مشکل ترین شے

ہے۔ حاسد اور بدخواہ حالات ہمیشہ اس تاک میں رہتے ہیں کہ وعدہ کرنے والے اپنے ضابطے سے اپنی راہ ریت سے ہٹ جائیں۔ آپ آزمائش کے طور پر کسی سے وعدہ کر لیں اور پھر وعدہ کو پختہ کرنے کے لئے کوئی ادنیٰ سی قسم بھی کھالیں کہ آپ پوسے آٹھ بجے اسے یونیورسٹی کے بس سٹاپ کے سامنے ملیں گے اس کے بعد آپ تجربہ کریں گے ہر نوعیت کی رکاوٹ، بددیانتی، منہ زور اپن حالات کا جزو بن جائے گا۔ اس روز جب آپ آٹھ بجے کا وقت دیکھنے کے منکب ہوئے ہیں، عین اس روز صبح آپ کا الارم دغا ہے جائے گا۔ آپ ازل سے نماز پڑھنے کے عادی ہوں گے۔ لیکن اس روز نہ سورج آپ کو جگاسکے گا نہ کھیاں اور آپ ہونے آٹھ بجے تک سوتے رہ جائیں گے۔ پھر آپ جاکم جاگ غسل خانے جائیں گے اور اس وقت آپ کا سارا جسم جھاگوں جھاگ ہو جائے گا۔ کمیٹی کے نکلے سے پانی اتا بند ہو جائے گا۔ ہمسائے کے ہینڈ پمپ سے پانی کی بالٹی لانے تک کئی اور مزاحمت درپیش ہوں گی۔ پھر آپ ایک پیالی چائے کی خاطر جب میز کے کنارے بیٹھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ نہ گھر اتنا صبح آیا ہے نہ گھر پر چینی ہے۔ آپ خالی قبوہ پی کر جس وقت بس سٹاپ پر پہنچیں

گے تو اگر مدی تمام گھڑیوں میں..... پونے نو کا وقت ہوگا اور جن صاحب سے آپ نے وعدہ فرمایا ہوگا وہ آپ پر وعدہ فراموش کا لیل لگا کر حصت ہو چکے ہوں گے۔ جس طرح شیشے کے اندر ایک اندرونی سٹرین ہوتا ہے۔ بظاہر بہت مضبوط اور ثابت نظر آتا ہے لیکن ذرا اٹھندے گرم کا تحمل نہ پا کر اپنے ہی انجر پنجر ڈھیلے کر لیتا ہے ایسے ہی وعدے کے اندر بھی ایک انٹرل سٹرین ہوتا ہے۔ قسم کے اندر بھی ایک خاص قسم کا سدا با موجود ہوتا ہے جو ناکامی کو ہر وقت ماحول سے یوں اخذ کرتا ہے جیسے بہتے پانیوں کے نیچے خود بخود روڑے پتھر جمع ہو جاتے ہیں۔

یہ سچی بات ہے کہ جس وقت میں عامر سے ملی میرا آسمان بالکل صاف تھا۔ جون کے تپتے مہینے میں اس پر کوئی بدلی نہ تھی۔ بی اے کے مجھے چار سال ہو چکے تھے۔ شادی ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔ نوکری سے خوف آتا تھا۔ میری زندگی مکمل طور پر روزمرہ کی پابند ہو چکی تھی اور جیسے گوئیے لوگ ریاض کے چکر سے نہیں نکل سکتے میں بھی ہر دن اکتاہٹ، بد مزگی، لاپرواہی کے دائرے سے نہ نکل سکتی تھی۔ میں گھر کے پھاٹک کو اپنا آفتی سمجھتی تھی۔ ان دنوں میں نیوٹن کے قانون کی بہترین تفسیر تھی۔ بقول نیوٹن میں INERTIA تھی۔ بیرونی طاقت کے بغیر کوئی چیز میری پسید یا مومینٹم توڑ نہ سکتی تھی۔ اور اگر عامر میری زندگی میں قوت بن کر آیا ہوتا تو میں بغیر کسی جیج چھار کے اپنی زندگی کے بقیہ دن ایسے ہی گزار دیتی جیسے انجن کا کرنیک شافٹ۔ آگے پیچھے۔ آگے پیچھے۔

لیکن جہاں خدا نما بن کر عامر آیا اور پھر ہر کونہ ہر سمت منور ہو گئی۔ اندھیرے میں یہ وصف ہے کہ آنکھ اُس میں کچھ نہیں دیکھتی اور اُجالے میں یہ خوبی ہے کہ جس چیز پر پڑے اس کے تمام زاویے، رنگ، شلیپ واضح ہو جاتے ہیں۔ جو نبی عامر کی گود ہر داکر میں مجھ پر پڑیں۔ میں سب کو نظر آنے لگی۔ اس سے پہلے میرا مسئلہ یہ تھا کہ کاش میں کسی کو دکھائی دے جاؤں، کسی شادی پر، کسی ماتم کی گھڑی، سینما گھر میں، چاٹ کھاتے ہوئے، پکڑا خریدتے

کے، کاد سے اترتے ہوئے، ٹرین پر پڑھتے ہوئے۔ ہر میں اندھیرا تھی اور انسانی آنکھ کے راد اور کونز اندھیرے کے آگے معذور تھیں۔ مجھ پر عامر کی روشنی پڑی تو میں سب کو نظر آئی۔

میرا رنگ پکا سانولا اور قد چھوٹا تھا۔ جسم میں اُن جگہوں پر گوشت نہیں تھا۔ جہاں ہونا چاہیے اور وہاں وافر تھیں تھیں۔ جہاں لوگ عموماً نشیبوں کے آرزو مند ہوتے تھے۔ اس پر آواز میں قدرتی میٹھا پن بوتل سے پانی نکلنے کی آواز سے کوسوں دور۔ ناک چھدی ہوئی تھی پر لوگوں کے تمخرکی وجہ سے ناک میں کچھ ڈالنے کی ہمت نہ تھی۔ چوڑیاں، انگلیاں نکلس سب مجھ پر بیکار تھے۔ کاسنی، سبز، گلابی، نیلا۔ لڑکیوں والے یہ تمام رنگ مجھ پر آتے ہی باہر حیات ہو جاتے۔ مجھے کالج میں تمام لڑکیاں کچھ نہ کچھ مٹور سے دیتی رہتی تھیں۔ ”ہائے سمن بازوؤں پر ویکس ہی کر لیا کرو۔ اتنے جالو بال تم کیسے برداشت کرتی ہو۔“

”سمن ہلکے رنگ پہنا کرو۔ تمہارے جیسی رنگت پر ہلکے پھلکے رنگ اچھے لگتے ہیں۔“

”اے سمن جی گہرے رنگ پہنا کریں۔ ڈارک براؤن، میرون، نیوی بلو، ان گلابی پیٹلے رنگوں کو چھوڑ دیں۔ یہ شفاف رنگتوں کے لئے رہنے دیں آپ....“

اپنے آپ کو سجانے بنانے کے مرحلے میں جلدی فارغ ہو کر بادامی، اودے اور سفید کپڑے پہننے لگی۔ کبھی کبھی جی چاہتا کہ کانوں میں سفید موتیا کی کلیاں پہن کر کالج جاؤں لیکن دونوں بالے پروکر میں فریج میں رکھ دیتی اور انہیں پہن کر کالج نہ جاسکتی۔ شروع سے مجھے چھیدنا آسان تھا۔ کیونکہ بد قسمتی سے میں لوگوں کی رائے کے سہارے زندہ تھی۔ میری آرزو تھی کہ میری سہیلیاں اور گھر والے کم از کم اس قدر سچ کہنے کے مرتکب نہ ہوں۔ لیکن عامر نے مجھے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کہ پھر میری ذات کے سائے کچھ ٹریں۔ کھلا کے پھول آگ آئے اور میں شفاف تال کی طرح نظر فریب ہو گئی۔ یہی نظر کا سب سے

روشن ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی میرے جسم، روح، ذات کی ڈالی ڈالی میں سیب کے ٹکونے لگ گئے۔ میں لڑکیوں میں نمایاں نظر آنے لگی یوں سمجھئے کہ میں لڑکیوں میں سٹینڈرڈ پٹر پچر اور پریشر کی لڑکی شمار ہونے لگی۔ یہی وہ دن تھے جب عامر ایم فل کرنے کے لئے لندن روانہ ہونے کی تیاری کرنے لگا اور مجھے پکڑ دھکڑاس نے بینک کی نوکری دلوادی۔

دراصل مجھے نوکری کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ مجھے نوکری کا کوئی شوق بھی نہ تھا۔ لیکن عامر کے بڑے فلسفے تھے۔ جس روز اماں جی سے اس نے نوکری کا ذکر کیا، اس روز باہر خوب بارش ہو رہی تھی۔ ہماری چھ کنال کی کوٹھی کے برآمدوں میں اولے تھے۔ لان پر درختوں کے تھال چھوڑ کر سائے میں قیناٹل کی گولیوں اتنے اولے بکھرے ہوئے تھے۔

”آپ اسے نوکری کرنے دین اماں جی پلیز۔ ایک دو سال کے لئے۔“
اماں اندہ ہی اندر میری شادی کے پروگرام سیٹ کر رہی تھیں، فٹ بولیں۔
”ناں عامر اسے کیا ضرورت ہے نوکری کرنے کی۔ اس کے دونوں بھائی سلامت رہیں۔ اچھا بھلا خرچ بھیجتے ہیں ٹورانٹو سے۔“
”تو کیا کرے گی یہ پورا سال۔؟“

”تم چاہو تو یہ تمہارے ساتھ چلی جاؤ۔“
”نہیں اماں جی۔ ایک تو میں نہیں پڑھ سکوں گا۔ ایک یہ اچھی طرح فیصلہ کر لے کہ یہ کیا چاہتی ہے۔ فیصلہ اس کا اپنا ہونا چاہیے۔“

اماں کو بیوہ ہوئے دس سال ہو چکے تھے وہ اپنے دو ڈاکٹر بیٹوں کی کمائی پر نال کی کافی جیسی منجھ زندگی بسر کر رہی تھیں۔ انہیں نئے عہد کی باتیں، ارادے، خیال، سوچ فیصلے بالکل سمجھ نہیں آتے تھے۔ میں کھڑکی میں کھڑی باہر گرتے ہوئے شٹر کے دار

اولے دیکھ رہی تھی۔ اماں چلی گئیں تو عامر اٹھ کر میرے پاس آگیا۔ ”کیا ہوا ہے۔“
”تم مجھے ساتھ لے جانا نہیں چاہتے۔“ بڑی دیر بعد میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

عامر نے محبت سے میرے چہرے پر آئی ہوئی لٹ کو اوپر اٹھایا اور بولا
”دیکھو سمن؟ تم نے جلدی میں بہت سے فیصلے کر لئے ہیں۔ تم اتنی دیر تک لیڈی آف شیلٹ کی طرح اس کوٹھی میں بند رہی ہو کہ تم واقف نہیں ہو کہ باہر کیا ہو رہا ہے میں تمہیں ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ لیکن یہ فیصلہ تمہارا ہونا چاہیے۔ میرا نہیں۔“
”تو یہ فیصلہ میرا ہی تو ہے۔“
”یہ فیصلہ تمہارا نہیں ہے۔“

”کیوں؟۔ یہ تم نے کیسے اندازہ کر لیا۔“

”کیونکہ تم ابھی میچور نہیں۔ ابھی تم محض اپنی IMPULSES کی وجہ سے بچوں کی طرح فیصلے کرتی ہو۔ آئس کریم کھانا چاہی کھالی، نہ ملی تو رو دیتیے، زیادہ ضدی ہوئے تو روٹھ گئے۔ تمہیں میرے ساتھ رہنے کا فیصلہ ایسے کرنا چاہیے جیسے ایک انسان کرتا ہے۔۔۔ بچہ نہیں۔“

باہر گراؤنڈ میں اولے گرنا بند ہو گئے تھے اور بڑی بڑی بوندوں والی بارش پڑ رہی تھی۔ جامن، آم اور امرودوں کے درخت ان بوندوں میں سروں کی طرح بج رہے تھے۔ میں نے مڑ کر پہلی بار عامر کی طرف دیکھا۔ اس سے پہلے میں نے عامر کو نہیں دیکھا تھا۔ اس سے پہلے میں ایک ایسے شخص کو دیکھتی آئی تھی جو فلموں میں، ڈراموں میں، مشاعروں میں، کرکٹ میچوں میں نظر آ جاتا ہے۔ اب مجھے محسوس ہوا جیسے وہ مجھے تراش خراش کر میری محبت کا امتحان لینا چاہتا ہے۔ غالباً اُس کے اندر بھی کہیں کوئی مونو میٹر ایسا لگا تھا جو اُسے بتا رہا تھا کہ پیچھے سے ووٹیج درست نہیں

آ رہی..... میں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کے کندھے پر رکھا اور آہستہ سے بولی۔
 ”سنو عامر! مجھے آج کل۔۔۔ بلکہ ہمیشہ تم سے محبت ہے گی۔ میں کبھی نہیں بدلوں گی۔ کبھی نہیں“

”یہ بڑا مشکل سادہ دعویٰ ہے سمن۔ اور دعویٰ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ پھر ثبوت بہم پہنچانا پڑتا ہے۔“

”مجھے تمہاری قسم۔ مجھے۔ مجھے اپنے ایمان کی قسم میں تمہارے علاوہ کسی مرد سے کبھی محبت نہ کروں گی! میں کر ہی نہیں سکتی ایسے۔ یہ ناممکن ہے۔“

کاغذ پر دستخط ہو گئے میں نے اپنی مہر لگا دی۔ اب تک میں کلنک میں کھائی ہوئی قسم ہی کی پابند تھی۔ اب میں نے اُس قسم کا اعلان بھی کر دیا۔ اپنے آپ کو امتحان میں ڈال دیا۔

ساری مصیبت اسی اعلان سے شروع ہوئی، بایوں سمجھے کہ سارا اثنا اُس قسم سے شروع ہوا جو میں نے اپنے آپ سے کھائی تھی۔ اگر میں عامر کے چلے جانے کے بعد گھر پر آرام سے بیٹھ کر اس کا انتظام کرتی، کسی میوزک ماسٹر سے شدہ راگ سیکھتی رہتی، فرصت کے اوقات میں عورتوں کے رسالے سے نمونے نکال کر کشیدہ کاری کرتی، ایسی غزلیں لکھتی جو کسی رسالے کی زینت نہ بنتیں۔ ریڈیو کے پروگرام سن کر ریڈیو سٹیشن خط لکھتی۔ آدھی رات گئے تک عامر کی واپسی کے لئے دعا مانگتی رہتی اور اپنے آپ کو مالدیپ کے جزیرے میں جلا وطن رکھتی تو اور بات تھی لیکن میں تو بنک کی آفیسر تھی۔ کئی کبوتری کی طرح میری اڑائیں دور دور کی تھیں۔ صبح بنک پہنچتی، شام تک رنگ رنگ کے لوگوں سے واسطہ پڑتا۔ اور ڈرافٹ لینے والے، دو بی، مسقط، دامام کا پیسہ جمع کرانے والے، کرنٹ اکاؤنٹ سے دن میں کئی چیک بھرنے والے، سیونگ اکاؤنٹ کی کاپی بنوانے والے، روز کے گاہک سرکاری دفاتروں کے ماہ بواہ آنے والے سرکاری

کلرک جن کو پوسے پوسے دفتری تنخواہیں لے جانی ہوتیں۔ بزنس مین اور اُن کے بنک ڈرافٹ، امیر عورتیں اور اُن کے لاکر.... لاتعداد سکیمن اور اُن کے مشورے..... اور سینئر کاروبار اور اس کی عملی اڑچٹیں.... اس ماحول میں جہاں روپیہ دن میں سارا وقت نظر آتا ہو آدمی بہت جلد اپنے آپ کو مٹیشن سمجھنے لگتا ہے۔ سائین کرنے، دستخط ملانے، نوٹ گننے، اندراج کرنے، ٹوکن دینے اور لینے کا جو سلسلہ ہے اس میں رہ کر ماتر اور دماغ ڈی جی ٹل گھڑی کی طرح بغیر پیچ پڑزوں کے کام کرنے لگتا ہے۔

ایسے میں ہی ایک دن جب میں اندر باہر خالی کرسی کی طرح محسوس کر رہی تھی کہ وہ آ گیا۔ بنک میں داخل ہونے سے پہلے اس کے پی لے لے اس کے لئے دروازہ کھولا۔ پھر اُس کا چہرہ اسی خوبصورت بیگ اٹھائے اُس کے پیچھے وارد ہوا۔ بنک کے شیشے والے دروازے کے عین سامنے اس کی سبز مر سیڈیز کے پیچھے دائرے میں سیٹیل کاتین پرا نشان نظر آ رہا تھا....

ساری مصیبت نہ مر سیڈیز کی تھی نہ اُس کی۔ ساری مشکل میری ذات سے پیدا ہوئی۔ مجھ میں، میرے ہاتھوں میں، آنکھوں میں کوئی ایسی بات پیدا ہو گئی تھی۔ جو ایک خوبصورت چمکدار WELL RUN مشین میں ہوتی ہے، فریج، انٹرکنڈیشنر، خوبصورت کار، اوپر نیچے آنے والی لفٹ، رنگین ٹیلی ویژن میں ایک معجزے کی کشش ہوتی ہے۔ میں بھی ایک معجزہ تھی۔ مینڈک سے نکلا ہوا شہزادہ۔ اسی لئے نجیب صاحب کو اپنا تمام روپیہ ہمارے بنک سے نکلوا کر کسی دوسرے بنک میں رکھنا چاہتے تھے، مینجر کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے رُکے، میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور پھر آگے چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد آفتاب گل صاحب نے مجھے اندر بلایا۔ آفتاب گل صاحب ہمیشہ مجھے تو مصیفی نگاہوں سے دیکھتے لیکن اُس روز جب میری آمد پر نجیب صاحب اٹھ کھڑے ہوئے تو آفتاب صاحب نہ صرف اٹھ کھڑے ہوئے بلکہ میرے بیٹھنے تک

گفتگو، زبردستی، پائے، کافی، خدمت، چاہو کسی تعریف۔ کوئی پونے گھنٹے کی مارا مار کے بعد اس قد ہوا کہ نجیب صاحب نے اپنا فیصلہ تو تبدیل نہ کیا۔ لیکن کچھ عرصہ تک روپیہ ہمارے بنک میں رکھنے کا حکم صادر فرما کر چلے گئے۔

اُس کے جاتے ہی آفتاب گل کو پتہ پڑ گئے۔ ”بس اب ایک مہینے کے بعد کلوننگ ہے سال کی اور ہمارا بیلنس یکدم بائیس لاکھ گر جائے گا“

ہم دونوں اس طرح چپ چاپ بیٹھے ہیں جیسے ڈکیتی سے پہلے رہن گم سم بہتے ہیں۔ ”تم ایسے کرو مس شیخ، ان کی وائف سے ملو.... کچھ منٹ سماحت کرو۔ یہ بڑا ضروری ہے ورنہ میری تو پروموشن کا سوال ہے۔ میں تو زونل میجسٹریٹ بننے سے رہ جاؤں گا“

آفتاب گل بے چارہ ایک منزل کا آدمی ہے۔ اس کے سامنے ایک گول تھا کہ وہ کسی طرح زونل میجسٹریٹ ہو جائے۔ راستے میں کیا کیا پڑتا ہے، کون کونسی چیزیں، کیسی کیسی اقدار قربان کرنی پڑتی ہیں، کیا کیا پاپا پڑ بیٹے پڑتے ہیں، اس کی اُسے کوئی پروانہ نھی۔ وہ ہر قربت پر زونل میجسٹریٹ ہونا چاہتا تھا۔ اس کی اس لگن، اس مجبوری کو دیکھ کر میں نے مسز نجیب آف کول ایئر سے ملنے کا ارادہ کیا۔

یہ میری بدقسمتی تھی کہ جب میں اُن کے سنٹرلی ایئر کنڈیشننگ میں پہنچی تو صرف نجیب صاحب گھر پر تھے۔ گھر کسی قبر کی طرح خاموش تھا۔ سرو کے درختوں سے لے کر ڈرائیونگ روم کے جا پانی درختوں تک ایک خواب کی فضا تھی۔ سنگ مرمر، ساگوان.... اور سائل.... ہر جگہ موجود تھا....

اس ملاقات میں نجیب صاحب نے کچا پکا وعدہ کیا کہ وہ اکاؤنٹ نہیں نکالیں گے کم از کم ہمارے سال کے کلوننگ تک وہ اپنی رقم ضرور ہمارے ہی بنک میں جمع رکھیں گے۔ آفتاب گل کو تو اختلاف قلب کے دورے پڑنے بند ہو گئے لیکن میرے لئے جیسے آدھی رات کے وقت کوئی دروازہ آہستہ آہستہ دھکیل کر اندر آنے کی کوشش کرنے لگا۔

کھڑے رہے۔

”یہ ہماری جونیئر آفیسر مس من شیخ ہیں اور یہ نجیب صاحب ہیں۔ کول ایئر، ایئر کنڈیشنرز کے مالک۔“

ہم دونوں ایک دوسرے سے ایک فٹ پر بیٹھ گئے۔ ہمارے درمیان میں صرف کرسیوں کے بازو حائل تھے۔ جن پر نجیب صاحب نے اپنا لمبا ہاتھ بے پروائی سے پھینک رکھا تھا۔

آفتاب گل نے ایک بینکر کی ریاکارانہ مسکراہٹ سے مجھے دیکھ کر کہا۔ ”اب یہ ان کا غلم دیکھیں، یہ اپنا اکاؤنٹ یہاں سے نکلوانا چاہتے ہیں۔ جب ان کا بائیس لاکھ نکل گیا تو ہماری برائچ کا تو بھٹہ بیٹھ جائے گا۔ کیوں مس شیخ؟“

میں نے پروفیشنل EFFICIENCY کے تحت نجیب صاحب کو ایک بھر پور مسکراہٹ پیش کی۔ میرا بس چلتا تو میں اُن کا بے پروائی سے دھرا ہوا ہاتھ چوم کر کہتی۔ ”پلیز ایسے نہ کریں، لیکن میں نے میز پر اُن کی رکھی ہوئی سیاہ عینکوں کو صرف چھو کر کہا ”آپ ایسا نہیں کر سکتے۔“

”کیوں؟“

”دیکھئے ناں اگر آپ ہمیں ہیڈ آفس میں ذلیل کرنا چاہتے ہیں تو اوہ بات ہے لیکن ہم نے آپ کو بڑا اچھا سرو کیا ہے۔ کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ پھر آپ کیسے اتنا بڑا اکاؤنٹ بند کر سکتے ہیں؟“

اب نجیب صاحب اپنی مجبوری بیان کرنے لگے کہ وہ ہمارے حریف بنک میں پیسہ جمع کرانے کا وعدہ کر چکے تھے اور اس میجسٹریٹ کے ساتھ ان کے بہنوئی کے کچھ ایسے مراسم ہیں کہ انکار کی گنجائش نہیں تھی۔

آفتاب گل کی شہ پر میں نے اپنا پورا زور نجیب صاحب پر لگا دیا۔ مسکراہٹیں

بارش میں ایک دوسرے کو چوم رہے تھے۔ نجیب آگیا اور پڑتے ہی اُس نے اماں کو اپنے مدعا سے روشناس کرایا، فوراً اماں کے لئے عامر ایک کبریا عاشق بن گیا اور وہ بڑے فوراً رضا مند ہو گئیں۔

اماں کے جانے کے بعد ہم دونوں اور بارش اکیلے رہ گئے۔

”تمہیں مجھ سے شادی کرنا ہوگی سن۔“

”دیکھئے میں آپ کو کئی بار بتا چکی ہوں کہ میں نے عامر۔“

”کیا آپ کی منگنی ہو چکی ہے؟“

”جی نہیں۔“

”پھر یہ کیسی COMMITMENT ہے جس کا آپ اس قدر پاس کر رہی ہیں؟“

میں اُسے کیسے سمجھاتی کہ اپنے اندر کھائی ہوئی قسمیں اتنی آسانی سے توڑی نہیں جاسکتیں اور وہ جیسا شکبہ کتنی ہیں کوئی کس نہیں سکتا۔

”آپ کو عامر سے محبت ہے؟“ کچھ دیر بعد نجیب نے سوال کیا۔

”پتہ نہیں۔“

”کیا آپ SURE نہیں ہیں؟“

میں نے منہ پھیر لیا۔ پتہ نہیں کیوں اپنی FEELINGS کے متعلق پہلی سی

قلعیت اب مجھ میں نہیں تھی۔

”اگر آپ SURE ہونے کے لئے کچھ مدت ہفتہ، مہینہ، سال دس سال چاہیں تو انتظار کر سکتا ہوں۔“

مجھے معلوم نہ تھا کہ مرد کا اعتراف محبت اس قدر بلا سٹ کر سکتا ہے۔

”جی نہیں... میں اگر SURE بھی ہو جاؤں کہ.... کہ مجھے اس سے محبت

ہیں تو بھی.... میں آپ سے کبھی شادی نہیں کر سکتی۔“ میری آنکھوں سے خود بخود

آفتاب گل نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ میری ترقی کے لئے ضرور کوشش کرے گا۔ لیکن یہاں ترقی کی خواہش کس کو تھی؟ پہلے نجیب صاحب کو کئی فون اسی سلسلے میں کرنے پڑے۔

جب کلوزنگ کی تاریخ گزر گئی تو پھر اُن کے فون اور طرح اہم ہو گئے۔ اب وہ اپنے بزنس پنوں میں مجھے اور آفتاب گل کو مدعو کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ آفتاب گل کا پتہ کٹ گیا۔ اب

دن کے بجائے رات کے ڈنروں میں میری موجودگی نمایاں ہو گئی۔ پہلے میں اکاؤنٹ کیلئے چپ رہی۔ پھر نجیب صاحب ایسی باتیں کرنے لگے کہ ان کی کسی بات کا جواب میرے بس

میں نہ رہا۔ سلسلہ جو خالص بزنس کی وجہ سے شروع ہوا تھا۔ پرائیویٹ شکل اختیار کرنے لگا۔ عامر کے خط باقی عدگ سے آ رہے تھے۔ میں اُسے خط پر خط بھیجتی تھی۔ لیکن پتہ نہیں کیوں

نجیب صاحب کا ذکر کئی بچا کر بھاگ جاتا۔ سرسری طور پر میں نے اسے یہ بات لکھ دی تھی۔ کہ کول ایئر والے نجیب صاحب سے اکاؤنٹ کے سلسلے میں بزنس مینگز ہوتی ہیں لیکن

یہ لکھنا محال ہوتا جا رہا تھا کہ یہ بزنس مینگز اب سرسری نہیں رہیں۔ دفتر میں چرمیگوئیاں ہونے لگیں۔ آفتاب گل اب میری پہلے سے زیادہ عزت کرنے لگے۔ اخلائے راز سے میرا

دل پتے کی طرح لرزنے لگا۔ لیکن میں عامر کی طرف یہ اطلاع کیسے بھجواتی کہ ایک لکھ پتی مجھ جیسی کوڑھ کر لی پر بڑی طرح فریفتہ ہو گیا ہے۔ بھلا میں اُسے کیسے مجروح کر سکتی تھی؟

نجیب عامر کی طرح خوش رنگ خوش آواز نہیں تھا۔ لیکن اس میں کچھ اور ایسی خوبیاں تھیں۔ جو متاثر کئے بغیر نہ رہتی تھیں۔ وہ عورتوں کے تمام اُبلے میلے مودوں کا متحمل تھا۔

وہ اتنی ساری دولت کے باوجود بجز وانکساری سے گفتگو کرنے کا عادی تھا۔ اسے دوپہر پیسہ خرچنے کی عادت نہ تھی۔ لیکن اُس نے مجھے تحفوں سے لاد رکھا تھا۔ اماں کو جب بھی سلام

کرنے آتا تھے تحفے ساتھ ہوتے کہ اماں کی سٹی گم ہو جاتی۔ میرا بھی گویا اینڈ سلائیڈ جاری تھا.... عامر کو گئے ابھی سات مہینے ہی ہوئے تھے

کہ میری قسم پر مانی ویلج گری۔ اس روز بڑی بارش ہو رہی تھی۔ ہمارے باغ میں تمام پتے

ہے اور آخر میں انسان کو کوڑو کی طرح نہ گلنے والا شخص بن جاتا ہے۔

میں بھی پہلے شک سے شفا یاب ہونے کے بعد اپنی قوت سے آشنا ہو گئی تھی۔ کسی شخص کو بے دست و پا کرنے میں اپنے سامنے گھٹنے ٹیکے دیکھنے میں بڑی لذت ہے۔ آدمی سکندر بادشاہ کی طرح، ہلا کو اور چنگیز خاں کی طرح بڑا قوی محسوس کرنے لگتا ہے۔

اب مجھ میں پہلے سے زیادہ خوش اعتمادی آگئی تھی۔ میں نے اس واقعے کو عامر تک ایسے پہنچایا کہ اس کے سامنے کناٹے بھر گئے۔ اس کی اصلیت کو بے اصلیت بنا کر پیش کیا اور معاملے کو اہم نہیں ہونے دیا۔

لیکن نجیب کے بعد مجھے پتہ چل گیا کہ ہنر مرد پر کیسے حملہ کرتے ہیں۔ اس پر نظروں کا پیام ہم کس وقت گرنا آسان ہے۔ یہ مت سمجھو کہ میں کچھ چانگہ کی طرح بندھے لگے اصولوں کو استعمال میں لا رہی تھی بلکہ کہیں اندر ہی اندر مجھے اپنی قوت کا احساس ہو گیا تھا اور میں سو پر پاورز کی طرح اپنی قوت کو اید کی شکل میں پیش کرنے لگی تھی۔ کچھ عرصہ شناخاں ملتے ہوئے لیکن میں ان کے اور اپنے درمیان حدود قائم رکھنے میں کامیاب رہی۔ مجھے جس قدر تحسین و تعریف درکار ہوتی وصول کرتی اور باقی سب کچھ لوٹا دیتی۔ سنا ہے کہ سمس کے روز کمپنی بہادر کے افسروں کو دیسی لوگ ڈالیاں بھیجا کرتے تھے۔ کمپنی بہادر ڈالی میں سے جو کچھ پسند ہوتا رکھ لیتے باقی تھینک یو کہہ کر لوٹا دیتے

چاندی کی تھالی، سلیم شاہی جوتے کے پتاؤں تلے چھپے ہوئے نوٹ چینی کے بنے ہوئے کھلونے جن میں سونے کے زیورات ہوتے۔ تمام تر لیڈی بہادر رکھ لیتیں اور باقی ساری ڈالی لوٹا دیتیں پھول، پھل، مٹھائی

مجھے معلوم نہ تھا کہ توصیف اور تحسین کا کھیل دراصل پہاڑ تلے ڈائی نائٹ بچانا ہے۔ جب کافی بارود بھر جائے گا تو آخر میں فیلے کو آگ لگانے والے کو محض چھوٹی سی ماچس کی تیلی درکار ہوگی اور سارا پہاڑیوں اڑ جائے گا۔ جیسے ہوائی جہاز کے پنکھے کے

آنسو رواں ہو گئے۔

”کیوں آخر کیوں؟“ نجیب نے میرے کانپتے ہوئے ہاتھ پکڑ لئے۔ بھلا میں اُسے کیا بتاتی کہ میں پابندِ قسم تھی پابند نے نہیں تھی۔

بڑی دیر ہم دونوں خاموشی سے بیٹھے رہے۔ باہر بارش کو دیکھتے رہے۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بجابت سے بولا۔ ”ہم امیر لوگوں کی انا عجیب ہوتی ہے۔ ہمیں اتنی مراعات، اتنی اشیاء، اتنے فائدے پیسے کی وجہ سے حاصل ہونے لگتے

ہیں کہ ہمیں یہ واقعی بھول جاتا ہے کہ کچھ چیزیں ضرور ایسی بھی ہوں گی جو دولت کے بدل میں نہیں مل سکتیں۔ ہم تقریباً ایسی باتیں کرتے ہیں۔ لیکن دل میں ہمیں اس بات پر اعتماد نہیں ہوتا۔ میں نے بھی۔ اسی لئے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ میں تمام ذمہ داریوں سے چھٹکارا حاصل کر کے آپ تک پہنچنا چاہتا تھا۔ پتہ نہیں کیوں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ انکار کر دیں گی۔“

وہ دبے پاؤں کمرے سے نکلا بارش میں بھینکتا اپنی کار تک پہنچا اور پھر میرے کمرے کی طرف دیکھتا ہوا پچانک کی طرف کار لے گیا

اس دن کے بعد نجیب کا اکاؤنٹ تو ہمارے ہی بینک میں رہا۔ لیکن پھر وہ کبھی بینک نہیں آیا۔ آفتاب گل نزل مینجر بن کر ہیڈ آفس چلا گیا اور میں پہلے زلزلے کے بعد اینٹ کارا میٹھے میں مشغول ہو گئی۔

دراصل ہر کام کرنے سے پہلے ایک جھاکا ہوتا ہے۔ پہلی شرم، پہلا حجاب، بندش روک، جو کچھ بھی کہہ لیجیے۔ پہلا جھاکا اینارمل حد تک آدمی کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے۔ شراب کا پہلا پیالہ۔ پہلا بوسہ، پہلی چوری، پہلی بار گھر سے فرار چھوٹی بارگھ کو الٹنے کے وقت دل بہت زور سے دھڑکتا ہے۔ پھر جیسے آلو بخارے سے اس کی مو اتر جاتی ہے۔ اگر انسان اپنے نفس سے مجبور ہو جائے تو وہی واقعہ بار بار ہونے لگتا

”میں واصف کی امی بول رہی ہوں۔ آج شام واصف نے پانچویں منزل سے چھلانگ لگا دی تمہاری خاطر اس وقت اسے آپریشن تھیسٹر میں لے گئے ہیں۔“ اس کے سوا وہ اور کچھ نہ بول سکی۔

میرادل، دماغ، اعصاب تمام سن ہو گئے۔ وہ اتنا بہادر نونہ تھا کہ چھلانگ لگا دیتا کسی کی خاطر۔ وہ اتنے جذبے کا مالک بھی نہ لگتا تھا کہ کسی سے اتنی شدید محبت کرنا۔
— پھر میں نے تو اُس کے ہر اعتراف محبت کو ایسی خبر سمجھا جو دودن پرانی ہوتی ہے۔
جب میں ہسپتال پہنچی تو وہ تھیسٹر سے واپس کانسنٹ کیئر میں بے سُدھ پڑا ہوا تھا۔
اس کا سارا جسم پٹیوں سے یوں لپٹا ہوا تھا جیسے پرانے زمانے میں ملائی کی برف کو گرم پٹیوں میں پھیٹ لیا کرتے تھے۔ اس کی ماں فرش پر بیٹھی نفل پڑھنے میں مشغول تھی۔
.... اُس نے ایک بار بھی پلٹ کر میری طرف نہ دیکھا۔

ڈاکٹر مجھے تھوڑی دیر بعد اپنے کمرے میں لے گیا۔ ”دیکھو مس سمن، واصف کی جیب سے یہ خط نکلا ہے۔“

میں دیر تک آدھا صفحہ پڑھنے میں مشغول رہی جس میں اُس نے اپنی ماں سے معافی مانگی تھی اور اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ وہ میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

”آپ ہماری مدد کر سکتی ہیں۔“ ڈاکٹر نے مجھے کنکھیوں سے دیکھ کر کہا ”شاید واصف کی جان بچ جائے۔ شاید وہ دوبارہ نارمل زندگی بسر کرنے کے قابل ہو لیکن نفسیاتی طور پر ہمیں کسی ایسے شخص کی ضرورت ہے جو اس کا اعتبار بحال کر سکے ... ایسا معجزہ چاہیے جس کی وجہ سے وہ زندہ رہنا چاہیے۔“

لیکن میں تو صبح کی فلائیٹ سے لندن جا رہی ہوں۔

”یہ آپ کیسے کر سکتی ہیں مس وہ اس بوڑھی بیوہ کا کلوتا بیٹا ہے۔ یہ قتل ہے قتل ... آپ کو اپنی فلائیٹ کینسل کرنی ہوگی۔“

آگے کاغذ کی کتریں

جلی تیلی دکھانے والا اس قدر معصوم آدمی تھا کہ عرصے تک پتہ ہی نہ چلا کہ وہ بارڈر کا کھیل بھی جانتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی خرگوش جیسی آنکھیں چھوٹی چھوٹی بے ضرری مویں، چھوٹی چھوٹی بے کار باتیں، چھوٹی چھوٹی خراب عادتیں، چھوٹے چھوٹے عجیب، چھوٹی چھوٹی خوبیاں، چھوٹا سا گھرنا۔ چھوٹی سی تنخواہ۔ وہ مامٹر پاکٹ سائز فتنہ تھا۔ پہلی دوسری پانچویں بارہویں ملاقات تک اس کا اثر بالکل نہ ہوا۔ لیکن پھر ہومیو پیتھک دوا کی طرح اُس نے جسم کے اندر سائے سسٹم کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اُس کے ساتھ اتنے فری ہو جانے کی فقط ایک ہی وجہ تھی کہ میں اسے مکمل طور پر بے اثر اور معمولی سمجھتی تھی۔ مجھے اُس سے کوئی خطرہ نہ تھا۔

آج سے پورے ایک مہینے پہلے جب عامر نے مجھے خط لکھا کہ وہ ایم فل کے بجائے پی ایچ ڈی کی ڈگری لینا چاہتا ہے اور وہ اتنی دیر میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تو میں کتنی خوش تھی۔ پاپورٹ بنوانے، ہیلتھ کارڈ لینے، ٹکٹ خریدنے کے تمام مراحل میں واصف میرے ساتھ ساتھ رہا۔ ٹریول ایجنسی کے ہر پیرے پر میں اُس کی موٹر سائیکل سے اتر کر اُس کا شکریہ ادا کرتی تو مجھے لگتا۔ وہ بھی یہی چاہتا ہے کہ میں جلد از جلد یہاں سے دفن ہو جاؤں۔ میرے ساتھ تمام شاپنگ اُس نے کروائی۔ لیکن پرسوں شام جب میرا ٹکٹ بن گیا۔ بیگ پیک ہو گئے تو مجھے عجیب خبر ملی۔

یوسی ایچ ہسپتال سے اس کی ماں کا فون ملا: ”آپ کا نام مس سمن شیخ ہے۔“

”جی۔“

”کیا آپ ہسپتال آ سکتی ہیں؟“

میرے پاؤں تلے سے زمین ہلنے لگی جیسے ایس کلیئر اپنی سطح چھوڑتا چلا جاتا ہے

”کیوں؟ کیا ہوا۔“

کسی اگلے سیشن سے اور واپس واصل کے پاس چلی جاؤں تو بھی میں ساری عمر اس کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی

کیا ساری مصیبت اس قسم کی ہے جو میں نے کلنک میں کھڑے ہو کر کھائی تھی کہ اس سے پرے بھی کچھ اور ہے؟ — ہوائی جہاز کے انجن سے پیچھے بھی کیا کوئی طاقت اسے اڑنے لے جا رہی ہے

مجھے یوں لگتا ہے۔ فٹ کلاس کے مسافروں کی سائیڈ پر عام سفید قمیض پینٹ پر سیاہ ہیلٹ لگائے مجھے چوری چوری دیکھ رہا ہے۔ مجھے آزمانا چاہتا ہے۔ وہ بھی مجھ سے کوئی ایسی قربانی چاہتا ہے جو میری محبت کا میچور فیصلہ ہو۔ کچھ لوگ آئے بغیر نہیں سکتے۔ مجھے لگتا ہے عامر بھی ساری عمر مجھے آزمانا ہے گا۔

اور نیچے اس چھوٹی ہوئی دھرتی پر ایک چھوٹے سے کمرے میں واصل کی ماں کسی معجزے کا انتظار کرتی ہے گی۔ بیٹیوں میں پلیٹے ہوئے چھوٹے سے فتنے کو معلوم نہ ہو سکے گا کہ اس نے میری قسم کی کیسے دھجیاں بکھیر دی تھیں۔

اب میری قسم کا کاغذ تو باقی رہ گیا ہے لیکن لگتا ہے۔ اس پر رقم کئے ہوئے تمام حروف خود بخود مٹ چکے ہیں۔ میں پابند تو ہوں لیکن کس کی؟ مجھے چور کی سزا تو مل رہی ہے لیکن کیوں۔ یہاں وہاں۔ اب میرے لئے کچھ باقی نہیں میں آپ کو بتا رہی تھی ناں کہ سارا ٹنڈا ہی اس قسم نبھانے کا ہے یا شاید قسم کے ٹوٹ جانے کا



”ہیں اگر فلائیٹ کینسل کر بھی دوں ڈاکٹر صاحب تو بھی ہیں ان ماں بیٹے کو وہ خوشی نہیں دے سکتی جس کے وہ آرزو مند ہیں کیا یہ بہتر نہیں کہ میں آج انہیں CRISIS میں چھوڑ کر بھاگ جاؤں بہ نسبت اس کے کہ — یہ CRISIS باد بار ہو۔“

ادھیڑ عمر کا ڈاکٹر چپ ہو گیا۔ وہ غالباً مجھ پر ان لڑکیوں کا سیل لگا رہا تھا جو لڑکوں کو خراب کرتی ہیں۔ منہ پھٹ، گستاخ، پیسے کی پیر، موقع شناس، ڈاکٹر کی شخصیت ڈاڑھی ماتھے کی محراب، بند بند ہونٹوں سے ظاہر تھا کہ وہ مجھے ان لڑکیوں میں شمار کر رہے تھے۔ جو فتنہ و فساد کے لئے پیدا ہوتی ہیں۔ کچھ دیر وہ مجھے سمجھاتے ہے پھر چپ ہو گئے

میں کانسنٹ کیئر میں گئے بغیر گروٹ آئی اور ساری رات ایک ہی کرسی پر بیٹھی رہی

اس وقت میں ہوائی جہاز کی تیسری قطار میں بیٹھی ہوں۔ نیچے لاہور شہر نیچے چھوٹ رہا ہے۔ ایچی سن کی سُرخ مائل عمارت، نہر کے کنارے کنارے چلنے والی سڑک، جہانگیر کا مقبرہ لاہور کے سنگ میل پہنچ چکا ہے ہیں۔ ایئر ہوٹل میٹھی گولیاں، ٹافیاں چھابے میں لکے، جھوٹی مسکراہٹ چہرے پر سجائے پھر رہی ہے وہ میرا ہی دوسرا روپ ہے۔

میرا دل نیچے کی طرف اتر رہا ہے بھاگ رہا ہے کانسنٹ کیئر کی طرف کیا میں عام کرو یہ سب کچھ بتا سکوں گی؟ ایسے نہیں جیسے کوئی لا تعلق بات بتائی جاتی ہے بلکہ ایسے جیسا کہ اس بات کا مجھ سے تعلق ہے۔؟ میری انٹریاں، دل، جگر تمام مدھانی سے چکر کھا رہے ہیں۔

میں لوٹ جانا چاہتی ہوں۔ بیٹیوں میں بندھے سپس میں کی طرف لیکن میری قسم نے مجھے اس ہیلٹ کی طرح باندھ رکھا ہے۔ جو میری کمر کے گرد بندھی ہے۔ مجھے عامر سے بڑی محبت ہے۔ لیکن میں جانتی ہوں اب میں ساری زندگی عامر کے ساتھ وہ خوشی حاصل نہیں کر سکتی۔ جس کی مجھے آرزو تھی۔ ادا اگر میں لوٹ جاؤں۔

شاہراہ

سمن آباد سے گلبرگ تک کچھ ایسا فاصلہ نہ تھا۔

ٹیکسی، رکشا، بس سبھی اُدھر جاتی تھیں۔ لیکن نہ جانے کیا بات تھی راجیل اپنے آپ کو جزیرے میں مقید سمجھ رہی تھی۔ ایسا جزیرہ جس پر کوئی جہاز نہیں ٹھہرتا اور جس کے سمندر سے کشتیاں کسی دوسرے جزیرے کی طرف نہیں جاتیں۔ راتوں رات طوفان نے آکر پہاڑی راستے پر منوں من پتھر لا ڈالا تھا اور اب راجیل سڑک کے ایک کنارے معذور کھڑی تھی۔ مگر کھلا راستہ منہ پھاڑے دور تک کھائی بن چکا تھا۔ اور راجیل اس مگر مچھ کے منہ کو تک رہی تھی۔ حیرانی سے خوف سے نئے سمن آباد کے اس چھوٹے سے کواٹر میں وہ دونوں یکدم ساری دُنیا سے کٹ گئے تھے۔ بھری پری دُنیا میں چھپ کر ساروں سے آگے چوری چوری جو ایک کائنات بنانے کا دونوں کو ارمان تھا وہ ارمان ایک باسی روہو کی طرح اب بے جان دیدے کھولے پڑا تھا۔ باہر سڑک بنانے والا انجن دھک دھک کرتا روڑی کو ٹٹا آگے پیچھے چل رہا تھا۔ ہوا میں جلتی کو لٹا رکی خوشبو تھی۔ مردہ ارمانوں کی اڑتھیاں جل رہی تھیں۔ ایک جانب کو لٹا رک پکانے والی دیو آسا بھٹی کھڑی تھی۔ رام نام ست ہے رام نام ست ہے کی صدا میں چنگھاڑتے انجن سے آ رہی تھیں۔ وہ رام نام چپتا ہوا راہیں بنا رہا تھا۔ روڑی پس رہی تھی کو لٹا رک جل رہی تھی۔ سمن آباد سے جانے والی سڑک بن رہی تھی۔

لیکن راحیل کے ذہن میں جو شاہراہ سمن آباد سے گلبرگ تک جاتی تھی اس پر راستہ بندھے کا بورڈ نصب تھا۔ راستہ پر ڈرم بے ترتیبی سے پڑے تھے اور شاہراہ کی دونوں جانب سُرخی جھنڈیاں گر لی تھیں۔

اس کو اثر میں پہنچنے سے پہلے راحیل نے اس مشک نافے جیسی زندگی کے متعلق بہت خواب دیکھے تھے لیکن اب ان خوابوں کی آنکھیں مریحوں سے بھر گئی تھیں اور مشک نافہ پھٹنے ہی سارے میں گندے نالے کا تعفن پھیل گیا تھا۔ راحیل کی آنکھوں میں صبح کا ذب کی جھوٹی چمک تھی۔ بار بار وہ اپنے ذہن کی ٹوٹی شاہراہ پر رک جاتی۔ کھائی جیسے گہرے راستے کو دیکھتی اور سوچتی کیا یہی وہ ستاروں سے آگے دنیا تھی جو اب مردہ روہو کی طرح بے جان پڑی ہے۔ کیا یہی وہ منہ کھلا مگر مچھ ہے جس کی خاطر اس نے گلبرگ چھوڑا۔ ماں کی محبت کو نارنگی کا چھلکا سمجھ کر اُٹا دھینکا۔ کیا یہی وہ دنیا تھی! کیا سچ سچ؟ کیا واقعی؟

راحیل کو امارت سے بچھڑنے کا غم نہ تھا۔ نخل آسائش سے ٹوٹنے کا رنج نہ تھا۔ لبادہ عافیت اُٹا دھینکنے کا افسوس نہ تھا۔ یہ تکلیف تو ایسی تھی جیسے کسی نے اس پر ڈسپلے میں اپنے محبوب پائلٹ منگیتر کو بغیر پیراشوٹ کے دھکادے دیا ہو۔

وہ خود اس وقت ہوائی جہاز سے گر رہی تھی۔ بلا مقصد منزل کا تعین کیے بغیر خشکی اور تری سب اس کی نگاہوں میں بھر بھرے خاکے تھے۔ کسی جگہ اسی بستی میں اس کا گھر تھا لیکن اس گھر تک جانے کا راستہ کوئی نہ تھا۔ وہ ہوا میں اُتر رہی تھی اور اُمید کا پیراشوٹ اس کے ہاتھ میں نہ تھا۔ انجن مڑک کوٹ رہا تھا۔ راستہ بنا رہا تھا۔ سمن آباد سے گلبرگ جانے والی سڑک۔

راحیل کھڑکی میں بیٹھی سوچ رہی تھی۔ ابھی کل کی بات ہے۔ بالکل کل کی..... یوں ہی زبیر بھائی نے اس کے بالکل پاس کھڑے ہوئے آواز دی تھی۔ ”اُندرا جاییے۔“ جتنی تکلف نہ کیجئے۔“

زبیر بھائی کی آواز کتنی جانی پہچانی تھی۔ گلبرگ کے گھر کا برآمدہ گرے موزیک کا فرش پام

کے گلے، برآمدے سے نظر آنے والا ڈرائنگ روم، ڈرائنگ روم کے کارنس پر رکھی ہوئی جاپانی گشیا جیسی گڑیا۔ یہ سب چیزیں اس کے لیے پرانی تھیں۔ اجنبی تھا تو صرف وہ۔ جانا پہچانا اجنبی جسے آنکھوں نے پہلی بار دیکھا ہو اور دل نے یہ کہہ کر قبول کر لیا ہو کہ واہ صاحب یہ تو وہی ہے۔ وہی۔ بالکل وہی۔

”ان سے ملو بھی راحیل یہ سلیمان صاحب ہیں۔ ساری دُنیا میں پانچ فوٹو گرافر ہیں۔ مشہور ترین۔ فریڈرک، ہاؤارٹ، جن ہی تانگ ایک کانگو کا حبشی ہے ایک کوئی دوسری ہیں بری شو لو خوف اور پانچویں ہمارے سلیمان آجاؤ راحیل آجاؤ بھی۔ اس عظیم فوٹو گرافر سے ملو۔ آؤ ادھر۔“ راحیل گرے موزیک سے کھسک کر جاپانی گشیا کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ دُنیا کا پانچواں بہترین فوٹو گرافر لیے صوفے پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔

گو اس سے پہلے زبیر بھائی راحیل کو دُنیا کے بہترین ادیب، چوٹی کی اداکارہ، دُنیا کا تیرا بڑا ڈائریکٹر، پاکستان کا پہلا ریڈیو آلو جیٹ ایشیا کا دوسرا بہترین برین سرجن اور کرکٹ ٹیم کے کئی سکپر ملا چکے تھے لیکن جن اتفاق سے یہ فوٹو گرافر بڑا ذب نظر اور کنھیا روپ تھا۔ راحیل نے پانچویں بہترین فوٹو گرافر کی طرف دیکھا۔ پھر دیکھا اور پہلی بار اسے زبیر بھائی کی بات پر یقین آ گیا کہ سلیمان صاحب واقعی دُنیا کے پانچویں بہترین فوٹو گرافر ہیں۔

”سلام علیکم۔“ راحیل نے پھر اس کی جانب دیکھ کر کہا۔

سلیمان صاحب نے سگریٹ کی داکھ جھاڑی۔ آنکھوں کے کہیں پیچھے سے دیکھا اور بمشکل تمام کہا۔ ”وعلیکم۔“

زبیر بھائی کا گلبرگ والی کوٹھی میں بس اس قدر کڑکا دھڑکا تھا کہ وقت بے وقت پانچ چھ آدمی بلا اطلاع کھانے پر آتے صبح ٹیکسی پر روانہ ہوتے اور شام کو واپس آتے تو ٹیکسی کا میٹر ساٹھ باسٹھ پر ہوتا۔ بہنوں کو باہر جاتے دیکھ کر بچانگ سے لوٹا دیتے۔ امی کے ساتھ ہر شام مباحثے مول لیتے اور ہمیشہ جیت جاتے۔ اس جیتنے کی وجہ کچھ ان کی ذہانت یا منطقی دلائل نہ

تھے۔ بس سیدھی وجہ یہ تھی کہ امی بلاآخر ماں تھیں اور زبیر بھائی کی ہر کڑی کیسی جھیل کر بھر بار مان جاتی تھیں۔

”آئیے بیٹھے۔“ بڑی دیر بعد فوٹو گرافر بولا۔

لیکن جب وہ صوفے پر اس کے پاس جا بیٹھی تو سلیمان صاحب نے فوراً اس کی جانب پشت کر لی اور زبیر بھائی سے رولی فلیکس، کوڈک اور ایٹا کروم کی باتیں کرنے میں مشغول ہو گئے۔

”بازار میں ایک نہایت اعلیٰ سیٹنڈ آیا ہے ساڑھے سات سو مانگتا ہے خرید لوں سلیمان صاحب؟“ زبیر بھائی نے استفسار کیا۔

”سیٹنڈ؟ آپ کا کیمرا کونسا ہے؟“

”جاپانی ہے۔ یوشیکا“

”یوشیکا؟ اس کیمرا کو اتنے ہنگے سیٹنڈ کی کیا ضرورت ہے؟ آپ میرے ساتھ بلال گنج چلے چلیں میں سو سو سو میں ایک نہایت معقول سیٹنڈ دلوا دوں گا۔“

”گریٹ گریٹ۔“ زبیر بھائی نے نحو لگایا ”گریٹ ونڈرفل۔“

”بلال گنج میں ایک بڑا مالدار کبڑا ہے۔ بڑا سامان ہے اس کے پاس۔“

”خوب۔“ زبیر بھائی اب ذہنی طور پر بلال گنج پہنچ چکے تھے۔ ”اس کے پاس کیا کوئی انجن نہیں ہے ہوائی جہاز کا۔ پرانا۔ نیلامی ہوا کرتی ہے نا ان ہوائی جہازوں کی یہ کباڑیے وہاں سے لے آتے ہیں عموماً۔“

”انجن تو میں نے دیکھے تھے۔“

”چلو ابھی چلتے ہیں۔“ زبیر بھائی بولے کہ پاؤں میں اب سینچر پھٹک رہا تھا۔

”ابھی اس گرمی میں؟“ اجنبی نے سوال کیا۔

”اچھے مال کو فوراً بک کرانا چاہیے اور کچھ نہیں تو پیشگی تو دے آئیں۔ آدھو سلیمان۔۔۔“

۔۔۔ کم آن۔

زبیر بھائی اپنے دوست کو لے کر اٹھ بیٹھے جس تپاک سے انہوں نے راحیل کا تعارف کرایا تھا اسی تپاک سے وہ اسے بھول بھی گئے۔ جلتے ہوئے گیلری سے بولے ”راحیل ذرا چائے تیار کرنا ہم ابھی آتے۔“

زبیر بھائی دوکانوں پر بیچانے بھر آنے کے عادی تھے یہ بیچانے چار روپے سے لے کر چار سو روپے تک بلا تکلف ادا کیا جاتا تھا۔ کوٹھیاں نئے فیشن کی بیڑیاں، ٹیلی ویژن، ٹرانسٹر، پیئر ریڈیو، کیمرا، رسٹ وایج اور ہائی فائی کے متعدد بیچانے ادا کرنے کے باوجود ابھی تک وہ یہ سبق نہ سیکھ پائے پاتے تھے کہ پیشگی دینے کے یہ معنی ہرگز نہیں ہوتے کہ پوری قیمت بھی وقت پر ادا کرنا ممکن ہوگا۔

لیکن فوکس یگن جب شور مچاتی پھاٹک سے نکل گئی تو راحیل کو معلوم تھا کہ اب زبیر بھائی رات گئے آئیں گے اور واپسی پر ان کے ساتھ یہ فوٹو گرافر نہ ہوگا۔

سلیمان کے واپس نہ لوٹنے کا راحیل کو نہ جانے عجیب سا دکھ ہوا۔

زبیر بھائی کی دوستیاں چند روزہ ہوا کرتی تھیں۔ جب تک یہ دوستی رہتی۔ ان کا دوست دنیا کا اعلیٰ ترین آدمی ہوتا وہ سارے گھر کو اس دوست کی خواہشات کے تابع کر دیتے۔ لیکن پھر اچانک ایک روز پتہ چلتا کہ وہ دوست نہایت فراڈ، بدکردار اور لالچی تھا۔ اس لیے اس سے تمام رابطہ قطع کیا جا چکا ہے۔ زبیر بھائی پچھلے دوست کو عاق کرتے ہی فوراً خانہ پوری کی طرف متوجہ ہوتے اور شہر سے واپسی پر ان کے ساتھ کوئی اور نہایت جگری دوست موجود ہوتا۔ یہ نئے حضرت گوچنگل سنٹوں کے ملاقاتی ہوتے اور ان سے ملاقات عموماً ہوائی اڈے، کسی ہوٹل، سٹیشن یا کئی دفتر میں ہوتی۔ لیکن اسے زبیر بھائی نہایت بے ساختگی اور دلدار سے سورا، گدھا، احقر پکار پکار کر باتیں کرتے۔ اس دوست سے اپنی مالی مشکلات، بہنوں کے رشتے، مرحوم باپ کی جائیداد کی بدانتظامی اور والدہ کی ساری شکایتیں بڑی بے تکلفی سے کی جاتیں اور اس کے مشورے کو پچھلے دوستوں کی رائے کے ساتھ ملا کر اس طرح سراہا جاتا کہ پس ماندہ دوست دیا کا راور نووارد نہایت جانشتا نظر

آنے لگتا۔

دراصل جب تک وہ پانی والے تالاب کے محلے میں رہتے تھے نیل کا ماٹھ اس نذر نہ بگڑتا تھا۔ چھوٹی سی بستی حکیم جی سے لے کر قلعیاں فالو دے بیچنے والے تک سبھی ڈاکٹر صاحب اور ان کے گھروالوں کی عزت کرتے تھے۔ بھرمرحوم ڈاکٹر صاحب نے اپنا جمع جھتہ لے کر گلبرگ میں کوٹھی بنوالی۔ لیکن بیمار ڈاکٹر صاحب کو اس کوٹھی میں رہنا بے نصیب نہ ہوا کینسر کی شکایت ہوئی اور وہیں پانی کے تالاب والی حویلی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

گلبرگ کی کوٹھی میں آئے ابھی انہیں دو ماہ ہوئے تھے کہ راحیل کی والدہ پر ڈاکٹر صاحب کی حائیداد کو درست کرنے کا بھوت سوار ہو گیا۔ زبیر بھائی کو تھڑا سیر کی بڑھائی چھوڑنا پڑی۔ گو ویسے بھی وہ متواتر دو سال سے فیملی ہی ہو رہے تھے۔ اب بھائی پھر وہیں جو چھ مہینے تھے ان کی بسائی کے پروگرام بننے لگے۔ زبیر بھائی اپنے ایک انجینئر دوست کو لے کر مع بیس ہزار روپے کے زمینوں پر روانہ ہو گئے۔ یہ انجینئر ایشیا کا تیسرا بہترین انجینئر تھا۔ قریباً پانچ مہینے بعد ایک روز زبیر بھائی لوٹے۔ سفید رنگت سنولائی ہوئی مٹی چہرے پر گرد کی تہیں تھیں۔ اماں انہیں دیکھ کر رونے لگیں۔

”راحیل، زیبا، رانی — ادھر آؤ بھائی جان آئے ہیں —“

گلبرگ والی بہنیں پستول کی گولیاں بن کر نکلیں اور زبیر بھائی سے لپٹ گئیں۔

”ہاڈ آہ — مائی ڈیر ڈیر سسٹرز —“

”کیوں بھئی راحیل بی اے کر لیا؟“ زبیر بھائی نے پوچھا۔

”بہنیں بی اے کہاں اس نے تو بڑھائی چھوڑ دی —“ امی بولیں۔

”وہ کیوں؟“ زبیر بھائی کڑکے۔

”ٹائیٹنایڈ ہو گیا تھا — ڈاکٹروں کا مشورہ ہے کہ سال دو آدم کرنا چاہیے“

ٹائیٹنایڈ تو خیر نہیں ہوا تھا لیکن چند دن بخار ضرور چڑھا تھا جس کے بعد راحیل کی طبیعت

بڑھائی سے کچھ ایسی اچاٹ ہوئی کہ دوبارہ کالج کے نام پر ہی دم نکلتا تھا۔

”تم خطوں کا جواب کیوں نہیں دیتے تھے اتنے خط لکھے کسی کا جواب دیا ہوتا —“ امی نے زبیر بھائی کو محبت سے ڈانٹا۔

”لیجئے وہاں خطوں کا جواب کون دیتا بیٹھ کر صبح شام زمین کی دیکھ بھال میں لگتا تھا میری رنگت دیکھ لیجئے۔ دیکھئے جتنی ہو گیا ہوں مٹی کے ساتھ مٹی ہو گیا۔ بھلا میری عمر ہے کہ زمینوں کی دیکھ بھال کروں۔“

امی کا دل فوراً بیسج گیا۔

”اچھا چلو چل کر نہا دو ہلو ب — ہم نے کار خریدی ہے فوکس وگن —“

”سبز رنگ کی زبیر بھائی —“ لڑکیوں میں سے ایک بولی۔

”منے ہیں بھئی تمہارے —“

”ٹیوب ویل کام کرتا ہے نا اب؟“ امی نے سوال کیا۔

”کبھت وہ انجینئر فراڈ نکلا امی — وہ تو ایک ڈھبیری بھی نہیں کس سکتا تھا میں نے ڈانٹا۔ تو ایک رات — یہ پچھلے ہفتے کا واقعہ ہے رات کا وقت — مزاح میرے گھر سے کچھ فاصلے پر رہتے ہیں۔ رات کے وقت پستول لے کر آ گیا۔“

”پستول لے کر؟“ امی کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

”جی — اور سینے پر سوار ہو گیا۔“

چھوٹی بڑی ہر رنگ کی چیخ لڑکیوں کے منہ سے نکلی۔

”سینے پر سوار ہو گیا —“ امی نے فوراً زبیر بھائی کو بازوؤں میں لے لیا۔

”جی ہاں — وہ تو قیمت اچھی تھی کہ صرف مالی نقصان ہوا۔ جان بچ گئی ورنہ اس دیوث

لہ لہ کرئی کسرت چھوڑی تھی جان لینے کی —“

”کیوں زبیر بھائی فائر کیا تھا اس نے؟“ انیس نے پوچھا۔

آیا تھا۔ یہ دوست پاکستان کا چٹا دھیس ابن دھیس ابن دھیس تھا۔ اس کے پاس رقم اتنی تھی کہ چاہتا تو آدھا لاہور خرید لیتا۔ لیکن حسن اتفاق — کہہ لیجئے یا شومی قسمت — کہ ان بزنس میں صاحب کی سدا رقم مرچنٹ آف وینس کے انٹونیر کے طرح جہازوں میں INVEST ہو چکی تھی اور اس وقت وہ کسی ایسے پارٹنر کی تلاش میں تھا جو انہیں برابر کا شریک بزنس بنالے لیکن INVESTMENT فوری طور پر طلب نہ کرے ذمیر بھائی اس کے تجارتی تجربے سے بہت متاثر ہوئے۔ سب سے بڑی وجہ اس تاثر کی یہ تھی کہ چھٹے دھیس کا کہنا تھا کہ چونکہ واپڈا ہاؤس قریب پیسے اور یہاں ایک تو نگر طبقہ بستہ ہے اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ یہ پٹرول پمپ کامیاب نہ ہو۔ علاوہ ازیں یہ راستہ گلبرگ کی طرف ہوتا تھا۔ اور گلبرگ کی بڑی گاڑیاں پٹرول کی ٹنگی بھرے رہتی ہیں۔ اسی لیے ذمیر بھائی کو پوری طرح سے قائل کر چکنے کے بعد صرف روپے کی فراہمی اور درست پلاٹ کی بہم آوری کا کام رہ گیا تھا۔ پٹرول پمپ کی SANCTION وغیرہ کا سب کام اسی بزنس میں کے سپرد تھا۔ پلاٹ چننے میں ذمیر بھائی نے فوکس وگن پر کوئی بارہ ہزار میں کر لیے روپے کی فراہمی ان حالات میں کچھ ایسا سہل کام نہ تھا۔ اول تو گلبرگ کا معیار زندگی پھر چار بڑھتے چاند جیسی جوان لڑکیاں اور جائیداد کی بد انتظامی پٹرول پمپ کی زمین چھوڑا بن گئی۔ لیکن ذمیر بھائی کو راتوں رات دھیس اعظم بن جانے کا کچھ ایسا اعتماد تھا کہ وہ سر دھڑ کی بازی لگائے بیٹھے تھے پہلے کچھ عرصہ تو روز امتی کے ساتھ مباحثہ ہوتا رہا۔ پھر ذمیر بھائی نے دھمکی کا ایک ایسا لہجہ اختیار کیا کہ امتی کو فوراً پر قنچ کر لیا۔

”آپ کو مٹی دین کرنے سے گھبرا رہی ہیں لیکن یاد رکھیے اگر ذمیر بھائی لگا تو کو مٹی بیچ کر بھی آپ مجھے تلاش نہ کر سکیں گی۔“

امتی ہوا نیلے ٹائیر کی طرح بالکل ہی رہ گئیں۔

دوسرے دن کو مٹی کے کاغذات بنک میں رکھے گئے اور تیس ہزار روپیے کے ذمیر بھائی کے نام منتقل کیا گیا۔ یہ رقم ذمیر انڈیکو کے نام سے بنک میں جمع کروائی گئی یہ کاؤنٹ حسن اتفاق سے

بسیوں سمجھ کر امریکی فلم کا ایک شوٹ ہو گیا دیہات میں۔ سینے پر سے میں نے اچھا لٹو چھپ کر تک اڑان گئی۔ جھول پڑ گیا چھت میں، اسی ہڑ بونگ میں اسی کی پستول چھوٹ گئی ہاتھ سے۔

”چلو چپ بھی کرو۔“ شکر ہے لاکھ لاکھ تیرا لڈمیاں۔“ امتی اب منہ ہی منہ میں یاد مالو کی تسبیح پڑھنے لگی تھیں۔ پانی والے تالاب کی ایک ہمسائی نے انہیں بتا رکھا تھا کہ مصیبت ٹل جانے پر یاد مالو کی ایک تسبیح اللہ کے حضور بہترین سپاس نامہ ثابت ہو کر تاپے۔

”پھر ذمیر بھائی پھر۔“

”بھئی ہم تو اسے ایک بار زبان سے دوست کہہ چکے تھے کیسے اس پر فخر کرتے وہ دیا کارالما کی توڑ دس ہزار روپیہ ہتھیا کھڑکی سے کود گیا۔“

اس وقت امتی کو دس ہزار کے عوض اپنے بیٹے کی جان بخشی نہایت سستی نظر آتی۔ لیکن چند دن بعد جب حکومت کی طرف سے ملے کا نوٹس ملا تو وہ سوچنے پر آمادہ ہو گئیں۔ بھائی پھر و کی زمین ڈاکٹر صاحب کے عہد حکومت میں اچھی خاصی رقم لایا کرتی تھی اور ہمالیے کیلئے بھی حکومت نے احکامات جاری کر دیئے تھے۔ کہ اگر ہفتے کے اندر اندر چھ ہزار جمع نہ کر دیتے تو ٹیوب ویں ہی نیلا کر دیا جاتے گا۔ امتی نے بھائی ذمیر کو زمین پر بھیجنے کے بہت جتن کیے لیکن وہ ہر بات کا یہی جواب دیتے۔

”امتی اب مجھے معلوم ہوا کہ تمہیں زمین زیادہ پیاری ہے اور بیٹا کم — وہاں پاس والی زمینوں پر وہ دیوٹ انجنیر رہتا ہے کون جانے کب میری زندگی کا چراغ گل کر دے!“

اس منطق کے سامنے امتی کے سادے اصرار سرد پانی کے چھینٹے بن گئے۔ بیچاری بھاگ بھاگ دفنوں کے چکر لگاتیں۔ کلکروں سے لے کر افسروں تک ڈاکٹر صاحب کی پیادری اور انتقال کی ساری تفصیلات بیان کرنے کے بعد کہیں امتی رعایت ملی کہ مالیہ تین مہینے کے اندر اندر جمع کروا دیجئے۔

ذمیر بھائی زمینوں پر کیا جاتے۔ ایک تو امتی نے فوکس وگن خرید لی تھی اور ایک ان کا بہترین جگری دوست جیل روڈ اور دھیس کو دس کے نلکے پر پٹرول پمپ بنانے کی بڑی اعلیٰ اسکیم ساتھ لے

وہ بزنس میں صاحب اوپیریٹ کرتے تھے جیل روڈ پر ایک جگہ کا انتخاب ہو گیا اور پانچ سو روڈ بھی سائی کے دیئے جا چکے تو دوسرے دن بزنس میں صاحب اچانک ڈھاکہ چلے گئے ان کے دو جہاز پٹ سن سے لے کر امریکہ جا رہے تھے اور اتنی بڑی رقم کے سامنے معمولی پٹرول کی کیا حیثیت تھی؟

بزنس میں صاحب جن کا نام بختیار رضا تھا۔ بڑی تاکید کرتے ایرپورٹ پہنچے گینگ دے تک ہاسٹوں کے اشارے سے وہ زبیر بھائی کو کہتے رہے کہ کام میں کوتاہی نہ کرے سینیٹ کا انتظام اور بحری کے ٹرک تیار ہونے چاہئیں۔ شفاف شیشے اور گراؤنڈ گلاس کا آرڈر دیا جائے تو بہتر ہے بزنس میں بختیار رضا کا خلوص دیکھ کر بار بار زبیر بھائی کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ ”دیکھو یاد تم نوجوان بہت منچلے ہوتے ہو میں ہفتے بھر میں آ جاؤں گا لیکن میری غیور جوگی میں کام جاری رکھنا۔ ایسے لگے رہنے سے کام پایہ تکمیل کو پہنچتے ہیں۔“

رینلنگ پر ہاتھ ملاتے وقت یہ آخری لفظ پاکستان کے چپٹے رئیس اعظم نے کہے تھے۔ عجیب اتفاق ہوا کہ اس کے بعد زبیر بھائی کو اس بزنس میں سے سچر کبھی سابقہ نہ پڑا اور عجیب تر اتفاق تھا کہ زبیر اینڈ کوکسارا اکاؤنٹ بختیار رضا صاحب کے نام تھا اور وہ پٹ سن کے جہاز روانہ کروانے سے پہلے اس اکاؤنٹ کو خالی کر کے بند کر دیا چکے تھے!

امی کو یہ خبر سن کر پہلی بار دل کا درد اٹھا۔

ادھر آمدنی کی صورت یہ تھی کہ ساون کے بادلوں میں سے سورج کبھی کبھی نظر آتا۔ ادھر اخراجات کے تابڑ توڑ پڑتے وہ تھے کہ اٹیم بم کی طرح زلزلہ خیز۔ لیکن زبیر بھائی ابھی بنی نوع انسان سے مایوس نہ ہوئے تھے وہ کسی ایسے پارٹنر کی تلاش میں سرگردان تھے جو اس بار خود اٹا نہ لگائے اور انہیں برابر کا شریک بنائے۔ امی نے لاکھ لاکھ تنقیدیں کیں کہ بھئی کوئی چھوٹا موٹا کام شروع کر لو۔ لیکن چھوٹے موٹے کام کا جب پڑتا لگانے بیٹھتے زبیر بھائی تو بوکھلا جاتے اور بھنا کر کہتے۔ ”ماں اس سے تو بہتر کہ میں ٹرین تلے آ جاؤں۔“

امی کے منہ پر یاد وصال کی تسبیح آ جاتی اور وہ خاموش ہو جاتیں۔

ادھر گھر کا اٹا نہ بھانک بھر تھا ایک حوض کو ایک نالی خالی کیے جا رہی تھی اور بھرنے والی میں سے سوائے سوں سوں شور کے ایک قطرہ بھی نہ نکلتا تھا۔ امی نے حالات سے تنگ آ کر گلبرگ کی آدمی کو مٹی کرائے پر چڑھائی اور سکھ کا سانس لیا۔ اب دال آٹے کی فکر سے تو نجات ہوئی لیکن ماں بیٹا دونوں پیدائشی اسکیمو تھے۔ بیٹے کو اپنی لگن اُٹائے پھرتی تھی۔ ماں بیٹے کے فنک بوس پلان کچھ کر کچھ ایسی بوکھلائی کر سرے سے خود اعتمادی ہی کمزور بیٹھی تھی اور نہایت زمین دو ذرہ قسم کے پلان بنانے پر مجبور ہو گئی تھی۔

پہلی بزنس جو امی نے کی وہ مرغیوں کا ڈربہ بنانا تھا۔

ڈربے کی جالی خرید کر جب انہوں نے رمضان مستری کو بلوایا تو زبیر بھائی گھر پر نہ تھے۔ ڈربوں میں جب منار کا، دیسی، لگ، ہارن اور جیتی والی مرغیاں آ گئیں تو زبیر بھائی معائنے کو آئے۔ ایک بزنس میں دوسرے بزنس میں کے دو بروسر قد ایسا دہ ہو گیا۔

”امی میں نے آپ سے کہا تھا کہ خدا کے لیے مرغیاں نہ پالیں نہ پالیں اس میں کوئی فائدہ نہیں؟“

”فائدہ کیوں نہیں میں نے پڑتا لگا لیا ہے فی مرغی ایک روپے بارہ آنے بچتے ہیں۔“

”اور ایک ہسینے میں کتنی مرغیاں بیچیں گی آپ؟“

”یہی کوئی دو سواد سو۔“

”یہ بھی کوئی نفع ہے۔“ زبیر بھائی تاؤ میں آ کر بولے

”ہم تمہاری طرح لاکھوں کے خواب نہیں دیکھتے آٹے دال کا خرچ چلاتے ہیں۔“

زبیر بھائی کچھ تو اس دلیل سے خائف ہو گئے کچھ ان دنوں دنیا کا بہترین ساتواں فلم ڈائریکٹران کا دوست بنا تھا اور ڈرائنگ روم میں بیٹھا پائپ پی رہا تھا۔ زبیر باورچی خانے سے ماچس لے کر ڈرائنگ روم کی طرف لوٹ گئے۔

مرغیوں نے پہلے پہل تو بہت جلوہ دکھایا۔ امی ان کے سامنے اپنے ڈربے صاف کروائیں
نفیس ڈکواتیں پینے کے کٹورے صاف کروائیں باسی دانہ دنکا تبدیل کرنے کا انتظام کرتیں۔ رفتہ
رفتہ انہیں نہالوجہ لادنی اور رمضان پر بہت اعتماد ہو گیا۔ دراصل یہ مرغیوں کا کاروبار انہوں
نے رمضان مستری کے مشورے پر ہی کیا تھا۔ وہ گلبرگ میں امی کے پھوپھاڑے کو اڑوں میں
رہتا تھا اور نسبت روڈ پر ایک مشہور دوکان میں ملازم تھا۔ چار بجے چھٹی کے بعد جب وہ گھر
لوٹتا تو اس کی بیوی آرام سے بیٹھنے نہ دیتی اس لیے اس نے بیگم صاحبہ کے ساتھ بزنس کھول
لی۔ اس بزنس میں اناٹہ بیگم صاحبہ کا تھا اور محنت رمضان کی!

امی قابل اعتماد تھا لیکن بیوی سے بہت خائف تھا اور بیوی چھٹی بار نہ جگی سے
دو چار ہوتی تو ایک دن رمضان چھٹپٹے کے وقت ایک چورہ ڈربے میں سے نکال کر لے گیا۔ گھر
کے چورے کی نیکی کا سوا کچھ ایسا تھا کہ رمضان کو سبھی دو چار چکیاں لگا کر اپنے اندر گرمی سی
محسوس ہوتی۔

کچھ دنوں میں ڈربے خالی خالی سے ہونے لگے۔ بیگم صاحبہ کو جب خبر ملی کہ مرغیوں
کو رانی کھیت کی و بانے آن دبا یا ہے تو وہ بوکھلا گئیں۔ باقی رہے سپہ پچیس ولاتی مرغیاں
اندھے ڈربے کی حالی والی سب رمضان کے توسط سے ٹونگلٹن مارکیٹ میں ایک دوکاندار کو
فروخت کر دیں۔ اس ناکامی سے دو آدمیوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ ایک تو رمضان نے فوراً
ٹرانسٹر خرید لیا اور زبیر بھائی جو پہلے امی کی باتیں کان لپیٹ کر سن لیتے تھے اب پلٹ کر
جواب دینے لگے۔

”امی بزنس چیز ہی ایسی ہے کبھی تخت کبھی تختہ — دیکھ لیجئے آپ کا مرغیوں کا بزنس
فیل ہو گیا۔ ہم کوئی آپ کو طعنہ حقوڑی دیتے ہیں؟“

پہلے زبیر بھائی امی کی باتوں سے لاجواب ہو کر کبھی انجن تلے آنے کی دھمکی دیا کرتے تھے
کبھی روپوش ہونے کا ڈنڈا دکھاتے تھے سونزل چھانکنے کو بھاگتے تھے اب ان جوش اور باتوں

سے فوراً نجات مل گئی اور وہ ایک ہی جہت میں امی سے آگے نکل گئے۔

امی نے پہلے تو مرغیاں پالیں پھر اس سکیم میں ناکامیاب ہو کر تین درزی گھر بٹھائے
اور ریڈی میڈ کپڑے سلائے اور بیچنے کا پروگرام بنا۔ درزی بڑی اعلیٰ دوکانوں میں کام
کر چکے تھے اور ان کی ساکھ خود ان کی اپنی نظروں میں بہت زیادہ تھی وہ تینوں پتلون پہنتے
تھے اور کلائیوں پر گھڑی باندھتے تھے۔ اڈے پر بیٹھنے کے لیے جو پانچا باندھے وہ پہنتے وہ عین چار بجے
گھڑی دیکھ کر اتار دیتے جاتے اور پتلونیں کس لی جاتیں چار بجے کے بعد جتنا بھی وقت کام پر لگتا سارا
اور ٹائم میں درج ہوتا۔ ماہ بھر کے بعد تینوں درزیوں کا اور ٹائم تنخواہ سے زاد نکلا۔ ریڈی میڈ
کپڑوں کی سجاوٹ میں جو لیس، فینسی بٹن، ڈوریاں دھاگے استعمال میں آتے تھے عموماً ان کی
قیمت گلبرگ مارکیٹ کی وجہ سے دو گنی ہوتی مہینہ بھر بچوں کے کپڑے دھڑا دھڑا سلائے اور
پلاسٹک کے مقبولوں میں بند کر دلنے کے بعد جب گھر میں ریڈی میڈ کپڑوں کے سوائے اور کوئی
چیز نظر نہ آنے لگی تو ان کے بیچنے کا سوال پیدا ہوا۔ اس سے پہلے امی کا خیال تھا کہ ریڈی میڈ کپڑوں
کی مانگ اتنی ہے کہ اگر گھر گھر دوکانیں کھل جائیں تو بھی مانگ کم نہیں ہو سکتی۔ لیکن اب بیچنے کا
کا سوال ٹیلہا بن گیا۔ زبیر بھائی کو جتنے پیکٹ دیتے گئے وہ تمام سامپل مختلف دوکانوں پر
بھوڑا آئے اس روز بہت ہنگامہ ہوا۔ زبیر بھائی بیس پیکٹ لے کر گئے تھے سارا مال قریباً
دھائی سو روپے کا تھا۔

”مال دے آئے۔؟“ امی نے زبیر کو پوچھ میں ہی آتے پوچھا۔

زبیر بھائی نے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا دھماکے کے ساتھ فوکی کا دروازہ بند کیا۔ اور
اکر بولے۔ ”امی دم تو لینے دو۔“

امی چند لمحے ساکت رہیں پھر بولیں ”مختلف دوکانوں پر مال دیا تھا کہ ایک ہی ڈیلر کے
اکرا آئے ہو۔“

”مارکیٹ میں تو فلد آیا ہوا ہے ریڈی میڈ کپڑوں کا۔ پتیس دوکانوں پر گیا کوئی مال

اٹھانے کو تیار ہی نہیں ہوا۔ میں تو بہت پریشان ہوا۔ بالآخر ایک دوست مل گیا انارکلی میں۔ وہ کپڑا امپورٹ کرتا ہے۔ تین لاکھ کا لائسنس ہے اس کا۔ پاکستان کا بہترین بزنس ہے۔ اس بیچارے نے بہت ٹائم ویسٹ کیا۔

”پھر؟“
”دسے دیا ہے بھی دسے دیا ہے۔“

”ایک دوکان پر کہ مختلف دوکانوں پر۔“

”دس دوکانوں پر مال دیا ہے۔“

دس دوکانوں کا نام سنتے ہی امی کی آنکھوں میں موتیا بند آتے۔

”رسیدے لی سہی ان دکانداروں سے؟“ امی نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

زبیر بھائی اب گیلری تک پہنچ چکے تھے۔ غصے میں ان کے ہاتھ سے کار کی چابی جھوٹ کر موزیک کے فرش پر گری اور وہ چڑ کر بولے۔ ”واہ اماں کوئی بے اعتباری معاملہ تھوڑی ہے۔ میرا دوست ساتھ تھا۔ بھلا میں اس سے رسیدیں مانگتا!۔“

امی کا ہاتھ ٹھنک کا پہلی بات پر تھا۔ اب رسیدوں کی عدم موجودگی نے اور بولا دیا۔ چلا کر بولیں۔ ”اجمق! تیرے دوست میرے دیکھے بھالے ہیں۔ جو سادی رقم نہ ڈوب گئی تو مجھے میڈ ٹاشم علی کی بیٹی نہ کہنا۔“

زبیر بھائی کو سارے جملے میں اجمق پر اعتراض تھا چمک کر بولا۔ اسی لیے تو میں آپ کے کسی کام میں دلچسپی نہیں لیتا۔ خواہ مخواہ انسان کو گالیاں سننا پڑتی ہیں۔“

”میں نے تو اس لیے پوچھا تھا کہ تمہارے دوست ایسے ہی ہیں؟“

”کمال کرتی ہیں آپ بھی امی۔ دوستوں پر ایسی بداعتمادی؟“

اس کے بعد امی نے زبیر بھائی کے تمام دوستوں کا کچا چٹھ کھول کر سنایا۔ ساتھ ساتھ زبیر

بھائی پر بھی کچھ ایسا کڑا تبصرہ جاری ہوا کہ وہ اندر گھس کر اپنا سامان باندھنے لگے۔

اب سامان باندھنے والا معاملہ امی کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ کہاں تو امی ڈانٹ

ڈپٹ رہی تھیں کہاں الٹی سیدھی سبب و قاعہ میں لپٹی ہوئی نرم نرم باتیں کرنے لگیں۔ پہلے زبیر بھائی اکڑے پھر کچھ ٹھنڈے پڑے پھر امی کی بدسلوکی پر تفصیلی تبصرہ کیا اور جب امی اپنی بیوی کا رومال آنکھوں سے لگا لگا کر روئے لگیں تو بیچارے زبیر بھائی نہ صرف پیسے ہی گئے بلکہ امی سے پاس روپے تاوان لے کر انہوں نے سامان بھی کھول لیا۔

ریڈی میڈ کپڑوں کی بزنس خدا جانے کیوں فیل ہو گئی۔ درزی بھی قابل تھے کپڑے بھی خوبصورت سہلے لیکن کچھ تو پہلے ہی سامپل نہ لوٹے نہ ہی دکانداروں نے ان کپڑوں کی قیمت ادا کی امی اس نقصان سے جا بڑھوئیں تو ایک دن ایک درزی دو سو روپے کا کپڑا لے کر حیرت ہو گیا۔ بد قسمتی سے اس درزی پر امی کو سب سے زیادہ اعتماد تھا۔ ہر ایک مشین نہ جانے کیسے بگڑ گئی۔ اس میں دو تین مرتبہ پرزے بدلوائے لیکن ہر بار کپڑا مشین کے پیر تلے دھرتے ہی تھقی رگ جاتی۔ ایک انچ کپڑا آگے نہ بڑھتا۔

یہ سب باتیں بھی شاید حوصلہ شکن ثابت نہ ہوتیں لیکن پھر اچانک دونوں درزی چھٹی لے کر ایسے چپت ہوئے کہ مشینیں ادنیٰ پونی قیمت پر بک گئیں۔ سارے ریڈی میڈ کپڑوں کو ادھی قیمت پر بیچ کر اس بزنس سے چھٹکارا ملا۔

یہ بزنس کیا فیل ہوئی زبیر بھائی صبح وشام بغلیں بجاتے امی سے ریڈی میڈ کپڑوں کی سیل کے متعلق سوالات کرتے درزیوں کی چھٹی کے بارے میں حیرت ظاہر کرتے بشیزوں کے کل پرزے بگڑ جانے پر اظہار افسوس کرتے کچھ عرصہ امی نے یہ ڈھکی چھپی طنز برداشت کی پھر صاف صاف زبیر بھائی سے کہہ دیا کہ اگر کسی نے مرغیوں کا یا ریڈی میڈ کپڑوں کا ذکر کیا تو وہ گھر چھوڑ کر چلی جائیں گی۔

امی کے اس موڈ سے زبیر بھائی خوب مستفیض ہوئے۔ وہ پہلے تو امی کے سامنے فلم کمپنی بنانے کا ذکر کرتے شرماتے یا گھبراتے تھے لیکن کپڑوں کی سکیم کیا فیل ہوئی انہیں فلم کمپنی کا پرانا مل گیا۔ اس سلسلے میں ہر سہانہ کے نیچے بکھیر و گھرانے لگے۔ لمبے لمبے بالوں والے ایکڑنا

ایک طرح کے دانت پان کی وجہ سے سیاہ ہو چکے تھے اور چہرے پر گر سنبھیر پینے کی بہتر زندگی تھی۔ ایسے امیر اشخاص جو امیر کم تھے اور کوکا کولا کا خرچ زیادہ کر دیتے تھے دنیا کے بہترین میوزک ڈائریکٹر، سٹوڈنٹس کی آئندہ بہترین ایکٹریس۔ اور فوٹو گرافر!

فوٹو گرافروں کی فہرست میں سیماں چوتھا شخص تھا اور دنیا کا پانچواں بہترین فوٹو گرافر سیماں سے پہلے اس گھر میں اتنے نوادرات داخل ہو چکے تھے کہ اصولاً اس کا گھر والوں پر کوئی خاطر خواہ اثر نہ ہونا چاہیے تھا لیکن راحیل جیسے بنجر زمین تھی جو بارش کی آمد میں پھٹی پڑتی تھی۔

راحیل پر دنیا کے پانچویں بہترین فوٹو گرافر کا عجب اثر ہوا۔

وہ سب سے بڑی سٹی۔ زیبا، رانی، انیسہ بتدیج دو دو تین تین سال چھوٹی تھیں۔

پانی کے تالاب والے ڈاکٹر صاحب کی اپنے زمانے اور اپنے علاقے میں بڑی عزت تھی۔ وہاں کے ایک مقامی سکول میں چاروں لڑکیاں پڑھتی تھیں۔ جس کسی مضمون میں کوئی لڑکی کمزور پائی جاتی فوراً ہیڈ ماسٹر میں متعلقہ مضمون کی اسانی کو مناسب ہدایات دیتیں اور لڑکی بغیر ٹیوشن ادا کیے اسی مضمون میں طاق ہو جاتی۔ گلبرگ میں پہنچ کر چونکہ آبا جی کا ساتھ بھی چھوٹ چکا تھا۔ اس لیے نئے کالج میں داخلہ لیتے ہی راحیل احساس کمتری کا شکار ہو گئی۔ یہاں اس سے خوبصورت، زیادہ فیشن ایبل، نہایت امریکی انداز میں انگریزی بولنے والیاں صف در صف لڑکیاں موجود تھیں۔ راحیل نے جی جی میں اس ماحول کے خلاف جہاد کرنے کی ٹھانی۔ لیکن بیچاری کا عزم آتش بازی کی طرح تھا کہ دم بھر کو انار سا پھول اٹھتا پھر گھٹا ٹوٹا اندھیرا چھا جاتا۔ راحیل درحال تو الگ تھلگ رہی کچھ مریل اور دبوسی لڑکیاں توڑتا کر اپنے ساتھ بھی ملائیں لیکن موثر قسم کا گروپ نہ بن سکا۔ جس طرح دی گروپ تھا یا میساکارنیشن گروپ تھا کہ ساری لڑکیاں ہر فنکشن پر ایک ہی طرح کا لباس پہنے بالوں میں کارنیشن کے پھول لگا کر آیا کرتی تھیں۔ راحیل کو لیڈی کا شوق بہت تھا لیکن جبلی طور پر وہ پیو کا تھی۔ شوق کی بلندی اور مہتوں کی پستی نے یہ گل کھلایا کہ تھوڑا سا تھک تو پہنچ گئی لیکن چند دن ہیاد کیا پڑی کالج جانے

کی ہمت ہی باقی نہ رہی۔ کالج چھوٹنے کا قفقہ بھی خوب ہنگامہ خیز رہا۔ ان دنوں زیر بھائی زمینوں پر پاکستان کے بہترین انجینئرز کے ساتھ بھائی پھیر و گئے ہوئے تھے۔ امی کے ہر خط کا جواب جب وہاں سے نہ آتا تو وہ بھڑک بھڑک کر اپنا غصہ چاروں لڑکیوں پر نکالتیں ان ہی دنوں رانی نے یہ شوشہ چھوڑا کہ راحیل باجی اب کالج نہیں جائیں گی پہلی بار جب یہ بات ہوئی تو امی ہری فکس وین پر تیسرے کوارٹر کا ٹوکن لگوا کر شہر سے آرہی تھیں۔ ابھی گھر میں قدم ہی رکھا تھا کہ رانی نے کہہ دیا۔ ”امی باجی راحیل کالج نہیں جائیں گی۔“

ٹوکن کے پیسے ادا کرنے کے بعد جو ایک قسم کا ڈکھ امی کو ہر بار ہوتا تھا اس پر اس جیلے نے تانہ زیانے کا کام دیا۔ ”کیوں؟ کس لیے نہیں جائے گی وہ؟“

رانی بدگئی۔ ساتویں جماعت کی طالب علم کو معلوم تھا کہ اس وقت یہ خبر ایسی وحشت خیز ثابت ہو سکتی ہے۔ امی تو یکدم آگ بھیمو کا ہو گئیں۔ چیخ کر بولیں۔ ”اللہ جانے کس گناہ کی سزا مل رہی ہے ایک لڑکا تھا سونا کارہ ثابت ہوا۔ اس بیٹی پر اس تھی سو یہ بھی کورا جواب دے رہی ہے۔ اپنے بچوں کی ہسٹری سے لے کر راحیل کے اس انکار تک پوری تفصیل سے سناتی اور اپنے ارمانات کی فہرست مرتب کرتی ہوئی راحیل کے کمرے تک پہنچیں۔ وہ اس وقت فرانسیسی ڈیرپوں کے سامنے سفید چادر گھٹنوں تک اوڑھے پیالی میں یخنی پی رہی تھی۔ تازہ تازہ بخار اترتا تھا۔ چہرے پر چپکنے زرد لیموں کی رنگت تھیں۔

امی برسے لگیں۔ ”رانی کیا کہتی ہے؟“

”کیا کہتی ہے رانی؟“ ٹوکن بنوا لیا آپ نے؟“ راحیل نے بڑے معمولی لہجے میں پوچھا۔

”ٹوکن گیا مجھار میں۔“ رانی کہتی ہے تم بی اے کرنا نہیں چاہتیں۔“

زرد لیموں کی رنگت پر آنسو پلکیں جھکا کر راحیل بولی۔ ”جی امی۔“

ایسے سادہ مثبت جواب کی امی کو امید نہ تھی۔

”کیوں؟“

”میں سمجھتی ہوں امی بار بار فیمل ہو کر جو پیسہ برباد کروں گی تو— یہی بہتر ہے کہ پڑھائی چھوڑ دوں کچھ تو بچت ہوگی ناں۔“

”تم بچت کا فکر رہنے دو۔ پہلے جو بچتیں کام آ رہی ہیں تم آرام سے پڑھائی کر دو۔“

پلکوں کی صف اٹھاتے بغیر راحیل بولی۔ ”امی میں پڑھائی نہیں کر سکتی۔“

”تیری یہ مجال؟“

وہ تو امی مار بھی بیٹھتیں پر لڑکی کا بخار دو دن ہوئے ٹوٹا تھا۔ جھنا کر سفید چادر پر جا بیٹھیں۔

”مجال نہیں امی— میں عرض کر رہی ہوں۔“ راحیل نے منت کی۔

”لیکن کوئی وجہ؟“

”میں— میں اتنی ذہین نہیں ہوں کہ بی اے کر سکوں۔“

اب امی رونے لگیں ساتھ ہی ساتھ ان کے منہ سے لوگوں کے متعلق رشک کے کلمات نکلنے لگے اللہ نے میری ہی قیمت کھوٹی بنائی تھی۔ ورنہ معمولی دانی سکینہ کے دونوں بچوں نے بی اے کر لیا۔ مستری رمضان کا لڑکا ان دنوں ولایت میں ہے۔ مہر الہی کی بھانجی پروفیسر ہو گئی۔ جو لوگ ہمارے برابر نہ بیٹھتے تھے ان کی اولادیں پڑھ گئیں اور ایک ہم ہیں کہ— کہ کہ نہ بیٹا پڑھ سکا نہ بیٹی۔“

راحیل پر ان باتوں کا اثر اتنا جلدی ہوا کہ وہ فوراً لپٹ گئی۔ بخنی کا پیالہ کٹھری کی سل میں پڑا رہا اور راتوں رات پھر بخار چڑھ آیا اور ایسا تیز چڑھا کہ راحیل پر سرسام کی کیفیت طاری ہو گئی۔ جس وقت ڈاکٹر نے مکمل آرام کے ساتھ آئس کیپ بھی رکھنے کا مشورہ دیا تو امی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اب وہ رومال کو برف میں کھمکھو رہی تھیں اور آنسوؤں سے زیادہ تر کیے جا رہی تھیں۔

ماتھے پر برف سے تر و مال دھر کر امی کہتیں۔ ”دفع کر پڑھائی، صحتے کی پڑھائی۔ ایک

بار بخار اتر جاتے تو جو کبھی میں بی اے کا نام بھی منہ سے لوں تو کافر— اللہ بیخ تن پاک کی خاطر— اپنے حبیب کے واسطے— ایک بار راحیل کو صحت دے— ایک بار—

گرمی کی تپش سے رومال ماتھے پر چپکنے لگتا وہ اسے اٹھائیں آنکھوں سے لگاتیں اور پھر کٹی ہوئی برف کے تسلے میں ڈال دیتیں۔

یادو بالو کا وظیفہ پڑھتے پڑھتے جب امی کا حلق اور زبان کانٹے کی طرح سوکھنے لگی تو بخار نے میدان چھوڑ دیا۔ بخار اتر گیا اور ساتھ ہی نہایت ڈرامائی انداز میں راحیل کی پڑھائی بھی چھوٹ گئی۔ پہلے کالج جانے سے راحیل کی زندگی کا ایک نظام قائم تھا۔ اب وہ نظام تتر بتر ہونے لگا۔ کبھی صبح نماز پڑھنے کا دورہ پڑ جاتا تو ہفتوں تارے کھلے رات ہی میں غسلی نے سے وضو کرنے کا شور آنے لگتا۔ پھر ایک دن نماز پر سے نہ جانے کیوں راحیل کا اعتقاد اٹھ گیا۔ دودھ سے بالائی اترتے ہی راحیل مردوں سے شرط باندھ کر سونے لگی۔ گیا رہ بجے تک نیند کی جاتی پلنگ سے نہ اترتی۔ ناشتہ پڑا پڑا اٹھتا ہو جاتا۔ چائے پر سفید جلی چڑھ آتی۔ لیکن راحیل صلیب کا نشان بنی بازو پھیلائے ٹانگیں جوڑے پلنگ پر اوڑھی پڑی سوتی کھانے پر آتی تو برتنوں میں جھوٹن تک نہ رہنے دیتی اور فاقہ کشی کی دھن سوار ہو جاتی تو کوئی گھنٹہ کمر اور کو پیسے ٹیپ سے ناپ کر رہ جاتی اور اس خوف سے پیٹ میں کچھ نہ ڈالتی کہ کہیں آدھی انجی کمر نہ بڑھ جائے۔

کام کرنے کا بھوت کچھ دنوں سوار رہتا تو جھاڑو پھیرنے سے لے کر برتن مانجنے تک اور غسلی نے دھونے اور بستر بچانے اور لپیٹنے کا سارا کام جنوں کی طرح چھپاک سے کر دیتی پھر آگسی کا دورہ پڑتا تو اپنے منہ کی مکھی اٹانا بھی دو بھر ہو جاتا۔

ایسے دن اور رات قتل کرتے کرتے زمانے کی دھجیاں اڑنے لگیں اور راحیل کی زندگی بے مصرف غیر دلچسپ اور بے معنی نظر آنے لگی۔ ان دنوں اس پر سیلیاں بنانے کا دورہ پڑ گیا سب سے پہلی سہیلی پڑوس میں رہنے والی نور جہاں تھی۔ نور جہاں تھی بھی نور جہاں جن

مٹرک اور جس جگہ سے وہ گزر جاتی تھیں سے جل اٹھتے۔ اسی طرح نوری کے کپڑوں کی تراش خوش اس کی عینکوں میں جڑے ہوئے رنگ بزرگ کے موتی اور سونوار منگل دار والی چال پر سب کی نظر پڑتی تھی۔

راحیل نے نوری سے دوستی میں کپڑوں کے نئے نمونے میک آپ کا جدید طریقہ باتیں کرنے کا نیا فیشن امریکی فلمی اداکاروں سے فلمی دوستی کا ارمان اور ایک نہایت ٹیڈی قسم کے امیر زاوے سے بیاہ کے خواب ادھار مانگ لیے۔

ایسے کئی خیر سگالی وفد نماد و ستانے بنے اور ٹوٹے۔ راحیل جدید کٹ لڑکے میں قدیم قسم کا خلوص چاہتی تھی جب خلوص کو بھی زاویہ قائمہ بننے نہ پایا تو وہ ان روز روز کی دوستوں سے بھی تنگ آ گئی۔ اب رومانی اور جاسوسی ناول پڑھنے کا دور آیا۔ یہ دور بذات خود بڑا پیکون تھا۔ امی جو اس کی طرف سے مشکوک ہو رہی تھیں یکدم پلستر شدہ مٹرک کی طرح ہموار ہو گئیں۔ ان کا خیال تھا کہ لڑکی کے چالے درست نہیں لیکن جب راحیل پہروں کتابوں سے چہرہ اٹھا کر نہ دیکھتی تو وہ پریشان ہونے کے بجائے خدا کا شکر کرتیں کہ ایک بار پھر بچی کے دل میں تعلیم کا ارمان تو اٹھا۔

یہ ان ہی کتابوں کی ورق گردانی کا دور تھا جب زبیر بھائی دنیا کے پانچویں بہترین فوٹو گرافر کو لے کر گھر پہنچے۔

سلیمان صاحب دنیا کے پانچویں بہترین فوٹو گرافر تھے، راحیل اس سے پہلے ایشیا کے بہترین کامیڈی سٹار، اٹامک ریسرچ کے تیسرے بڑے سکالر، افرو ایشیا کے چوتھے بڑے سیاست دان اور فلم انڈسٹری کے کئی نامور ڈائریکٹروں کو مل چکی تھی۔ لیکن نہ جانے وہ کچھ لمحہ قبولیت تھا کہ مٹی ہموار ہو چکی تھی سلیمان صاحب کو دیکھتے ہی راحیل کو یقین آ گیا کہ اگر تصویر کسی کو بنانا آتی ہے تو یقیناً ہی وہ شخص ہوگا۔ عورت جب کسی مرد کی ہنرمندی اور ذہانت سے مرعوب ہوتی ہے تو پھر یوں دھوبی پٹڑا کھا کر چپ ہوتی ہے کہ عمر پھر اٹھنے کی سکت باقی نہیں رہتی۔

پہلی ملاقات کے دوسرے دن راحیل بیٹھی گننا حسینہ پڑھ رہی تھی کہ جھپٹے کے وقت سلیمان صاحب دوبارہ آئے، گھونگھریالے بالوں میں تھوڑی سی گرد تھی۔ چہرے پر ہلکی سی تکان تھی۔ آنکھوں کے ملالی انداز میں تھوڑی سی گھبراہٹ اور چال میں بے یقینی پن۔

راحیل سے سلیمان صاحب نے پوچھا۔ ”زبیر صاحب گھر پر ہیں؟“

راحیل نے آنکھوں ہی آنکھوں میں زبیر بھائی کا پتہ کم بتایا اور اپنا ٹھکانا زیادہ بھجوا دیا۔

”ابھی ابھی شہر گئے ہیں جی۔“

”اگر آپ مانیڈ نہ کریں تو میں تھوڑی دیر ان کا انتظار کر لوں اندر؟“

”جی آجائیے۔ ضرور!“

راحیل نے خوبصورت کادنس والا ڈرائنگ روم کھول دیا۔ گوامادت کو اس گھر سے جدا ہوئے عرصہ ہو چکا تھا۔ لیکن کوٹھی تھی اور اس کمرے کا سارا سامان جدید اور قیمتی تھا۔

”آپ غالباً۔۔۔ راحیل ہیں!“

غالباً کہتے ہوئے سلیمان کے ہونٹ خطرناک سائزش کے ساتھ آپس میں ملے۔

”جی۔“

”آپ نے بی اے نہیں کیا غالباً۔“

پھر ہونٹ اسی وحشت ریز انداز میں ملے۔

”جی۔“

”اور غالباً آپ جی کے سوا اور کوئی لفظ نہیں جانتیں؟“

اس بار راحیل کے لب کھلے مسکراہٹ نے اس کے چہرے کو قند آلود کر دیا وہ شوخی سے

بولی۔ ”اور غالباً کے علاوہ آپ بھی کچھ نہیں جانتے۔؟“

سلیمان شاید پانچواں بہترین فوٹو گرافر تھا کہ نہیں وہ دنیا کا پانچواں فلرٹ ضرور تھا۔ گرگ صورت لڑکی کو یوں گوسپندی صفات کا حامل پایا تو فوراً کندھی بنی لگا۔ محتاط ہو کر

راحیل کا دل چاہا اٹھ کر کہیں بھاگ جائے چھپ جائے کم از کم بھاگ جانا تو اس کے بس کی بات تھی۔ لیکن خدا جانے کیا ہوا کہ نہ تو وہ اٹھ سکی نہ بھاگ سکی اور نہ ہی اس ملاقات کے بعد اس نے سلیمان کو ملنا چھوڑا۔

پورے ماہ بھر بعد زبیر بھائی پر عیاں ہو چکا تھا کہ سلیمان نہ تو دنیا کا بہترین فوٹو گرافر ہے اور نہ ہی ان کا دوست ہے لیکن سلیمان اب گھر کا اس قدر مکمل فرد بن چکا تھا کہ اسے پھلی کے کانٹے کی طرح نکال کر پھینکا ممکن نہ تھا۔ وہ باورچی خانے میں دندناتا جاتا۔ نعمت خانے میں سے سالن اور ڈبے میں سے باسی روٹی نکال کر خود ہی بلا اطلاع کھاتا۔ فرنیچ کھول کر اپنے پسند کی چیزیں نکال کر ہڑپ کرتا۔ امی کی بی بی کو ملیکس دوائی اسے بڑی پسند تھی۔ میٹھے کے بجائے ناریج ملی خوشبو والی اس دوائی کے دو چھپے بی کر اس کے چہرے پر تازگی آ جاتی۔ کچھ تو امی اور زبیر بھائی کی سکیمیں علیحدہ علیحدہ فیل ہو چکی تھیں کچھ امی پانی والے تالاب والے گھر میں برسوں کھانا پکا چکی تھیں ان سب سے سلیمان کی بے تکلفی برداشت نہ ہو سکی۔ زبیر بھائی چونکہ سلیمان کو اپنا جگر کی دوست کہہ چکے تھے اس لیے چندے تو قف کیا اور منہ سے کچھ نہ بولے۔ ادھر سلیمان ڈرائنگ روم بنے رنگتے۔ بیڈ روم۔ بیڈ روم سے سرکٹ لڑکیوں کے کمرے میں اور وہاں سے جہت بھرتا نہ جانے کیسے باورچی خانے کا ساتھی بن گیا۔

یہ بے تکلفی امی کو بُری لگی لیکن زبیر بھائی کے دوست کے خلاف کچھ کہنا اب ان کے نزدیک بے سود تھا۔ اس شخص کو دیکھ کر وہ عموماً کتراتے یا تو غصے سے یا ہمسائے میں کسی کے گھر چلی جاتیں۔ امی چونکہ گھر پر نہ ہوتیں اس لیے سلیمان صاحب کو راحیل کی تصویریں بنانے کا خوب موقع ملتا۔ ان دنوں میں راحیل پوری پوری فلم ایکٹریں کی طرح سبیلی، بھڑکیلی اور طرمدار ہو گئی۔ سارے پکڑ کر تصویریں کھینچواتیں۔ لہنگے میں تصویریں کھینچی۔ موٹر چلاتے۔ موٹر سے اترتے موٹر سے بازو نکالے، ہڈ کھولتے۔ وہیل پر ہاتھ رکھے دروازہ کھولے بند کرتے غرضیکہ سوطور سے توہری فوکس وین کے ساتھ ہی تصویریں بناتی گئیں۔ ٹیڈی لباس، ساڑھی، چوڑی دار پاجامہ۔

مچان پر بیٹھ گیا اور شکار کی پوری نیت باندھ لی۔

”آپ بیٹھیں گی میرے پاس۔ دراصل میں کبھی کمرے میں اکیلا نہیں بیٹھتا۔ نزد س ہو جاتا ہوں یکدم۔“

راحیل نے آراستہ کمرے پر نظر ڈالی اور پھر تعجب سے بولی۔ ”ہمارا گھر آسیب زدہ نہیں ہے سلیمان صاحب۔“

”آسیب زدہ گھر میں تو بیٹھ جاتا ہوں اطمینان سے ایسے گھروں میں نہیں بیٹھ سکتا۔“ اس نے کمرے کی قیمتی چیزوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

راحیل ایک صوفے پر ذرا سی آگے کو ہو کر بیٹھ گئی۔

”جتنی دور آپ بیٹھی ہیں معاف کیجئے اتنی دور سے مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔“ سلیمان چہرے سے عینک اتار کر اسے تپائی کے میز پوش سے صاف کرنے لگا۔

”یہ دور کی عینک اسی لیے لگا رکھی ہے کہ چیز کچھ تو قریب نظر آئیں۔“

راحیل سلیمان سے تین فٹ کے فاصلے پر آ بیٹھی۔

”اب آپ بہت قریب آ گئی ہیں۔ میں ایسی خوشبوؤں کا عادی نہیں۔“

راحیل رومان بھرے افسانے تو بہت پڑھ چکی تھی۔ لیکن ایسے شخص سے اسے پہلی بار سابقہ پڑھا تھا جو اسے بندیا کی طرح بچائے اور اس بچانے میں اسے لطف بھی ملے گا بڑا کر اٹھی اور عین سلیمان کے سامنے ہاکھڑی ہوئی۔ سلیمان نے چشمہ آنکھوں پر لگایا اس سن تمیز کو پہنچی ہوئی غیرت ماہ پر نظر ڈالی اور لقمہ لذت کو خوب جانچ کر بولا۔

”بھئی آپ بیٹھ جاتیے ورنہ میں بیٹھا نہ رہ سکوں گا۔“

راحیل یکدم سلیمان کے پاس قالین پر بیٹھ گئی۔

دو زانو بیٹھی ہوئی گیشا پر سلیمان نے نظریں ڈالیں اور مسکرا کر پوچھا۔ ”ٹیڈی لباس میں شاید اس کے علاوہ نشست کا اور کوئی طریقہ ہی نہ ہو گا۔“

زیوروں کے ساتھ، دلہن کی طرح آداستہ ہاتھ کان سے بچی بال پھیلائے ہیراگن بنے اچھلتی ناچتی مچلتی، روتی بسورتی آہیں بھرتی جتنے بھی راحیل کے پرت سے سب اتار اتار کر سلیمان صاحب نے کاغذوں پر ثبت کر لیے۔ چھوٹی بہنوں کو رام کرنے کے لیے ان کی بھی تصویریں اتریں لیکن نہ تو ان پر ایکٹا کروم برباد کیا گیا نہ قیمتی کاغذ۔ اتنی احتیاط ضرور رکھی کہ رشوت کے طور پر ہر رول میں ان کی بھی پیشی کر لی جاتی۔ راحیل کے پاس ان تصویروں کا اچھا خاصہ خزانہ اکٹھا ہو گیا۔

در اصل راحیل شرمیلی لڑکی تھی لیکن اس کا جی کہتا تھا کہ وہ خوبصورت بھی ہے اور بڑی طرح دار بھی پہلے دن جب سلیمان نے اپنا رولی فلکس کیمرا اس کی جانب کیا تو اس کے کلن کی بوتیں سب گلابی ہو گئیں وہ برآمدے کے ستون کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی تھی۔

”بس بس بس یہیں کھڑی ہو جائیے ایک منٹ کے لیے“

راحیل نے بھاگ جانا چاہا۔ لیکن کچھ ایسی چیز سلیمان کی نظروں میں تھی کہ وہ ستون کے ساتھ پھپک کر رہ گئی۔

”بڑا فوٹو جنیک چہرہ ہے آپ کا۔“

ابھی وہ اوپر دیکھتے بالکل — بڑا فوٹو جنیک چہرہ ہے آپ کا۔“

ابھی وہ اوپر دیکھتے بھی نہ پائی تھی کہ کیمرا سے کھٹ کی سی آواز آئی اور کفر ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد تصویریں کھینچنے کا سلسلہ اس لیے چل نکلا کہ سلیمان کا ایک دوست کمرشل فوٹو گرافر تھا اس کے پاس اپنا ڈارک روم اور امپورٹ کیے ہوئے کاغذ کی جبرداشت تھی سلیمان اس دوست سے کاغذ اور فلم ادھا دلیتا اور اسی سے دھلواتا۔

لیکن تصویریں کھینچنے کا یہ سلسلہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ کیونکہ جو فلم زہیر بجائی بنانے والے تھے اس کے لیے ایشیا کا بہترین فوٹو گرافر مل چکا تھا اور سلیمان صاحب سے مزید رابطہ قائم رکھنا ممکن نہ رہا تھا۔

اس شام بڑی بارش کے بعد اچانک چاند نکل آیا۔ صاف آسمان سے یوں چاند کا

نکلنا تھا کہ سلیمان صاحب کہیں سے آگئے۔ ان کے ماتھے پر تھوڑا سا زخم اور بہت زیادہ مرکب دھوکہ لگی ہوئی تھی۔ وہ عموماً جالی کا دروازہ کھول اندر تک چلے جایا کرتے تھے لیکن آج وہ برآمدے ہی میں رک گئے اور دو تین بار بڑی ہلکی سی گھنٹی بجائی۔

اجی کہیں ہمسائے میں بیمار پڑی ہو گئی ہوئی تھیں۔ راحیل باہر آئی۔ دھلے چاند کی چاندنی سلیمان کے ماتھے پر جگمگا رہی تھی اور آدھی رات برابر زخم بہت کھلا ہوا لگا رہا تھا۔ اس نے پیک کر سلیمان کا سر پکڑ لیا اور جبر جبر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”یہ کیا ہو گیا؟ — یہ چوٹ کیسے آئی ہے؟ — بتائیے ناں؟“

سلیمان نے ستون کے ساتھ سر کو ٹکا لیا اور بڑی ڈرامائی خاموشی قائم رکھی۔

”میں تمہیں آخری بار سلام کرنے آیا ہوں۔“

”آخری بار۔؟“

آنسو کی روانی اور تیز ہو گئی۔

”ہاں — تم سے ملے بغیر میں اس گھر سے جدا نہیں ہو سکتا۔“

”یہ چوٹ کیسے آئی ہے؟“ راحیل نے پھر پوچھا۔ ابھی تک اس کا ذہن اس آخری اوداع کی جانب نہیں آیا تھا اور وہ زخم کے متعلق سوچے جا رہی تھی۔

”بس لگ گئی چوٹ! چوٹیں اچانک لگ جایا کرتی ہیں۔“ سلیمان نے مسکرا کر جواب دیا۔

”بتائیے ناں؟“

”میں تمہیں بتا نہیں سکتا اس لیے تم نہ پوچھو۔“

اب راحیل نے منہ پھیر لیا اور سسک کر بولی۔ ”میں غیر سمجھتے ہیں ورنہ ضرور بتاتے چھوٹے چھوٹے لمسوں کی لمبی سی ڈائری راحیل کے دل میں تیار ہو چکی تھی لیکن جس طرح سلیمان نے اسے پشت کی جانب سے پکڑ کر اپنے لب اس کی گردن پر رکھے۔ یہ ایک نیا دفتر تھا۔ راحیل کے قریب ہی کہیں دمدمہ چلا اور ہزار پونڈ کے بم گرنے کی آواز آئی۔ اس دھماکے میں

اس نے اپنے ہاتھ پاؤں ڈھیٹے چھوڑ دیئے اور سلیمان کے سینے سے لگ گئی۔

سلیمان کی آنکھوں میں چاند کی چمک آنسوؤں کی طرح بھیگی بھیگی نظر آ رہی تھی اور وہ آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔

”زبیر آج مجھ سے خفا ہو گیا۔ میں نے اسے منانا چاہا۔ یہ اس کی آخری نشانی ہے میرے ماتھے پر۔ میں تم سے آخری بار ملنے آیا ہوں۔ میں زبیر کو جان سے مار سکتا تھا۔ جب اس نے مجھ پر گلاس پھینکا میں نے بہت باکسنگ کی ہے زندگی میں میں اسے ایک مکے سے مار سکتا تھا۔ لیکن راحیل زبیر کی آنکھیں تمہاری آنکھیں ہیں۔ اور ان آنکھوں پر میرا ہاتھ نہیں اٹھ سکتا۔“

راحیل کے آنسو اب سلیمان کے کالر اور کندھے پر گر رہے تھے اور وہ محبت میں ہڑ ہڑ کرتی بلی کی طرح کانپ رہی تھی۔

”یہ میرا آخری سلام ہے۔“ زبیر نے راحیل کی مانگ پر لب رکھ کر کہا۔ راحیل لوہے کی مانند مقناطیس کی طرف اٹھتی چلی گئی۔

”سمن آباد میں میرا چھوٹا سا گھر ہے۔ میں اب گلبرگ کی جانب کبھی نہیں آؤں گا۔ بڑے لوگ بڑے گھرے زخم عطا کرتے ہیں۔ بڑے گھرے۔“

جس وقت سلیمان کوٹھی کے پھاٹک سے نکلا آسمان پر ایک بار پھر بادل چھا گئے اور چاندنی یکدم مٹیالی روشنی میں بدل گئی۔

راحیل نے اسی رات اپنا چھوٹا سا سوٹ کیس باندھا۔ سوئی ہوئی ماں پر مہاتما بدھ کی سی نظر ڈالی۔ بہنوں کو سوتے میں بوسہ دیا اور سیلی سٹرک پر آنکلی۔ بارش کے بعد ٹھنڈی ہوا لمبی سنان سٹرک پر آہیں بھرتی چل رہی تھی۔ شاید راحیل کچھ دیر سٹرک پر پھرنے کے بعد گھر

لوٹ آتی لیکن سامنے سے ایک ٹیکسی آکر عین اس کے بائیں ہاتھ دک گئی، ٹیکسی والے نے میٹر گھمایا اور کار کا دروازہ کھول دیا۔

سمن آباد سے باہر جانے والی ایک نئی سٹرک بن رہی تھی۔ رام نام جیتا انجن آباد ہاتھا۔ دوڑی کوئی جا رہی تھی کوئی تار جل رہی تھی۔ لیکن اس کے ذہن میں گلبرگ کو جانے والی راہ پر راستہ بند ہے کا بورڈ نصب تھا۔ کھلا راستہ جس کے دونوں طرف ڈرامے ادا ان ڈراموں میں سُرخ جھنڈیاں بہار کی بسنتی ہوا میں لہرا رہی تھیں۔

راحیل خاموش بیٹھی کھائی کی طرح گہرے اور مگر مچھ کی طرح منہ کھولے اس راستے کی تکیے جا رہی تھی۔ باہر سٹرک بنانے والا انجن دھک دھک دوڑی کوٹ رہا تھا۔ ابھی وہ واپس آنے کے لیے بہت دور نکل گیا تھا نئے سمن آباد کے اس کو اٹر نما بنگلے میں دن پوری آب و تاب سے چڑھ آیا تھا۔ راحیل جالی لگی کھڑکی کی سل میں بیٹھی تھی اس کی آنکھوں میں ساری رات کی نیند بے خواب بیٹھی تھی۔ سامنے چار پائی پرتیل کے چٹا خے لگا سر ہانڈ کھے صرف تہمد باندھے سلیمان اوندھا لیٹا تھا۔

راحیل کے سامنے بار بار گلبرگ کی دھلی دھلائی سٹرک سانپ بن کر لہرا جاتی تھی۔ یہ سٹرک اس کے گھر کو جاتی تھی۔ یہاں اس سے چار فٹ کے فاصلے پر ایک اجنبی چار خانے کی تہمد باندھے اوندھا لیٹا سویا ہوا تھا اس کے سر ہانڈے کرائے کا ٹیل فین جل رہا تھا۔ دو کوکا کولا کی خالی بوتلیں کالرش پر دھری تھیں۔ کھونٹی کے نیچے راحیل کا سوٹ کیس پڑا تھا۔ سلیمان کے تین نپتے تھے۔ سلیمان کی ایک بیوی تھی۔

اور حن اتفاق سے آج وہ سب گھر پر نہیں تھے ساتھ والے کمرے میں دودھ کی شیشی چھوٹے چھوٹے لکڑی کے کھلونے، ٹوٹی پھوٹی کاریں، ننھی منی فراکس دوپٹے باسی لپ سٹیکس بہت کچھ تھا۔

ایک جگہ نہیں تھی تو وہ راحیل کے لیے نہیں تھی۔

راحیل جالی کی کھڑکی میں بیٹھی تھی سامنے انجن آباد ہاتھا۔

اور وہ سمجھ نہ سکتی تھی کہ گلبرگ واپس کیسے جائے؟
اجتی کی طرح پسپا ہو کر۔

زبیر بھائی کی طرح دھونس کے ساتھ
کہ اپنے نصیب کی طرح برگشتہ، ٹھوکریں کھاتی ہوئی گرتی پڑتی۔

حجاب



عامر کو زندگی بھر محبت کا تجربہ نہ ہوا تھا۔

ویسے تو اس کی عمر بھی کچھ اتنی زیادہ نہ تھی۔ ابھی دوہی سال ہوئے اس نے ایم اے
میتھیوٹیکس کیا تھا۔ لیکن کالج میں جہاں مخلوط تعلیم رائج تھی اور جنس مخالف سے
ملنے کے کئی مواقع ملتے تھے۔ وہاں رہ کر بھی عامر کو محبت نہ ہوئی اور اس کے ساتھیوں
نے کئی کئی معرکے لڑے۔ اُس کی ہم جماعتیں دوست بنی رہیں۔ ان سے مقابلہ بھی ٹھنا
رہتا۔ لیکن وہ لڑکیوں کو آسمانی مخلوق نہ سمجھ سکا۔ گھر میں کمزروں کی پوری ایک جوئیر
سینئر بنائیں تھی۔ جو ہر رنگ سائز اور ٹیڈپ میں ملتی تھی۔ شادی بیاہ کے دنوں میں
اس کمزرن جاتی کے حوصلے بھی بہت بلند ہو جاتے تھے اور وہ لڑکوں کو ٹھٹھہ کرنے
ان کی اوٹے اوٹے کرنے میں من حیث القوم مزہ لیتی تھیں۔ لیکن عامر شادی کی
تقریب میں سگریٹ سلگا کر بیٹھ شامیانے والوں کے پاس جا بیٹھتا۔

پھر وہ دوپہے کی کار سجانے کے لئے جاتا۔ دیگ پکانے والے نائیوں کی طرف
رہتا۔ حالانکہ اس کے دوسرے بھائی اور جملہ کمزرن یا لڑکیوں کو چوڑیاں چڑھانے

اور جو بھی اس میں داخل ہو جاتا ہے، متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔
یہ مہندی کی رات کا ذکر ہے۔

پنجلی منزل میں بڑی دھماچو کڑی مچی ہوئی تھی۔ گونگنشن بظاہر عورتوں کا تھا۔ لیکن خاندان کے مرد اور لڑکے سب اسی منزل ہی میں تھے۔ لان میں بتیاں شامیانے لگے تھے۔ گرم اونی چادریں، شفون کے سفید دوپٹے اور سٹے خاندان کی معتر عورتیں موجودہ دور کی بے حیائی اسراف، مذہب سے بے توجہی اور بچوں کی غلط تربیت پر بلا تکان بول رہی تھیں۔ غسٹیاؤں کے آگے سب سے زیادہ رونق تھی۔ جو غسٹیاؤں کے اندر تھیں۔ وہ خوش نصیب تھیں۔ جو باہر تھیں وہ دروازے کھٹکھٹا رہی تھیں، آوازیں دے رہی تھیں۔ کپڑے استری ہو رہے تھے، زیورات کی جانچ پڑتال چل رہی تھی۔ صد پھللا ہوا تھا۔ غیبت ہو رہی تھی۔

بد قسمتی سے اس وقت عامر اوپر والی فلور سے آیا۔
ڈرائینگ روم میں قالین پر چلا دھچکائے آصفہ گھیرا غراہ استری کر رہی تھی۔ اس کی لپشت پر اس کا دو سالہ بچہ اس کے گلے میں بائیں ڈالے لٹک رہا تھا اور آصفہ تابڑ توڑ ایسے نومی کو جو اس کی کوئی بات نہ سمجھتا تھا، جھڑک رہی تھی۔

”اُتر جا نومی کے بچے میں تجھے استری کر دوں گی۔ غراہنے کے ساتھ.... پتہ نہیں تیرا باپ کہاں گیا ہے۔ کبھی کسی شادی بیاہ میں ہی پکڑ لیا کسے اس لاد لے کو.... مت کھنچ میرے بال نومی آؤ کے پٹھے“

اسی وقت عامر نے ڈرائینگ روم کا دروازہ کھول کر باہر کھسک جانا چاہا۔
لیکن آصفہ کی نظر پڑ گئی۔ ”خدا کے لئے عامر اس گدھے سے میری جان چھڑاؤ....“
ساری تیار ہو گئی ہیں۔ مجال ہے یہ نومی حرامی مجھے تیار ہونے دے“

عامر کو بچے کھلانے کی عادت نہ تھی۔ وہ عام نوجوانوں کی طرح چھوٹے بچوں کا

لئے پھرتے یا لڑکیوں کے ساتھ درزی حضرات کی دوکانوں پر پھیرے ڈالتے یا جہاں کہیں دھوکہ کی بج رہی ہوتی وہیں منڈلاتے رہتے۔ عامر نے ہمیشہ ایسے تھکنڈول کو چھپورے پن سے تعبیر کیا اور صدر منڈلی سے علیحدہ وقت گزارنے میں عافیت جانی۔

ایسے ہی کالج میں اس کا حال تھا۔ لڑکا لوگ لڑکیوں کو نوٹس دینے، ان کے لئے لکھنے ان کو بونگ کرنے، کیفے ٹیریا میں کوک وغیرہ پلانے میں لگے رہتے تھے۔ لیکن وہ سب سے الگ تھلگ رہتا اور کچھ اس انداز سے کہ سب میں سے بھی معلوم ہو بالکل جیسے آسمان پر چاند ہم سے پرے بھی ہوتا ہے اور رات کی حدود میں ملا بھی رہتا ہے۔ لڑکیاں اس کے پاس آنے کی کوشش کرتی رہتی تھیں۔ لیکن اس کے اندر کا میٹر ہمیشہ بروقت اطلاع دے دیا کرتا۔

لیکن یہ اس کی چھوٹی بہن زین کی شادی کا واقعہ ہے کہ میٹر نے غلطی کی۔
اُسے پروفیسر کی کمرے پورا سال ہو چکا تھا اور اب وہ اپنے آپ کو بڑا معزز گزٹڈ آفیسر شمار کرتا تھا۔ لوگوں کی درخواستیں ATTEST کر کے خاص کر اُسے بہت راحت حاصل ہوتی تھی۔ نوجوان خوبصورت پروفیسر کا ویسے بھی کالج میں بہت ٹھکا ہوتا ہے۔ کالج میں اس کی ہیر و ورشپ ہوتی۔ فٹ ایئر، سیکنڈ ایئر کے لڑکے اس کی طرح بال بنانے لگے تھے اور اسے اندر ہی اندر اپنی اہمیت کا احساس بھی ہونے لگا تھا کلاسوں میں پیکر دینے کے باعث اس کی زبان کھل گئی تھی اور وہ مباہلے اور مناظرے کر کے لطف حاصل کرنے لگا تھا۔ یہ پہلی مرتبہ تھی۔ جب اس نے اپنے آپ کو جنس مخالف کے لئے بے ضرر سمجھا اور زین کی شادی میں عورتوں کے ڈیجیٹل زون میں چلا گیا۔ عامر کو معلوم نہیں تھا کہ بجلی کی ایک مخصوص فیڈ ہوتی ہے۔ مقناطیس بھی ایک مخصوص علاقے میں اثر کرنے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح استری ذات کی بھی ایک مقناطیسی فیڈ ہوتی ہے

ماشق نہ تھا۔ جس وقت اُس نے آصف کے گلے سے لٹکی ہوئی ٹومی کی بائیں منڈی
کے اُسے اٹھایا تو اڑی پن کی وجہ سے بچہ کی نازک ہانہوں پر ذرا دباؤ پڑ گیا۔
اب ٹومی اُس کی گود میں تو تھا۔ لیکن ہاند اور ٹانگیں اکڑائے ہیٹ کو باہر کی طرف
ٹکائے وہ زار و زار رو رہا تھا۔

”اے میں کیا کروں؟“

”بچے کیا پتہ۔ کم از کم میرے پاس سے لے جاؤ۔“

”لیکن کہاں؟“

”کہیں بچے کیا پتہ۔“ آصف جلدی جلدی پھر نہ استری کرنے لگی اور اس
کی گردلوں سے اسی ملاحظت سے چلنے لگے۔

ٹومی ہانہوں میں جھپٹا جا رہا تھا۔ اکڑا جا رہا تھا۔ یوں جھلکا رہا تھا۔ بیسے
بھڑوں نے کاٹ کھایا ہو۔

”بابا اے منجھالو۔ بچے کیوں دے دیا ہے۔ یہ ڈینس وی مینس؟“
”اس کے باپ کو جا کر پوچھو۔ یہ سارا اسی پر گیا ہے، آصف نے ہاتھ کے
اشارہ سے کہا۔

”یہ میرے ساتھ جاتے ہی؟“

”اسی طرح لے جاؤ جیسے پولیس طالب علموں کو لے جایا کرتے ہے۔“
اس کے باپ کو بھی پتہ چلے پوچھ کر کیا ہو رہا ہے۔ حکومت کی طرف۔

عامر بچے کو لے کر باہر شامیانے میں گیا، تو وہاں چند ایسی عورتیں بیٹھی تھیں
جو عام طور پر شادبوں میں وقت سے پہلے پہنچ جایا کرتی ہیں اور جب گشتن پور
ہوئے ہیں رہتا ہے تو جاتے پر مجبور ہوتی تھیں۔ ان عورتوں کو دیکھ کر عامر شرمایا گیا۔
ٹومی بھی کچھ ڈھیل پڑ گیا تھا ادھاب اس کی ٹانگیں مرنے لگی تھیں۔ جس وقت عامر

اندہا ہر حرف آصف کے شوہر کو تماشہ کر چکا تو اُس نے فیصلہ کیا کہ بچہ آصف
کو لونا دینا چاہیے۔ اب وہ آصف کو تماشہ کرنے لگا تو ہر طرف مذکورہ عورتوں کی طرف
سے ہر طرف تھا۔ لیکن آصف کہیں نہیں تھی۔ سب سے مشکل یہ تھی پڑی تھی کہ ب
تک اتنی میری وجہ سے ٹومی اس سے الگ گیا۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ ٹومی کی
اور لڑکی کی خدمت کے پاس چلا جائے۔ لیکن جناب ٹومی صاحب ہر بار اس کے
گلے میں ہاتھیں ڈال کر اس کی شہینہ می شوڑی کے ساتھ سولہ پینے لگو کسی اور کی
گود میں جاتے سے انکار کر رہا تھا۔

ٹومی کے بوائے جب دسے تو وہ ٹومی کو پوچھتا ہے کہ میں لے گیا کھانا
میں بچے کے ساتھ اُس کو پہنچا رہا تھا۔ ۱۰۔ ۱۰۔ پچھلے دو دو سال
پہلے کانا کا باکسر سہ سالہ تھیں۔ ایک نیا بچہ تھا۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ بچہ اتنی
جلدی گھٹا جاتا ہے اور اتنی آہستہ آہستہ ساتھ دو را آسمان کر سکتا ہے۔ جس وقت
ٹومی بہت کسوٹی پر پہنچا۔ بچہ کی ہڈیوں تک چلے گئے۔ مگر میں بھڑوں کا ہڈ کے
جوانی جہاز پہنچے۔ بچے سے دو گھنٹے میں سے۔ وہی نکل رہی تھی۔ ٹومی اس کے
بستر میں دو جگہ نموت کا تھا۔ اُس نے باہر دو آدمی سے سو رہا تھا اور عامر پٹنگ
سے باہر کرسی پر آگے ٹانگیں پھیلاتے منظر کا کب بستر خالی ہو۔ وہ سوئے۔
بڑی رات گئے پھر تماشہ کرنا آصف آئی۔ آصف عمر میں اُس سے چار سال چھوٹی
تھی۔ لیکن اس وقت وہ بھروسہ کرنے کے بال بچہ لے لے پوری ہے۔ بے لگ رہی تھی
”تو بہت عرصہ کو کر کے مر گئی۔ تم نے میرا بچہ ہی انوار کر دیا۔“
”تمہیں کچھ پروا ہے اس بچے کی؟“

”ہاتھ میری لالی میرا چھونا پانا۔“ اگل کتنا غلام ہے نہ وہ چاہا د
کچھ کھلایا۔ سلاوا یا پکڑنے کے لیے ٹومی کو لے

اب عامر کو باقاعدہ غصہ چڑھ گیا۔

”اور نومی کی ماں کو بڑا پیار ہے نومی سے — یہ غم ماڈرن مائیں ہوناں —

تم لوگوں کی اپنی انجوائے منٹ ختم نہیں ہوتی۔ تم کو کیا پتہ مدر ہڈ کیا ہوتی ہے“

”اور تم نے اتفاق سے ایک شام نومی کو رکھ لیا تو تم کو پتہ چل گیا مدر ہڈ کیا ہوتی ہے“

”کم از کم میں تم جیسا خود غرضی اور سیلف سنٹرڈ نہیں ہوں بالکل بھی“

اب وہ دونوں مامتا پر یوں بحث کرنے لگے جیسے برسوں کا بیاہ جوڑا ہو۔

بڑی بک بک جھک جھک ہوئی۔ اتنی تو تو میں میں کہ نومی جاگ کر رونے لگا۔ اس

بحث میں انہیں پتہ چلا کہ وہ نہ صرف قریبی کزن ہیں، بلکہ بچپن سے ایک دوسرے

کے تمام کمزور پوائنٹ بھی جانتے ہیں۔

لڑتے لڑتے ایک مرتبہ آصف نے یہاں تک کہہ دیا۔ ”پھوپھی جی نے تو سو مرتبہ

ہنٹ کیا کہ میں تم سے شادی کر لوں۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ تم پوسے FREAK

تم سے شادی کون کرے۔؟“

عامر نے زور سے تہقہہ لگا کر کہا۔ ”شادی — تم سے؟ کبھی اپنے آپ کو

شیٹے میں دیکھا ہے۔ دیکھا ہے۔ دیگ ہو پوری دیگ۔ یہ جو تہاڑے دماغ میں

وہم ہیں۔ ان کو نکال دو دل سے۔ دیگ سے کوئی محبت نہیں کرتا“

ایک دم آصف ڈھیلی پڑ گئی اور نومی کو چپ کراتی ہوئی بولی۔ ”ہاں عامر یہ تو

میرا بڑا ویک پوائنٹ ہے سچ میں موٹی تو بہت ہو گئی ہوں۔ شادی کے بعد۔ اس

گدھے نومی کو فید بھی کرتی ہوں پھر بھی وزن کم نہیں ہوتا — بتاؤ کیا کروں —“

اب عامر دن آپ ہو کر ٹھنڈا پڑ گیا۔ اسی لئے اس نے جواب نہ دیا۔

یکدم آصف کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

”سچ عامر کیا کروں وزن کم ہی نہیں ہوتا۔ بہت ڈائٹنگ کرتی ہوں۔ تنویر بھی مجھے پسند نہیں کرتے۔ انہیں دہلی پٹی لڑکیاں پسند ہیں۔ اب اس میں میرا کیا قصو ہے۔ خدا نے مونٹا کرنا تھا کر دیا۔“

اس سے پہلے کوئی نوجوان عورت یا لڑکی اس کے سامنے نہیں روئی تھی۔ عامر کو سمجھ نہ آئی کہ وہ آصف کو کیسے چپ کر لے۔ پتہ نہیں کیوں پہلی بار وہ مجرم محسوس کرنے لگا۔ آصف اور نومی دونوں روتے ہوئے اس کے کمرے سے کیا رخصت ہوئے کہ عمار کی زندگی میں پہلا ہونچال آیا۔ وہ ساری رات بار بار جاگتا اور سوچتا۔ وہ بھی کیا مرد ہے ایک لڑکی کو رلا دیا۔ چاہے یہ لڑکی اب عورت ہی تھی لیکن تھی تو اس کی عمر سے چھوٹی — چلو چھوٹی نہ بھی ہوتی، تو بھی کسی کو رلانا کہاں کی شرافت ہے؟

دوسرے دن جب اس کی آنکھ کھلی تو گیارہ بجے تھے گھر میں ہنگامہ تو تو بہت تھا۔ لیکن آصف اور نومی کہیں نہ تھے۔ انہیں تنویر رات گھر لے گیا تھا۔ عامر میں اگر صبر ہوتا تو وہ شام تک انتظار کرتا اور جب آصف شادی پر آتی تو اس سے بات کرتا۔ لیکن ساری مشکل اس صبر کی ہی تو ہے۔

یایوں سمجھے کہ ساری ارٹین اس بات سے پیدا ہوتی ہے کہ ہمارا اور خدا کا وقت ایک نہیں ہوتا۔ انسان کی ساری مشقت محض اسی وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ ہم صدیوں قرون، بلیک ہول، انی ٹیٹر کا تصور بھی نہیں کر سکتے اور چونکہ خدا ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا، وہ ناپائیداری کو سمجھ تو سکتا ہے۔ لیکن یہ ناپائیداری اس کا حال نہیں۔ خدا انسان سے کہتا ہے کہ تو زمین پر اپنے وقت کے مطابق کچھ عرصہ ستر سال ساٹھ سال تیس سال ایک عمر طبعی کے وقفہ برابر فساد برپا نہ کر۔ نچلا ہو کر بیٹھ رہ پھر میں تجھے اپنے وقت کی سمجھ بوجھ دے کر ایک ایسے باغ میں داخل کر دوں گا جس کے نیچے دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں۔

یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی نٹ کھٹ چونچال غلیل مار پچھتے کو کمرے میں بند کر کے کہا جائے کہ اس صوفے پر آدھ گھنٹہ چپ چاپ بیٹھ کر دکھا، پھر تجھے سارا میزین کے لئے مری لے جائیں گے۔ جہاں ہر دکان پر چاکلیٹ مفت ملتی ہے۔ اگر عامر کے پاس نچلا بیٹھنے کی خداداد گفٹ ہوتی تو اور بات تھی اس نے تو کھٹا کھٹ ڈائریکٹری سے فوڈ ڈیپارٹمنٹ میں تنویر کا نمبر دیکھا اور فون کر دیا۔ کچھ پرانے لوگ فون، کار اور وی سی آر کو نوجوانوں کے حق میں سم قائل سمجھتے ہیں۔ باقی نوجوان نسل کے باسے میں تو اس درجہ وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن عامر کا پٹر اسی فون نے کیا۔

پہلے آصفہ کی ساس نے فون اٹھایا اور لمبی چوڑی انکوائری کی۔

”کون ہے؟“

عامر کو سمجھ نہ آئی کہ کیا کہے۔

”میں جی زریں کا بھائی ہوں! — کزن“

”کمال ہے — کونسے بھائی؟“

”جی عامر — آپ ذرا آصفہ کو بلا دیں زریں کا پیغام دینا ہے — بہت ضروری“

”تم مجھے پیغام دے دو۔ وہ نومی کے پاس کھڑی ہے“

”آپ ذرا پلینر انہیں بلا دیں؟“

”بلا کیا دیں! نومی پوٹی کر رہا ہے — وہ کیسے آسکتی ہے۔ خواہ مخواہ!“

ساس نے دھڑام سے فون بند کر دیا۔

کچھ دیر عامر چپ چاپ فون کے پاس بیٹھا رہا۔ وہ دل میں اندازہ لگا رہا تھا کہ کتنی دیر میں ایک بچہ پوٹی کر سکتا ہے اور ایک ساس کمرے سے نکل کر جاسکتی ہے۔ دوبارہ فون کی گھنٹی بجی تو آصفہ نے فون اٹھایا۔

”ہیلو —“ ٹیلی ویژن کی اناؤنسروں جیسی آواز میں آصفہ نے کہا۔

”ہیلو — میں عامر ہوں — عامر؟“

”کون عامر؟“

”یہ استفسار عجیب ہنک آمیز تھا۔ لیکن عامر نے تفصیل پیش کی — ”زریں کا بھائی — جس کے پاس کل آپ نومی چھوڑ کر گئی تھیں۔ آپ کا کزن بھی ٹوائس ریمورڈ —“

”اچھا اچھا عامر — سناؤ کیا حال ہے۔ پتہ ہے۔ رات کو نومی کو موشن لگ گئے — میں تو اُسے لے کر صبح صبح ڈاکٹر کے پاس گئی — رات کو اُس نے کچھ کھایا جو نہیں تھا“ کچھ نہ کھانے پر موشن لگ جاتے ہیں، اس کی منطق عامر کو سمجھ نہ آئی۔ ادھر آصفہ نے نومی کے دستوں کی داستان شروع کر دی۔ جو کچھ اس نے ڈاکٹر کو بتایا تھا وہ سارا حال عامر کو بتایا اور جب عامر نے یہ سب کچھ سننے سے انکار کیا تو وہ اُسے تفصیل سے وہ سب کچھ بتانے لگی۔ جو ڈاکٹر نے بتایا تھا — فون پر آصفہ سے گفتگو کرنا مشکل تھا۔ یہ تو عامر کو بہت بعد میں سمجھ آئی۔

لیکن اس کے باوجود عامر اور آصفہ فون فرینڈز بن گئے۔

آصفہ کو ایک ایسے دوست کی ضرورت تھی، جو اس کی باتیں سننے کو تیار ہو

اس عہد میں فون نے عورتوں اور لڑکیوں کے لئے ایک بہت بڑی سہولت پیدا کر دی ہے۔ فون بھی اللہ دین کا چراغ ہے ذرا سائبر ملایا اور جن حاضر — اگر مرد و دوس

اتنی مرتبہ ملنے آجائے تو بڑی باتیں پیدا ہوں۔ ملتے ملتے دوست حضرت ہاتھ پکڑنا چاہیں۔ بوسہ بازی کرنے پر آمادہ ہوں۔ دھول دھپہ اور جانے کیا کیا کچھ شافانے کے طور پر سینے سے آگے، جگ ہنسائی کا خدشہ الگ۔ فون میں صاف ستھرا تبادلہ

خیال، کچھ تعریفی جملے، ہلکے ہلکے تہمتے۔۔۔ پھر فون کرنے کا وعدہ۔۔۔ اور چھٹی۔
نہ معاشرے کو اعتراض نہ اپنے ضمیر کو۔۔۔ نہ ہی مرد دوست کی پہل قدمیوں پر
جھگڑے کی گنجائش۔

آصفہ کو بھی قبا حیاتیں نہیں چاہیے تھیں۔۔۔ وہ بھی فقط تبادلہ خیال کی راحت
چاہتی تھی۔ گھر میں اس کی بات سننے والا کوئی نہ تھا۔ اس کی ساس اچھرے میں
ہیڈ مسٹرس تھیں اور شوہر فوڈ کے محکمے میں ملازم۔ دونوں جب اپنے اپنے کام
سے لوٹتے تو انہیں نہ نومی کی باتیں سننے کا شوق ہوتا نہ آصفہ کی بک بک۔ دونوں
اپنے اپنے کپڑے بدل کر کسری کی طرح پلنگوں میں لیٹ جاتے۔ پہلے آصفہ ان کے
اس رویے پر کبھی تھی۔ لیکن اب وہ گیارہ بجے نومی کو سلا کر عامر کو فون کرنے
بیٹھتی تو کھانا بھی فون کے پاس ہی منگوا لیتی اور ایسے ہی شام کے تین بج جاتے۔
عامر کو صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں قسم کی سچویشن بہت
زیادہ متاثر کرتی تھی۔ وہ حجاب درمیان میں حائل رکھ کر رابطے بنانا چاہتا تھا۔
مکمل ننگا پن نہ ہو بلکہ ”سی محفرو“ ہو تو لطف ملتا ہے۔ اس کے اور آصفہ کے
درمیان تو ساس تھی۔ تنویر تھا۔ ٹیلیفون کی لمبی لمبی تاریں تھیں۔ وہ ان حالات
سے اس درجہ مطمئن تھا کہ اسے خبر بھی نہ ہوئی کہ وہ آصفہ کے بہت قریب ہو گیا ہے۔
آصفہ کو فقط ایک ایسا مردانہ کان دکھاتا تھا جوں کی آپ بیتی سرگزشت، دل بھر
کی رام کہانی اور آئندہ کے پلان سن سکے۔ وہ نمبر ملاتے ہی شروع ہو جاتی۔

”صبح میری ساس نے وائلٹ ساڑھی کے ساتھ نانبی رنگ کا بلاؤز پہنا۔
ہائے عامر تم دیکھ لیتے تو ہنستے اوپر سے پھولدار چھتری لگا کر میم صاحب اپنے سکول گئی
میں کیا کھا رہی ہوں۔“ ہجک۔ کل تنویر گجک اور بادام لائے تھے۔
بادام تو کار میں ہی ختم ہو گئے سائے۔ نومی کو تو آیا لے گئی ہے ساتھ والوں

کے گھر۔ وہاں سب اسے بہت پیار کرتے ہیں۔ میں نے دودھ کی بوتل بھی ساتھ
ہی دے دی ہے۔ ہائے کہیں بے چارہ روئے ناں۔ دوپہر کو؟ دوپہر کو میں نے
پکوائے ہیں سری پائے۔ تمہیں نہیں پسند؟ ہمارا خانہ سال بہت اچھے پکاتا
ہے۔ ذریں کا کوئی خط آیا کراچی سے؟ اچھارات کو تم نے فنی فنی دیکھا۔ نہیں دیکھا
ہائے بڑے بور ہو۔ گانا سنو گے۔ کل غلام علی کا لانگ پلے لائے تھے تنویر
لو سنو۔

اور وہ فون پر عامر کو گیت سنانے بیٹھ جاتی!

پتہ نہیں کب فون بازی سے بات بڑھی؟ کب ملاقوں سے بات آگے نکلی؟
کیونکہ آصفہ کو تو خدا نے سنجیدہ ہونے کے لئے بنایا ہی نہ تھا۔ وہ اگر دھاڑیں مار کر
رو رہی ہوتی تو ایک کو کا کولا اور ایک آٹس کون اسے چپ کرانے کے لئے کافی تھی۔
چائینز کھانا کھانے کے بعد وہ بڑی سے بڑی لڑائی بھول جاتی۔ شاہنگ میں آٹھ
گھنٹے گزارتے ہی اس کا بخار اتر جاتا۔ سردرد سے چھٹکارا مل جاتا۔ پکنک کا نام
سن کر وہ ادھ موٹی بھی آٹھ بیٹھتی اور فلم اور وی سی آر کا سن کر تو اس کے اندر
خوشی کے لڈو پھوٹنے لگتے۔

آصفہ دراصل میلہ گھومنی تھی۔ اسے ذمہ داریاں، گھریلو زندگی، شوہر کی
اطاعت، بچے کی نگہداشت، سیلف کی زندگی سے بڑی نفرت تھی۔ اسے پان کھانے
بے ضرر غیبت کرنے اور بے مصرف گھومنے پھرنے سے عشق تھا، اگر وہ کبھی انداز
دگانے کے اہل ہوتی تو تنویر سے کہہ کر عامر میں نہ بھینستی، لیکن فون پر بڑھائے ہوئے
رابطے میں ایک قصور تھا کہ وہ اصلی عامر کو نہ جانتی تھی اور اس کی وجہ بھی صرف اتنی
تھی کہ اس نے کبھی فون پر عامر کو باتیں کرنے ہی نہ دی تھیں۔
جب بھانڈا پھوٹا تو خوب لڑائیاں ہوئیں۔

ہر لڑائی کے بعد عامر آصفہ کو لے کر کون کھلانے لے جاتا۔ اگر تنویر سے ذرا زیادتی ہو جاتی تو پھر فلم بھی دکھانی پڑتی۔ یہ عہد عامر کے لئے بڑا پر لطف رہا۔ آصفہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر روتی رہتی اور عامر اور اس کے درمیان تنویر کا ہلکا سا پردہ قائم رہتا۔

لیکن آصفہ جیسی لڑکیاں یا نو عمر عورتیں بڑی معصومیت سے اپنی ہی جنت تباہ کرنے کی عادی ہوتی ہیں۔ اگر یہ سچویشن جاری رہتی تو آصفہ کو دو آدمی ملتے جلتے۔ ادھر تنویر اور عامر اور اس کا زیادہ وقت کون کھانے، کوکا کولا پینے اور فلیس دیکھنے میں لگتا۔ لیکن اُس نے سارے معاملے میں سے نتیجہ نکالنا چاہا اور نتیجہ نکالنا آصفہ جیسی عورتوں کے بس بات نہیں۔

اسی لئے وہ تنویر سے طلاق لے کر عامر کے گھر آگئی۔

اب آصفہ کوئی مسئلہ نہ تھی۔ عامر اور اس کے درمیان کوئی حجاب نہیں تھا۔ اس لئے عامر اپنی کتابوں کی طرف لوٹ گیا اور اس کا زیادہ وقت لکچر تیار کرنے لڑکوں کی (ASSIGNMENT) چیک کرنے اور امتحانی پرچوں پر نمبر جوڑنے میں لگتا۔ آصفہ اُس کے پاس بیٹھ کر کچھ دیر اپنی ملائی کی برف جماتی رہتی۔ باتوں کا چکر پر چکر۔ گیسٹے پر گیسٹا۔ عامر چپ چاپ نومی کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہتا۔

”تم میری بات نہیں سن رہے۔“

”میں؟“

”ہاں تم اور کون نومی؟“ وہ غصے سے کہتی۔

”میں سن رہا ہوں تم ابھی کہہ رہی تھیں کہ تنویر مجھ سے بہتر تھا۔“

”یہی تو بات ہے تم سن نہیں رہے۔ میں کہہ رہی تھی کہ تنویر تم سے ہزار درجے

گھٹیا تھا۔ لیکن اتنی بات اس میں ضرورت تھی کہ اُسے مجھ سے پیار تھا۔“

”ہاں۔۔۔ وہ تو ہے۔“

”تمہیں مجھ سے پیار نہیں۔“

وہ چپ رہتا۔

عورت کے اس لڑندی رونے کی اُسے آج تک سمجھ نہ آئی۔ پتہ نہیں وہ کونسا ماؤنٹ ایورسٹ روز سر کر کے دکھانا ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے عورت کو مرد کی محبت پر اعتبار آ جاتا ہے۔

”مجھ سے زیادہ تو تمہیں نومی سے پیار ہے؟“

اس موٹی کھال کے ہاتھی میں آصفہ بہت آنکس مارتی۔ لیکن بلبلا نا تو ایک طرف وہ کان کے پنکھے بھی نہ ہلاتا۔

ایسے ہی سات سال گزر گئے اور وہ تین بچوں کی ماں بن گئی۔ اب آصفہ سنڈی پر چکی تھی۔ وہ شعلے بھڑکانے اور عامر کو ان شعلوں میں بھونکنے کی عادی نہ رہی تھی اور جب عامر اسسٹنٹ پروفیسر ہو کر اسلام آباد پولوسٹ ہوا تو آصفہ نے اُس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور لاہور میں اپنی ساس کے پاس ہی رہ گئی۔

عامر بھی خوش تھا کہ اسلام آباد میں کرائے بہت تھے۔

اسلام آباد یونیورسٹی میں پانچ سال پڑھانے کے بعد آصفہ کو ایک خبر ملی۔

پہلے تو آصفہ کو اس خبر پر یقین نہ آیا۔ پھر وہ تحقیق میں لگ گئی اور جب اسے پختہ یقین ہو گیا، تو وہ بلبلا اُسٹی۔ یکدم مردہ آصفہ میں جان پڑ گئی۔ جب چھیڑوں میں عامر گھر آیا تو اُس نے طوفان اٹھالیا۔

”یہ اقبال کون ہے؟“

”اقبال کون؟“ عامر ہر این اتار رہا تھا۔ لیکن یک دم اُس کے ہاتھ رک گئے۔

”مجھ سے کیا چھپاتے ہیں آپ۔ اوپن یونیورسٹی میں جو پڑھاتی ہے۔ کیا میں نہیں جانتی۔!“

”جب آپ جانتی ہیں تو پھر کیوں پوچھتی ہیں؟“

”آپ نے کب نکاح پڑھوایا اس سے“

”یہی کوئی نو مہینے ہوئے ہیں“

عامر کا خیال تھا کہ آصف ہمیشہ کی طرح بہت شور مچائے گی اور پھر ٹھنڈی پڑ جائے گی۔ لیکن آصف کی آنکھوں سے آہستہ آہستہ آنسو گرنے لگے اور وہ بے بس ہو کر قالین پر بیٹھ گئی۔ ”تم نے ٹھیک کیا عامر۔ بھلا دیگ سے کون محبت کرتا ہے۔ تنویر کو بھی دہلی پتلی لڑکیاں پسند تھیں۔ میں دوپہر کو صرف ایک بھدکا کھاتی ہوں، پھر بھی یہ جہنم پھیلتا ہی جاتا ہے۔ تمہارا کوئی قصور نہیں۔ میں نے اقبال کو دیکھا ہے۔ کیا دہلی پتلی ہے۔ تمہارا بھلا کیا قصور؟“

آصف روتی ہوئی کمرے سے رخصت ہو گئی۔ پروفیسر اُسے چپ کرانا چاہتا تھا۔ لیکن اسی وقت اسے سیشن پر جا کر اسلام آباد کے لئے ریل کار پکڑنی تھی۔ دوسری صبح جب اس نے لاہور فون کیا، تو اس کی امی کی آواز آئی۔ ”کون؟“

”میں ہوں امی۔ عامر۔ ذرا آصف کو بلا دیجئے۔“

اوپن یونیورسٹی کی مسز اقبال عامر کو پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔ وہ سائے میں کہتی پھرتی ہے کہ عامر صاحب بالکل بدل گئے ہیں۔ سارا دن فون کے ساتھ لگے رہتے ہیں۔ اِدھر دیکر اینڈ ہوتا ہے اِدھر وہ لاہور چلے جاتے ہیں۔ جب سے اقبال نے عامر صاحب پر جاسوسی شروع کر دی ہے۔ عامر صاحب یکدم زیادہ تندرست اور جوان نظر آنے لگے ہیں۔

سن ہے جب عامر صاحب لاہور آتے ہیں تو آصف کو پان کھلانے، فلم دکھانے

اور کوکا کولا پلانے ضرور لے جاتے ہیں۔ اقبال کا حجاب جب سے درمیان آ گیا ہے۔ عامر صاحب کی ازدواجی زندگی قابل رشک بن گئی ہے۔ ادھر عامر کی والدہ کہتی ہیں کہ ”آصف تو کبھی بڑی ہوئی ہی نہیں۔ اس کی عادتیں تو بچوں کی سی ہیں۔ سارا دن فون پر بیٹھی باتیں کرتی رہتی ہے اور گجک کھاتی رہتی ہے۔ اُسے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ بچے کس کلاس میں پڑھتے ہیں۔!“



گنجھی مار

کچھ کینہ پرور لوگوں کا خیال ہے کہ پروفیسر عجیب صرف سمسٹروں کی وجہ سے مقبول عالم ہوئے کیونکہ وہ طالب علموں کو ہمیشہ زیادہ مہذبیت سے تھے۔ اس لئے سٹوڈنٹ طبقہ ان کا بہت گرویدہ تھا لیکن یہ بات درست نہیں ان کی شہرت کی یہ وجہ مقبول نہیں۔ جب پوسٹ گریجویٹ کلاسوں کے سالانہ امتحان ہوا کرتے تھے تب بھی پروفیسر عجیب سارے کیمپس میں اچھی ہوا رکھتے تھے۔ سٹاف روم کے پروفیسر، بائنگ کے مالی، لیب اسسٹنٹ ان کی تعریف کرتے سنڈیکسٹ کی میٹنگ میں کبھی ان سے کسی کا جھگڑا نہ ہوا۔ دانش پائلٹر کی میز پر مکمل مار کر کسی نے انہیں بات کرتے نہیں دیکھا۔ کیفے ٹیریا میں کسی نے انہیں دیوار کے ساتھ پیالی مار کر توڑتے نہیں پایا۔

پروفیسر صاحب مہاتما بدھ کا نیا ماڈل تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ مہاتما بدھ کپل دستور کا شہزادہ تھا اور ان کے راج پاتھ چھوڑ کر بن باس لے لیا تھا۔ پروفیسر بن باس تھیل کر یہاں شہزادہ بننے کے لئے آئے تھے۔۔۔۔۔ وہی جاپانی رنگت، ہنگول آنکھیں، نیپالی پہرہ۔۔۔۔۔ مانس بھڑی کے لنگڑی مدیکس قد نہ اتنا لمبا کہ کرکٹ کے کھلاڑی لگیں نہ اتنا چھوٹا کہ جوڑو کر لٹے والے اپنا ساتھی سمجھ بیٹھیں۔ عموماً سر دیوں میں چیک کوٹ اور گرے فلائز کی پتلون میں ملبوس نظر آتے پرندے، طالب علم اور دفتری عملہ ان سے بہت مانوس تھا۔

جب تک کسی شخص کی شہرت آپ کی فیلڈ کو مخدوع نہیں کرتی تب تک آپ اس کی شہرت

سے نہ جلتے ہیں نہ خار کھاتے ہیں۔ بلکہ اُس کی شہرت پر مرتبہ نہ نظر ڈال کر محفوظ ہوتے ہیں لیکن جس وقت یہ شہرت کسی طرح آپ کی اپنی شہرت کے لئے باعثِ خطرہ بن جائے تو پھر پروفیسر عجیب جیسا آدمی ڈرا کو لا، مافیا کا خفیہ کارندہ، کمیونسٹ، سود خور اور پتہ نہیں کیا کیا کچھ نظر آنے لگتا ہے۔

پروفیسر صاحب بہت مقبول نام آدمی تھے لیکن ان کی شہرت بے ضرورت تھی اور جہاں پر کمپس سے باہر لاہور آدمی بس کا اڈا ہے وہاں سے آگے نہ جاتی تھی اس پالتو شہرت سے نہ کوئی دانشور نہ کوئی اخبار نویس، نہ کوئی ادیب اور نہ ہی کوئی فلسفہ خائف تھی۔

لیکن پھر پروفیسر عجیب نے ایک کتاب مکھ ڈالی یوں سمجھ لیجئے کہ ان کی بے ضرورت قبولیت اب ایک ننگی ایکڑ کی تار تھی جس میں چار سو چالیس دولٹ کی بجلی گزر رہی تھی خود موصوف کو علم نہ تھا کہ ان کی کتاب جو محض برسوں کے مشاہدے کا پتھر تھی، یکدم دوسروں کے لئے اتنا دردِ سر بن جائے گی جو ان کی کتاب کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ پروفیسر صاحب کے خلاف بھی ایک ردِ عمل کی لہر دوڑنے لگی۔ اس سے پہلے کمپس کا موسم اُن کے لئے نیردنی کا موسم تھا سردیوں میں بھی معتدل، گرمیوں میں بھی خوشگوار۔ لیکن جب کتاب پر تبصرے شائع ہوئے وہ سٹالوں پر بچنے لگی۔ ٹیلی ویژن پر اس کتاب کے بارے میں اُسٹھنے والے شکوکِ دفع کرنے کیلئے ایک تیس منٹ کا خصوصی پروگرام ہوا۔ تو پہلی بار ردِ عمل پیدا ہوا آج تک پروفیسر عجیب قائدِ اعظم کی تصویر کی مانند کی دیواروں پر لٹے تھے۔ اور کسی کو کچھ نہ کہتے تھے لیکن اب صورت حال بدلنے لگی کچھ بدگمان لوگوں کا خیال ہے کہ اس کی ساری وجہ ڈاکٹر توقیر تھے۔

ڈاکٹر توقیر عزم و ہمت کا سہیل تھے مضبوط ٹھوڑی، فراخ ماتھا، سفید رنگت۔ لیکن جیسے ہاتھ پاؤں، چلتے تو بغیر میخوں کے بوٹ بھی کچی مٹی میں گہرے نشانات چھوڑ جاتے۔ آواز میں ولولہ تھا جگا سکتے تھے اور جگائے رکھتے تھے اُن کے ابرو۔ آنکھیں زبان ہاتھ سب بات کر سکتے تھے سوڈو باڈی میں وہ مقبول تو نہ تھے لیکن ان کے رعب اور دبے کے آگے جوں سال لڑکے لڑکیاں

بول نہ سکتے تھے وہ سوئڈیا کو نوک مسائل پر تین کتابیں، پاکستان میں بنک کاری کے روش امکانات پر کئی ہیفٹ، بھڑو در لڈکے سانچے مسائل پر تیرہ سو صفحے کی ایک جامع کتاب اور مغرب کے کئی دیوتاؤں کا قلم بند کر چکے تھے ان کے لکچر نہ صرف مقامی کالجوں کی زینت تھے بلکہ وہ امریکہ میں بھی سفری لکچروں کا سلسلہ بخوبی پنا کر آئے تھے ان کی ذات پر کئی مضمون اندرونی اور بیرونی رسالوں میں چھپ چکے تھے۔ اُن کی سیاسی سوچ بوجھ سے کئی سرگرم پارٹیوں نے جنم دیا تھا۔ ڈاکٹر توقیر اب تک ہمیشہ پروفیسر عجیب کی تعریف کرتے آئے تھے جیسے سفید فام تو ہیں سیاہ لوگوں کے کلچر کی تعریف کیا کرتی تھیں یہ اس وقت تک تھا۔ جب تک پروفیسر عجیب نے ایک کتاب نہیں لکھی تھی اب تک وہ پروفیسر عجیب کو بجلی سے آراستہ مکان میں ایک تیل کا دیا سمجھتے تھے اب تک پروفیسر عجیب کی شہرت ڈاکٹر توقیر کی فیلڈ میں نہ گھسی تھی۔

لیکن کتاب کے مارکیٹ میں آتے ہی صورت حال بدلنے لگی۔

اب لوگ پروفیسر عجیب کو سٹاف روم میں پکڑ کر اُن کے افسانوں پر تبصرہ کرنے لگے آخری سمسٹر کے لڑکے لڑکیاں اُن کی کتاب خرید کر اُسے آؤ گران کرنے لے آئے افسانوں کی زبان اور بیان کے چرچے ہوتے ہی کمپس میں ایک سنہ PET کا افسانہ ہو گیا سب ہی اُن سے جالوز پر دستِ شفقت پھرنے کو تیار تھے۔

آج تک پروفیسر عجیب کے ماضی سے کسی کو دلچسپی نہ رہی تھی۔ اب پتہ نہیں لوگ کیسے اُس کی فیملی بیک گراؤنڈ کے متعلق باتیں کرنے لگے؟ ایک روز جب وہ سٹاف روم میں داخل ہوئے تو دو پروفیسر جن میں ایک ڈاکٹر توقیر تھے آپس میں باتیں کر رہے تھے

HE IS A JOLAHA BY BIRTH

”ارے نہیں“

”میں جانتا ہوں اس کا باپ خاصا بیچنے آیا کرتا تھا۔ ہماری گلی میں ڈھائی روپے گز“

”جولاہا؟ — نہیں نہیں یہ تو ایک سیّد فحلی کو BELONG کرتا ہے“

”ایسی کتنی سید فیلیاں پیدا ہوئی ہیں؟ پاکستان بننے کے بعد۔“

پروفیسر عجیب سٹاف روم میں داخل نہ ہو سکے۔ وہ اپنا بن باس گزار آئے تھے اور شہزادہ بننے کیلئے اس کھلے کیمپس میں رہتے تھے۔ اس لئے وہ چپ چاپ کلاس میں جانے کے بجائے ایک پنج پر بیٹھ گئے پنج کے پاس گڑھل کی جھاڑی میں سرخ سرخ پھول لگے تھے اور ایک پرندہ بے دھرمک ان گڑھل کے پھولوں کا رس چوس رہا تھا۔ لیکن اس روز پروفیسر عجیب کے پاس لمبی چوڑا دالا اس سیاہ پرندے کے لئے آنکھیں نہیں بھینیں۔

وہ برسوں سے اپنے جولاہے باپ اور غریبی کی زندگی سے علیحدہ ہو چکے تھے انہیں تو اب وہ غریبی کوئی پرانی دیکھی ہوئی فلم لگتی تھی جس کے کہیں پر وہ رو دیا کرتے تھے۔ بوڑھی کھانسنے والی مال، کندھے پر کپڑے کا تھان لے کر آنے والا باپ... خدا جانے وہ سب کہاں تھے؟ ان کے ماں باپ؟ ان کی بہنیں؟ اُس کی غریبی؟ جب وہ برکلے گئے اور ایم فل کرنے کے بعد لاہور واپس پہنچے تو ان کا رشتہ اپنے ماضی، اپنے ملک، اپنی زبان... اپنے کلچر سے ٹوٹ چکا تھا۔ اتنے رشتے ٹوٹ جانے کے بعد اپنے رشتہ داروں سے رشتہ توڑ لینے میں انہیں کچھ ایسی دقت محسوس نہ ہوئی۔

پروفیسر عجیب کو نہ اپنے جولاہے ہونے پر رنج ہوا نہ غریبی کا کوئی افسوس ہوا۔ انہیں تو صرف اتنا افسوس ہوا کہ آج تک وہ اپنے آپ کو اتنا بے فرد، اچھا، ہر دلعزیز سمجھتے رہے تھے کہ کسی اور شخص کو ان کے متعلق ایسی باتیں کرنے کی کوئی معقول وجہ ہی ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ یہ نہیں کہ وہ ایسی باتوں کے عادی نہ تھے۔ وہ اس قسم کی گفتگو عموماً سٹاف روم میں سنتے رہتے لیکن یہ بات البتہ انہیں شاک کی طرح لگی کہ لوگ ان کے بھی بچنے اُدھیر سکتے ہیں؟ اب تک انہیں لوگوں پر پورا پورا اعتماد تھا۔

پروفیسر عجیب ایک نارمل صحت مند شخص تھے۔ پہلی بار ان کے عبادے میں چھید ہوا اور وہ اُدھر چڑھنے کی بجائے نیچے کی طرف اُترنے لگے۔ احساس کمتری میں عجب خوبی یہ ہے کہ ہوا کی طرح

نامحسوس طریقے سے داخل ہوتی ہے۔ اور ہوا کی طرح آہستہ آہستہ ہر طرف پھیل جاتی ہے۔ اس سے پہلے پروفیسر عجیب بڑے مرجان مرجان تھے اگر انہیں کوئی لطفیہ سنایا جاتا تو بڑی فراخ دلی اور اُدینے قہقہے کے ساتھ ہنسنے طالب علموں کے ساتھ ان کا سلوک بہت دوستانہ تھا اس میں کبھی فادرنگر کی لمبائی شامل نہ ہوتی نہ ہی وہ طالب علموں کی مدد TIED LOAN کی شکل میں کرتے تھے لیکن اس واقعے کے بعد جیسے وہ اپنی سالمیت کو خود ہی QUESTION کر رہے تھے اب انہیں ان مشوروں پر اعتماد نہ رہا جو وہ فراخ دلی سے کم تجربہ کلرک کے ٹپوں کو دیا کرتے تھے۔ لیکن ابھی ان کے احساس کمتری نے کوئی واضح شکل اختیار نہیں کی تھی یہ محض ایک ہلکے سے DEPRESSION کی حالت تھی۔ وہ بیٹھے بیٹھے چپ ہو جاتے اور پھر دیر تک چپ ہی چلے جاتے۔

پہلے وہ سوچتے بھلا اگر میں غریب تھا تو پھر اس سے کسی اور کو کیا تکلیف پہنچی؟ رفتہ رفتہ ان کا دماغ کہتا کہ غریبی ضرور کوئی بیماری ہوگی یہ غصے ہوئی اور دوسروں کو اپنا آپ محفوظ رکھنے کا خیال آیا لیکن جب DEPRESSION گہرا ہوا جاتا تو وہ خود اس کا شکار ہو جاتے اور سوچنے رستے کہ بھلا میں نے کسی کا کیا لگاڑا تھا؟ جو وہ بیٹھ بیٹھ میچے میرے لئے ایسے خیالات کا اظہار کرتے ہیں؟ ابھی اس واقعے کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ایک اور اچھبے کی بات ہوئی!

انسانی کمزوریوں میں ایک بہت عام سی کمزوری جنس مخالف کے گرداب میں پھنسنا ہے۔ گوام طور پر ہر انسان اس حادثے کو اپنے لئے مخصوص سمجھتا ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ یہ ساخرہ نوع انسانی کا سانحہ نواشتہ ہے۔ بد قسمتی سے پروفیسر عجیب بھی عام گوشت پوست کے بنے ہوئے انسانوں کی طرح تھے اور جس سال وہ نئے نئے ایم فل ہو کر امریکہ سے آئے اُسی سال ان کے ڈیپارٹمنٹ میں ایک موڈ سکوڈ لڑکی بھی داخل ہو گئی ہر سیمسٹر میں اس لڑکی کا گریڈ بڑھنے لگا اور ہر سیمسٹر میں پروفیسر عجیب کا اپنے اُدھر اعتماد کم ہونے لگا۔ یہ عشق قدرے ایب نارمل تھا۔ کیونکہ عظمیٰ کبھی پروفیسر صاحب کے کمرے میں بیٹھ کر باتیں نہ کرتی۔ نہ ہی پروفیسر صاحب اُسکے تعاقب میں رہتے۔ لیکن کلاسوں میں جیسے نئی جان آگئی تھی۔

عظمیٰ بہت تیز بولنے والی کھلی آنکھوں کچھ نہ دیکھنے والی لڑکی تھی جب ایک بار وہ پردیسر سے جھگڑنے لگتی تو بحث کا تمام طول بلد عرض بلد بھول کر وہ صرف اس کی ذات میں مرکوز ہو جاتا۔ پردیسر عجیب نے اس قسم کی لڑکیاں برکے میں تو دیکھی تھیں لیکن خود انہیں لاہور میں ایسی لڑکی کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ پہلے دن عظمیٰ نے پردیسر عجیب کو CORNER کر لیا.....

”سر کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ عورت زیادہ ذہین ہے کہ مرد یا دونوں میں ذہانت کے اعتبار سے برابر ہے۔؟“

پردیسر نے سر کھاتے ہوئے کہا۔ ”اگر جسمانی ساخت کو دیکھا جائے تو مرد کے دماغ کا وزن عموماً ۱۴۹ اونس ہوتا ہے جبکہ عورت کا نارل دماغ صرف ۱۲۴ اونس ہوتا ہے۔“

اب عظمیٰ کی آنکھوں سے سٹیلے جھڑنے لگے۔ ”تو آپ کا کیا خیال ہے۔ کہ دماغ کا زیادہ حجم اس بات کی دلیل ہے کہ زیادہ بھیجے والے کا آئی کیو بھی زیادہ ہوگا۔“

”مزوری نہیں۔“

”پھر آپ نے اس طریقے سے بحث کا آغاز کیوں کیا؟۔ آپ کو بائیولوجی کا سہارا نہیں لینا چاہیے تھا۔“

اب کلاس کے کچھ لڑکے لڑکیاں شرارت سے منسنے لگے اور کوٹ کے اندر بغلوں کے قریب پردیسر عجیب کو پسینہ آنے لگا۔

”اسلامی نقطہ نظر سے۔“

”نونا نونا۔“ عظمیٰ نے دونوں بازو اٹھا کر کہا۔ ”ہم مذہب کے نام پر EXPLOIT ہونے والے نہیں۔ ہم سے کوئی سائنٹیفک EXPRICAL EVIDENCE کی بات کیجئے کیا عورت واقعی مرد کے مقابلے میں ناقص العقل ہے۔؟“

کم از کم جو عظمیٰ اس وقت دھوپ میں کھڑی سنہری بالوں کے ساتھ جگمگا رہی تھی وہ پردیسر عجیب کو ناقص العقل نہیں لگ رہی تھی۔ اور اس دن کے بعد اُس نے پھر کبھی اُسے کبھی بھی مرد کے مقابلے میں

کمتر نہیں سمجھا۔ پردیسر کا عشق ادھورا، بھونڈا اور بالکل پٹری سے اُترا ہوا تھا۔ وہ عظمیٰ کو ملتے نوبالٹے لڑکیوں کی طرح BLUSH کرنے لگتے۔ اُس کی کتابوں میں پھول پریس کر کے رکھ دیتے جس مشاعرے، ہمنامہ، مباحثے، کچلر شویں عظمیٰ جاتی وہاں پردیسر صاحب پہلے سے موجود ہوتے ان کی کوشش ہوتی کہ عظمیٰ کے قریب بیٹھیں۔ اور پردیسر صاحب کے دوران وہ ان کے کان کے قریب مٹھ لاکر فکشن پر تبصرہ کرتی رہے۔

پردیسر عجیب میں چونکہ فطری حیا تھی۔ اس لئے وہ اپنے عشق کی دیوار کو سیدھا نہ استوار کر سکے۔ عظمیٰ کے ساتھ ایک واضح رشتہ بنانا اُن کے بس کی بات نہ تھی۔ ہاں وہ سمیٹروں میں اُسے اسے گریڈ دیتے اور دہولتے رہے اور اُن سے عظمیٰ کی کچھ اتنی تعریفیں سرزد ہوتی رہتیں کہ سارے ڈیپارٹمنٹ بلکہ سارے کمپس میں ایک بڑا جاندار سکینڈل بن گیا۔ پردیسر صاحب چونکہ ہر دلغیر نرختے اِس لئے جو بھی باتیں ہوتیں اُن کی پیٹھی پیچھے ہوتیں۔ یہ تیسرے سمیٹر کا واقعہ ہے کہ ایک دند عظمیٰ اُن کے کمرے میں آئی وہ ایک ایسے گھوڑے کی طرح لگ رہی تھی جو میلوں جھانگتا آیا ہو۔

”پردیسر صاحب آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میرے سارے نمبر دہانتی ہیں؟۔“

”کیا مطلب؟۔“

”میری کلاس کے کچھ لڑکوں نے مجھ پر چارج لگایا ہے کہ اگر آپ نہ ہوتے تو میرا اے گریڈ کمین نہ آتا۔ بتائیے کیا میں اے گریڈ DESERVE نہیں کرتی۔؟“

”بھائی تم لوگ صرف MERIT پر نمبر دیتے ہیں یہ تمہارے کلاس فیلوز کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“

”دیکھئے میرا صرف ایک سمیٹر رہ گیا ہے سر۔ میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔ میری شادی ہو جائے گی۔۔۔۔۔ لیکن آپ کو ابھی بہت لمبی مردی کرنی ہے آپ اسسٹنٹ پردیسر ہوں گے پھر پردیسر ہوں گے۔ آپ کو اپنی REPUTATION کا خیال رکھنا چاہیئے۔۔۔۔۔ اگر آپ اسی طرح بدنام ہوئے لگے تو بہت جلد والدس چانسسز آپ کو یہاں سے نکال دے گا۔“

دیکھتے کوٹوں جیسی آنکھیں پھر کاتی عظمیٰ باہر چلی گئی اور پردیسر صاحب اپنی منگائی میں

کچھ نہ کہہ سکے باقی سب باتیں تو پروفیسر صاحب کے لئے معمولی تھیں لیکن وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اُن کے اور اعلیٰ کے سفر کو ختم ہونے میں صرف ایک سمیٹر باقی ہے اور اس کی عظمت کی کہیں شادی ہو جائے گی؟ انہوں نے کبھی غلطی سے شادی کرنے کے متعلق نہ سوچا تھا۔ بلکہ انہوں نے تو شادی کے متعلق ہی نہ سوچا تھا۔ وہ تو سمجھتے تھے کہ غلطی ہمیشہ کمپیس آتی رہے گی بجائیں کرتی رہے گی پروفیسر دیر پر دن آپ ہا کسے گی۔ یکدم ان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ چونکہ وہ بالکل پکڑیل آدی نہ تھے۔ اس لئے ان سے ایک غلطی اور سرزد ہو گئی.....

یہ غلطی وہ خط تھا جو انہوں نے ساری رات بیٹھ کر لکھا جس میں ایک پروفیسر کی زبان اور بیان کم تھا اور ایک سلی سکول گرل کا انداز زیادہ تھا۔ خط لکھتے میں کوئی قباحت نہ تھی ایسے خط بھی زندگی کے کسی نہ کسی عہد میں لکھا کرتے ہیں۔ لیکن ہر ایوں کہ جب دوسرے روز وہ پڑھا لئے اپنی کلاس میں پہنچے تو بلیک بورڈ کے وسط میں یہی خط ڈرائنگ پنز کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اور ساری کلاس غائب تھی.....

پروفیسر عجیب نے اپنی عینک صاف کی پھر بڑی مشکل سے ڈرائنگ پنز کا لیں خط کو احتیاط سے تہہ کیا اور بیماری کی جھپٹے کے کمپیس سے رخصت ہو گئے..... پھر سارا سمیٹر اُن میں واپس آنے کی جرأت پیدا نہ ہوئی۔ جب وہ واپس لوٹے تو اُن کی گزشتہ مقبولیت نے اُن کا استقبال کیا وہ اندر ہی اندر جو رنجوس کرتے تھے لیکن اُن کے کو لیگز، شاگردوں اور ملنے ملانے والوں نے کبھی اس طرف اشارہ نہیں کیا.....

پھر اتنے سالوں بعد اچانک کہیں سے کسی نے غلطی کا خط فلوٹسٹیٹ کر کے کمپیس کے چنیدہ چنیدہ گرگ زادوں میں تقسیم کر دیا۔ کئی سالوں سے یہ خط پروفیسر عجیب کے براؤن کوٹ کی اندر دھنی جیب میں تہہ کیا ہوا پڑا تھا۔ لیکن نہ تو انہوں نے کبھی اس سوٹ کو پہنا تھا نہ ہی کبھی اندر والی جیب سے اس خط کو نکال کر پڑھا تھا۔ جیسے غلطی بغیر فیئر ویل پارٹی میں شمولیت کے کمپیس سے رخصت ہو گئی تھی۔ ایسے ہی انہوں نے بغیر کسی فیئر ویل کے اس حادثے کو اپنی زندگی سے گزر جانے دیا تھا۔

محبت اتنا بڑا سا خزانہ نہیں جس قدر لوگ اسے اہمیت دیتے ہیں۔ یہ حادثہ اُسی کے لئے اہم ہوتا ہے جو اس سے گزرتا ہے۔ اسی کی مقناطیسی فیلڈ میں یہ کمال ہے کہ عموماً اس فیلڈ میں اگر لوگ شاعری کرنے لگتے ہیں۔ بڑے بڑے افسانے رقم کرتے ہیں اور اسی طرح جو ساخنہ بہت ذاتی انفرادی حیثیت رکھتا ہے بڑی عمومی چیز بن جاتا ہے محبت میں ایک اور کشش بھی ہے۔

کچھ لوگ خود محبت کرنے کے اہل نہیں ہوتے یا اس میدان میں ہچکھاڑ کھانے کے بعد اپنے آپ کو نئے تجربات کے لئے تیار نہیں کر سکتے ایسے لوگ عموماً اپنی تخلیقی قوتوں کو دوسروں کی محبت کو بلیک میل کرنے پر مہم کرتے ہیں۔ انہیں شہر کے تمام اہم سکینڈل، ملاقاتوں کی جھگیں اور نیک معلوم ہوتا ہے کہ فلاں کی محبت کس میں داخل ہو چکی ہے

پتہ نہیں وہ کون شخص تھا جس کو پروفیسر عجیب کی تمام داستان ملج تاریخوں کے معلوم تھی۔ سن تاریخ کو کتنے بچے وہ کس سینما میں غلطی کے پاس بیٹھے؟ کس دن شام کے ہونے کو بچے نہیں اور غلطی کو ریگل سینما سے نکلتے دیکھا گیا۔؟ کس رات پروفیسر کی پہلی نوکسی غلطی کے چپا کے گھر نظر آئی؟ کس ٹیلیفون نمبر پر باتیں کی گئیں؟ اور باتوں کے دوران کن کن ہانکوں پر اٹھار خیال کیا گیا؟ جب کوئی شخص خود محبت کرتا ہے تو وہ ہر گون قطرے کی طرح کشش محبت سے نیچے کی طرف گرتا ہے جب لوگ کسی اور کی محبت میں دلچسپی لیتے ہیں تو فوارے کی بوندوں کی طرح اوپر اُچھلتے اور دور دور تک پھیل جاتے ہیں۔ پہلا احساس آنسو سے مشابہ ہوتا ہے اور دوسرا جذبہ کھلکا ہٹ سے.....

سارے کمپیس میں مسکراہٹیں، زیر لب سرگوشیاں، زہر خند اور ٹوٹلٹ ملانے فضا پیدا ہو گئی جہاں سے پروفیسر عجیب گزرتے لوگ بولتے بولتے چپ ہو جاتے۔ بلیک بورڈوں پر کارٹون بنے نظر آتے کسی میں ایک پروفیسر کمپیس کی لڑکی کے پیچھے بھاگ رہا ہے اس کی جوتی اٹھاٹے ہوئے ہے اُس کے پاؤں پڑ رہا ہے..... ان تمام کارٹونوں کی پروفیسر صاحب سے عجیب مشابہت تھی.....

”جو کچھ آج سنڈکیٹ میں ہوا مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ IT IS NOT DONE

IT IS BELOW THE BELT

پروفیسر عجیب اُن کا منہ دیکھنے لگے۔

یہ پرانا استحصال کا طریقہ ہے مغرب نے صدیوں اپنے ابوالہول اسی طریقہ سے بنوائے۔ ہلاکو چنگیز نے اسی اصول پر رہ کر جنگیں جیتیں۔ انگریزوں نے ہی پالیسی ہتھیار کر برصغیر میں حکومت کی۔ پہلے دشمن کو احساس کمتری میں مبتلا کرو..... اُسے احساسِ دلاؤ کہ وہ کچھ نہیں اور طب وہ واقعتاً اپنے آپ کو کچھ نہ سمجھنے لگے تو پھر اپنی خفوسی و نازشوں سے اس کے دماغ کو بھال کر دو..... کیونکہ اس طرح وہ ہمیشہ اصلی طاقت کا منبع بنتیں سمجھے گا۔

جس وقت انگریز نے برصغیر کو مکمل طور پر محاشی، معاشرتی، ذہنی اور جذباتی طور پر مغلوب کر لیا تو پھر انہوں نے یہاں سکول، ہسپتال، سڑکیں اور رفاه عامہ کے کام شروع کر دیے تاکہ ان کی ہن پسندی انسان دوستی اور غریب نوازی سے برصغیر کے یہ شکستہ لوگ اُنھیں اور ان کی جے جے کار گائیں عموماً ایسے ہی ہوتا ہے کہ جب آدمی دلدل سے نکلتا ہے تو نکلنے والے کا نہ صرف شکریہ ادا ہوتا ہے بلکہ خود بخود اس کے نظریات بھی اپنانے لگتا ہے.....

آپ کمیونس میں ایک نئی تبدیلی آگئی۔

ڈاکٹر عجیب اور پروفیسر توقیر ساتھ ساتھ پائے جانے لگے۔ ڈاکٹر عجیب اپنی کلاسوں میں پروفیسر توقیر کی کتابوں کا حوالہ دینے لگے انہیں اپنی عہد کا سب سے بڑا دانشور تسلیم کرنے لگے اور ان کی سیکھ بصیرت کا ذکر خاص و عام ہونے لگا۔

پروفیسر عجیب از سر نو شگفتہ ہونے لگے اور لوگ پھر اُن کے گرد چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں اکٹھے نظر آنے لگے۔ لیکن اب پروفیسر عجیب اس طاقت کو اپنے سے منسوب نہ کرتے تھے۔ وہ اپنی بات بھی کرتے تو ڈاکٹر توقیر کے گماشتے کی حیثیت سے۔ اس بار جب وہ مقبول ہوئے تو وہ سمجھتے تھے کہ اس میں اُن کی ذات کا کوئی کمال نہیں بلکہ اُس دانشور کی کرامت ہے جس نے اُن کی بٹری چارج کی تھی.....

اب اُنہیں اپنی کتاب اُن کے افسانے اس کا تذکرہ فرمائی گئی تھی۔ وہ تخلیقی عمل کو بہت گھٹیا اور جذباتی فعل شمار کرنے لگے۔ جتنی کہ جب افسانوں کو دوبارہ شائع کرنے کی زبانت آئی تو انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں۔ انشاء اللہ جب میں کوئی بڑی کتاب لکھوں گا تو ضرور شائع کروں گا.....

اس سے پہلے وہ پھولوں، پرندوں اور فزائوں کو دیکھنے کے عادی تھے۔ اب وہ بندو قوں، ہسپتالوں اور سٹین گنوں کی ساخت میں دلچسپی لینے لگے..... پہلے وہ سیاسی نظریوں کو نہ جانتے تھے اب اُن کا ایک بختہ سیاسی اعتقاد تھا۔ اور رفتہ رفتہ وہ سارے کمیونس پر پھر سے مقبول ہو گئے تھے۔ لیکن اس بار اُن کی مقبولیت کی وجہ صرف وہ طاقت تھی جس طاقت کو دنیا کبھی بنا کر دیکھ کر نہیں سمجھتی تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ پروفیسر صاحب دہاتا بدھ کا نیا ماڈل تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ کپل و ستوکا شہزادہ راج پاٹھ چھوڑ کر بن باس کی طرف چلا گیا۔ پروفیسر عجیب اپنا بن باس چھیل کر یہاں شہزادہ بننے کے لئے آئے تھے..... ایسا شہزادہ جس کے لئے دیواروں پر لکھا ہوتا تھا۔ سرگ بر شہزادہ ذی وقار.....“

”مرگ بر شہزادہ دلدل.....“
”مرگ بر شہزادہ والی تبار.....“



بڑا بول

شیشے بڑے پلنگ پر ملانی کہیں اوڑھے چودھرائن آنگن میں پڑی تھی۔ بریتی پردھوپ میں سوکھتے ہوئے مگر مچھ کی طرح اس نے اپنا وجود چھوڑ رکھا تھا۔ لیکن اس کا دل ٹکریں مار رہا تھا ایسے ہی کبھی کبھی شام کے وقت جب کوئی چمگا ڈر کروں کے اندر آجاتی تو بار بار دیواروں سے ٹکرا کر راستہ تلاش کیا کرتی۔ لیکن چودھرائن کو علم تھا کہ اس بار کوئی راستہ کہیں ہے ہی نہیں ملے گا کیا؟ اسے تو آج تک پتہ ہی نہ چلا تھا کہ وہ بھی گوشت پرست کی بنی ہے وہ بھی اندر یا باہر نہ جی ہو سکتی ہے۔ آج تک جو بھی مصیبتیں اس نے دیکھی تھیں ان کا علاج بہت ہی آسانی سے دولت یا پستول نے کر دیا تھا سارا دن گاؤں کی عورتوں سے لدے پھندے آنگن میں بیٹھی کبھی اسے احساس تک نہ ہوا تھا کہ وہ اور دوسری عورتیں ایک جیسی ہیں۔ ان کی مصیبتیں سانبھی ہیں۔ اور وہ انسانی بدی میں برابر کی شریک ہو سکتی ہیں؟ اپنے ساتھ کسی برائی یا بدی کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا ہر فن اس کا ہر قول سچا تھا۔ وہ تو سمجھ بھی نہ سکتی تھی کہ باقی گاؤں والوں کی طرح اس میں یا اس کے خاندان میں کبھی کوئی غرابی پیدا ہوئی تھی یا ہو سکتی تھی! وہ لوگ تو صدیوں سے دولت کے سہارے ایسی بے دارغ زندگی بسر کر رہے تھے کہ انہیں شبہ بھی نہ تھا کہ انسانی دُکھ سادے سانچے ہوتے ہیں اور ان دُکھوں سے پیدا ہونے والی برائیاں ایک ہی کنوئیں کی لٹڈوں سے نکلتی ہیں۔ انسان جب بھی روتا ہے کسی نہ کسی طرح انسانی برادری کے کچھ لوگ کہیں نہ کہیں اور بھی متاثر

ہوتے ہیں۔ اس سانجھی قسمت کا چودھرائیں کو علم نہ تھا! شاید وہ انسانی برادری میں سے اپنے آپ کو نہ سمجھتی تھی!

یوں تو چودھرائں پلنگ پر لیٹی تھی لیکن اس کا دل حویلی کی پچھلی کوٹھڑی کے قفل کے ساتھ لٹکا ہوا تھا اس کوٹھڑی کو اس نے اپنی شادی شدہ حیاتی کے بائیس سالوں میں بمشکل تمام آئین چارونہ دیکھا تھا۔ نانک چندری اینٹوں کی اس پختہ حویلی کے پچھلاڑے ان گنت گودام، انگن، دالان کوٹھڑیاں ایسی تھیں جو بند تہہ خانوں کی طرح مکینوں کے انتظار میں رہتی تھیں۔ جن کی چھتوں سے دیواروں سے فرشوں سے آہستہ آہستہ کلر اور نئی آنسوؤں کی طرح رستہ رستہ پچھلی کوٹھڑی کو آخری بار چودھرائں نے اس روز دیکھا تھا جب ان کا مزارعہ خدائش اپنی فالج کی ماری ہوئی ماں کو چودھرائں کے پاس چھوڑ گیا۔ یہ دیوانی، غموں کی کھائی ہوئی بیوہ کچھ عرصہ پلنگ پر لیٹی چھت کو تنکتی رہی اور پھر اللہ کو پیاری ہو گئی جس وقت خدائش کی ماں نے فخر ویلے دم دیا چودھرائں اپنے میکے گئی ہوئی تھی اس لیے کوٹھڑی میں جھاڑو بہاؤ پھیر کر پھر اس میں قفل ڈال دیا گیا۔ جتنی دیر اماں نذیراں اس میں بیمار پڑی رہی چودھرائں اسے تمام وقت دودھ مکھن روٹی بھجواتی رہی لیکن اسے کبھی اتنی فرصت نہ ملی کہ پچھلی کوٹھڑی میں خود جا کر لوڑھی عورت کا حال دیکھ لیتی۔ کوٹھڑی کے درشن ہوئے بھی تو میکے سے واپسی پر جب اماں نذیراں مر چکی تھی۔

اس کوٹھڑی کی بھی عجب قسمت تھی۔ اس میں جب بھی کوئی آکر ٹھہرا نہ درگاہ ہی ٹھہرا جب بڑے موکھے سے غیر قانونی طور پر آدھی رات کے وقت پانی توڑ کر چودھری صاحب کی زمینوں کو لگا یا جا رہا تھا اور آدھی رات کے وقت پوہ کی ٹھنڈی ہوا میں حیدر کے ہاتھ کستی پر چھوٹے پڑھے تھے اس وقت جب چھاپا پڑا تو حیدر کو کئی دن اسی کوٹھڑی میں بند رہنا پڑا۔ لیکن اس واقعے کا چودھرائں کو علم نہ تھا۔

چودھرائں اور چودھری صاحب کو تو یہ بھی علم نہ تھا کہ مزارعہ رحیم چاچا کا بیٹا جب چک ۱۳۲ میں قتل کر کے مہاگا تو مفرور ہو کر اس نے بھی اسی کوٹھڑی میں دو راتیں کاٹی

تھیں لیکن ایک واقعہ ابھی تک چودھرائں کو یاد تھا۔ جیسے اپنی زندگی میں مائیکے سے پہلی بار ودا سنگی ابھی تک اس کی آنکھوں کے آگے فلم کی طرح چلتی تھی۔

ابھی عصمت چودھرائں کی گود میں تھی۔ شادی کے چوتھے سال جب اللہ نے بیٹی دی تو چودھرائں نے قسم کھائی کہ وہ اسے ہمیشہ با وضو رہ کر دودھ پلائے گی۔ ویسے بھی اس کا خیال تھا کہ بڑے لوگوں کی یہ بچی نشانی ہے کہ وہ کچھ ایسے مشکل کام اپنے ذمے لیتے ہیں جنہیں عام ہما شتا نہ کر سکیں۔ جب وہ وضو کر کے جمہولی میں عصمت ڈالے پھلکاری کی بگل مادر کر دودھ پلانے بیٹھی تو گاؤں کی عورتوں پر دب دہ پڑ جاتا۔ گوہنے کوٹھے میں لتھڑی عورتیں، ننگ و ناموس کی کھیتیاں اجاڑ کر گزرنے والی دیہاتیں، قدم قدم پر اپنے ماحول اور لوگوں سے سمجھوتے کرنے والی سادھارن زنانیاں چودھرائں کو کسی کرشمہ سے کم نہ سمجھتی وہ انہیں اولیاء اللہ لگتی تھی۔

سردیوں کی رات تھی۔

بابر بڑے کھیلانوں میں مونہی کے ڈھیر تھے۔ دن کے وقت چودھری صاحب اور ان کے منشی اپنے جھڑے چادروں کو بڑے کانٹے پر تلو کر بورلیوں میں بند کر داتے دہتے دات کو سلی ان سلی بورلیوں اور منہ کھلے ننگے ڈھیروں پر اوں پرتی رہتی۔ سردی پہلے سے بہت بڑھ گئی تھی۔ رضائی کے اندر بھی چھوٹی عصمت کی ناک برف کی تاش جیسی سرورہتی۔ حویلی کے کواڑ پرانے ضرور تھے۔ چوگاٹیں مضبوط تھیں لیکن پتہ نہیں کن درزوں سے ہوا ستھری ناٹ ستھری کی گولیوں کی طرح آ رہی تھی۔ اتنی سردی کے باوجود چودھرائں نے بڑی چوکی پر بیٹھ کر وضو کیا اور دوشالے میں عصمت کو تھبا کر کے دودھ پلانے لگی۔ شاد ورات رات گئے تک چودھرائں کو دبانے میں مشغول رہتی تھی اس لیے چودھرائں کو احساس نہ ہوا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے وہ پلنگ کی پائنتی کھڑی مہل کے میبلے دوپٹے میں لٹڑے کے سویرے کے تار ادھیر رہی تھی۔

”اب تو جا شادو آج مجھے نہیں دلوانا۔“

شادو کھڑی ہی رہی جیسے آستانوں پر مجذوب کھڑے رہتے ہیں پاؤں پر پاؤں دھر
شادو کا آدھا سر سفید ہو چکا تھا۔ دھرتی کے ساتھ ساتھ رہنے کی وجہ سے اس کا چہرہ
مٹیالا تھا۔ ہاتھ پاؤں سردیوں میں اتنے پھٹ جاتے کہ لہو بہنے لگتا۔ کانوں میں برسوں
پرانی چاندی کی ڈنڈیاں تھیں جو اب شادو کے کان ناک آنکھوں کی طرح اس کے جسم کا حصہ
ہو گئی تھیں۔ آٹھ سال پہلے جب اس کا خاوند مر اسے اس وقت بھی ان ڈنڈیوں کو اتارنے
کا خیال نہ آیا۔ وہ کھاتی پیتی خدمت کرتی غائب رہتی۔ اس کے پاس کہنے کو برسوں سے
کچھ نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں دیکھتی ضرور تھیں لیکن دل تک کوئی شبہ نہ اترتی تھی کوئی
بات وہاں تک پہنچ نہ پاتی تھی۔ وہ کھیتوں کھدیاؤں میں سے چلتی ہوئی یوں نظر آتی جیسے
بوڑھی بھٹکا لگائے ہو گاؤں والوں نے رقم کھا کر شام لات میں چرنے چکنے کے لیے

چھوڑ دیا، سو۔

”جا تو شادو۔ بڑی ٹھنڈ ہے مریں اور ایک گلاس گرم گرم دودھ پی کر جائیں

کاڑھنی میں سے۔“

چودھرائں کو اچھی طرح سے معلوم تھا کہ شادو نے کبھی دودھ مکھن کو ہاتھ نہیں لگایا
پھر بھی وہ اصرار کرتی رہتی۔ جب بھی چودھرائں اسے کوئی اچھی چیز کھانے کو کہتی وہ چیز ضرور لے
لیتی لیکن کبھی کھاتی نہیں تھی۔

”کھڑی کیوں ہے دیکھتی نہیں کتنی ٹھنڈ ہے جا شادو۔ تیری مریاں انتظار کر

رہی ہوگی۔“

”شادو کی آنکھ سے آنسو نکلنا۔ ایک بھوٹا سا مکینہ آنسو۔ مدت کا رکا ہوا پہلا آنسو۔“

”مریاں تو چودھرائں جی۔“ وہ چپ ہو گئی۔

”ادھر آ مرن جوگی۔ کیا ہوا ہے مریاں کو۔“

شادو بلیک کے پاس ٹھنڈے فرش پر بیٹھ گئی۔

”مریاں کو کیا ہونا ہے۔“ آہستہ سے شادو نے کہا۔

شادو تو اچھے وقتوں میں کبھی نہ بولی تھی۔ اب کیا بولتی۔ ایسی روحن تو ازل سے چپ
ہوتی ہیں۔ انہوں نے اپنی سادی ہاتیں سب روز قیامت کے لیے روک رکھی تھیں۔

”پھر بھی کوئی تو بات ہے۔ بتاناں!“

”مریاں کے بچہ ہونے والا ہے۔ پانچواں مہینہ ہے۔!“

”مریاں کے بچہ؟۔ کیسے؟ ہے کبھی ہوا ہے ایسے“

شادو ابھی تک سوئیٹر کے پھونسرے کھینچ رہی تھی شاید جتنے الفاظ اس نے آج تک سیکھے
تھے ان سب کو ملا کر بھی اس کی پتا بیان نہیں کی جاسکتی تھی۔

”مجھے کیا پتہ چودھرائں جی۔ میں تو دن بھر یہاں مری رہتی ہوں پتہ نہیں وہاں کیا
کھے سوا کھاتی ہے۔“

”پھر۔ اب؟۔ اب کیا کریں؟

شادو نے اٹھ کر چودھرائں کے پاؤں پکڑ لیے۔

”بس جی عزت بیج جائے میرے مرے ہوئے یاسین کی۔ دانی بیگاں چار سو

روپیہ مانگتی ہے۔۔۔۔۔ میں روپیہ بھی دے دوں گی شاہنی جی پر۔ یہ کام کرواؤں کہاں

۔۔۔ پر دے کی بات ہے جو آپ اسے حویلی میں رکھ لیں۔ اپنے پاس۔ تو عزت بیج جائے

میری۔“ شادو ہاتھ سینے پر پٹتی ہوئی دیر تک کہتی رہی ہاتھ عزت بیج جائے میری۔ ہاتھ

عزت بیج جائے۔ چودھرائں کو یہ ضرور معلوم تھا کہ غریبوں پر مصیبتیں ٹوٹتی ہیں لیکن یہ کہ

انہیں کوئی عزت وغیرہ کا مسئلہ بھی درپیش ہوتا ہے یہ اس کے لیے نئی بات تھی۔

چودھرائں کو شادو پر دل ہی دل میں بڑی ہنسی آئی۔ بلکہ اسے تعجب ہوا کہ شادو بھی

اپنے آپ کو عزت دار سمجھتی ہے؟ کیا پدی کیا پدی کا شور رہے؟ اگر مریاں نے حوامی بچے کو جنم

دے بھی دیا تو کیا فرق پڑتا ہے!

چودھرائن نے یہ بات کچھ اس خیال سے نہ کی تھی کہ کسی نوجوان نے مریاں کی زندگی برباد کر دی تھی بلکہ چودھراں کا خیال تھا کہ ان کے ہوتے ہوئے وہ کون خود سہرتا جس نے سرحدیں پار کرنے کی کوشش کی تھی؟ بھلا وہ کون تھا جو حویلی کی مہر حاصل کیے بغیر اپنا قانون آپ بنانے لگا تھا۔ رستہ گیری کا حکم حویلی سے ملتا تھا۔ موکھا توڑنے کی اجازت یہاں سے ہوتی تھی گاؤں کی مہو بیٹیاں ان کی ایما پر خرد برد ہوتی تھیں۔ پھر یہ کون تھا؟ جس نے ان سے پوچھا تک نہیں اتنی خوہری؟ اتنی خود رانی؟

”سورہ ہی کھتی؟—

”جی۔“

”تجھے نیند آگئی کمبخت۔ تیرا ستیاناس مارا جاتے تیری ہلکائی ہوتی ماں کی تو پلک نہیں جھپکی سارا دن“

مریاں چپ رہی۔ وہ بھی ماں کی طرح چپ رہنا سیکھ گئی تھی۔

شادو اور چودھرائن دونوں کمرے میں داخل ہو گئیں اور دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ لائین کی روشنی میں سارے کمرے کی شکل آسیب زدہ ہو گئی۔ ڈھیلی پیاد پائی پر کھد کی پھولدار سُرخ رضائی پڑی تھی۔ نیچے ایک پرانی چٹائی پر کپڑوں کی گھٹھڑی تھی جسے شاید مریاں نے سر ہانے کے طور پر بھی استعمال کیا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں گھڑا گھڑے پر چھابہ۔ اور ایک طرف ایک پرانا لوٹا پڑا تھا۔

”کون ہے وہ مرجانا۔ اور ترا کھتر۔“ چودھرائن غرائی

مریاں چپ رہی۔

پورے ہاتھ کا زناٹے دار تھپڑ چودھرائن نے مریاں کے منہ پر ایسے مارا کہ شادو کے دانت بچنے لگے اس نے آج تک مریاں پر کبھی ہاتھ نہ اٹھایا تھا۔ ویسے بھی پوہ کی سردی میں اس کا گھسا پٹا سویرا کافی تھا۔

”کون ہے بتا بول مر۔ پھٹ۔“

مریاں چپ رہی۔ گھنٹہ بھر کی بحث کے بعد منہ کھولا تو اتنا کہا۔ ”وہ اپنے گھر میں راضی خوش ہے چودھرائن جی۔ میں اس کا گھرتباہ نہیں کر سکتی اس کا بھی کیا قصور۔“

”اور تو اپنی ماں کو تباہ کر سکتی ہے۔“

”جو اللہ کی مرضی۔ میں تو کسی کو بھی تباہ نہیں کرنا چاہتی تھی چودھرائن جی۔“

”اچھا ابھی دانی بصری آئے گی۔ صبح تک اللہ نے چاہا تو صفائی ہو جائے گی۔ میں نے

اسے بلا بھیجا ہے۔ اور کان کھول کر سن لے مریاں اب اگر تو نے اس سے کوئی غرض رکھتی تو جان سے مار دوں گی۔“

”نہیں جی۔ وہ خود ہی بہت ڈر گیا ہے۔ وہ کیوں مجھ سے کوئی غرض رکھے گا۔ اس نے آخر گاڈ میں رہنا ہے کہ نہیں۔“

رات بھر چودھرائن جاگتی رہی۔ دل اس کا بھی عورت کا تھا ایسی عورت جو دودھ بھی پلا رہی ہو اپنی رضائی گد اداری سب مریاں کو دی۔ بکھن دودھ شکر بادام سب کا منہ کھول دیا۔ دوسری رات عشاء کی اذان کے بعد شادو بھاگی اندر آئی لیکن چودھرائن کی بڑی نند عصمت کو گود میں لیے بیٹھی تھی شادو کچھ دیر چودھرائن کو بلانے والی نظروں سے دیکھتی رہی پھر چپ چاپ واپس چلی گئی۔

آدھی رات کے قریب بصری دانی نے آکر چودھرائن کو جگایا۔

”پیمچے چلیں شادو کو کچھ ہو گیا ہے۔“

چودھرائن ہڑبڑا کر اٹھی مریاں کو کچھ ہو جانے کے امکان تھے لیکن شادو کی خبر کے لیے وہ تیار نہ تھی۔

”بچے کو ہم نے دالان ہی میں دفن کر دیا تھا۔ لیکن۔“

چودھرائن اور بصری دانی جب پچھلے کمرے میں پہنچیں تو مریاں آخری دم لے رہی تھی۔ کونے میں شادو لوٹے میں ٹھنڈا پانی بھرے اپنے کپڑوں سمیت نہا رہی تھی وہ سر پر لوٹا لے جاتی اور ٹوٹی سے دھاگراتی آہستہ آہستہ پانی اس کی چھاتی پیٹ اور کوہنیوں پر رسنے لگتا۔ چودھرائن نے مشکل سے اس کے ہاتھ سے لوٹا چھینا لیکن مریاں کا سانس اس وقت اکھڑ چکا تھا۔ شادو نے مریاں کی طرف دیکھنا گوارا نہ کیا وہ کچے دالان میں بھاگ گئی اور کوٹھڑی کے آگے آگے چکر لگانے لگی۔ شادو اپنی عزت تو بچا چکی تھی لیکن اب اس کے پاس ایسا کوئی سہارا باقی نہ رہا تھا جس کا ٹھیک لے کر وہ زندگی بسر کرتی۔ وہ سارا سارا دن

دیواروں کے ساتھ ساتھ دالانوں کے اندر گاؤں کے باہر گول گول چکر کاٹنے میں مشغول رہتی۔ جیسے چکر ڈرین شام کے وقت راستہ بھول کر اندروں میں آجاتی ہیں۔ اور ایک دیوار سے دوسری تک چکر لگاتی رہتی ہیں۔ کہتے ہیں جس رات چوری کے گھوڑے پھیلے دالان میں باندھے گئے ان میں سے ایک سفید گھوڑی ساری رات ایسے ہی دالان میں چکر لگاتی رہی تھی اور بادشہ میں کچی مٹی میں اس کے سموں کے نشان پڑ گئے تھے۔

مریاں کے مرنے کے پورے ایک ہفتے بعد مسجد کے پچھوڑے ہرے دروازے والا مکان خالی ہو گیا اس میں جان محمد رہتا تھا۔ اس نے اپنی ساری زمینیں اونے پونے بیچ دیں۔ دارھی رکھ لی اور گاؤں چھوڑ کر چلا گیا جانے سے پہلے اس نے اپنے سارے کپڑے گاؤں والوں میں بانٹ دیئے۔ ٹسرکی چادریں بوسکی کی قمیضیں ملتان کی کھسے۔ جس وقت وہ گڈ پر بیٹھ کر گاؤں سے رخصت ہوا اس کے جسم پر صرف ایک چار خانہ کھیس اور تھم تھی۔ اس کی لاڈلی بیوی نے نیوی بلور قعے کا نقاب اٹھا کر کئی دفعہ اس کی طرف دیکھا لیکن جان محمد نے گلے سے وہ چاندی کا تعویذ بھی اتار پھینکا جو کئی سالوں سے اس کے گلے میں تھا۔

مریاں کے جہانے کے بعد اس کو ٹھڑی میں صرف ایک اور مہمان بٹھرا۔ چودھرائن کو ادھر سے ہول آتا تھا۔ وہ کسی کو پچھلے دالان میں جانے تک نہ دیتی تھی۔ لیکن اسی اکتوبر میں چودھری کا بڑا پیارا کتا اکتوبر کے مہینے میں پاگل ہو گیا۔ چودھری صاحب کتے کو شہر سے لائے تھے لیکن پاگل پن کا ٹیکہ لگوانے میں غفلت ہو گئی۔

سنہرے بالوں والا چھوٹا سا پلا اسے تو رکابی میں سے دودھ بھی پینا نہ آتا تھا۔ عصمت کو تو کتا دیکھتے ہی اس سے عشق ہو گیا۔ سارا دن جھولی میں چھپائے پھرتی۔ چودھرائن لاکھتی — ”دیکھ عصمت تیرے کپڑے ناپاک ہوتے ہیں۔“

”ہونے دیں امی — میں ناپاک ہی اچھی۔“

عصمت نہ صرف لاڈلی تھی۔ بلکہ ایک حد تک چودھرائن اس سے ڈرتی بھی تھی۔ کالج میں

پڑھنے والی لڑکی کا ان پڑھ ماں پر قدرتی رعب ہوتا ہے جیسے دانشور کے بول بانٹ سے معمولی آدمی خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ چودھرائن سب کو ڈانٹ ڈپٹ لیتی تھی۔ حتیٰ کہ چودھری صاحب بھی اس کی آمد پر گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتے لیکن عصمت کے سامنے چودھرائن ایسے پھرتی جیسے دبوکتا مانگوں کے اندر دم دبائے پھرتا ہے۔ آواز بھی چودھرائن کی نرم پڑ جاتی اور اس کا جی چاہتا کہ کم از کم اپنے کھر دے ہاتھ تو کہیں چھپا ڈالے لیکن کے اندر ہاتھ ڈال کر جب وہ بات کرتی تو بات میں زور باقی نہ رہتا ایک بے بسی سے آجاتی۔

کتا دیکھتے دیکھتے شیشے جڑے پلنگ جتنا اونچا ہو گیا۔ عصمت نے اس کا نام جی رکھا تھا مزاح کم کی مین متلی سارے جی کو لیے پھرتے تھے کیونکہ وہ چودھری جی اور عصمت کی گودیوں میں پلا تھا۔ اور جیسے یہ بات بہت اہم ہوتی ہے کہ بچہ کن گودیوں میں پرورش پاتا ہے ایسے ہی اگر مفید جانور بھی بڑے لوگوں کی گودیوں کا مزہ چکھ چکے ہوں تو ان کی اہمیت بڑھ جاتی ہے اور پھر ان سے پاکی پلیدی وابستہ نہیں رہتی۔ گاؤں کے دوسرے کتوں کو وہ پاس بھی بٹھکنے نہیں دیتے تھی۔ جی تو انہیں انسان لگتا جو ساری باتیں چودھری صاحب کو بتانے کا اہل تھا۔

گرمی جاچکی تھی سردی ٹھیک طور پر آئی نہ تھی۔ جس روز بی۔ اے کا امتحان دے کر عصمت گھر آئی اسی رات کا واقعہ ہے کہ جی نے رات کے وقت مزاح کو پنڈلی پر کاٹ کھایا۔ اس سے پہلے جی حویلی میں آنے والوں کو مجوز کا ضرور کرتا تھا۔ لیکن اس نے کبھی کسی پر حملہ نہ کیا تھا مزاح خدا بخش کو تو اسی وقت ہسپتال روانہ کر دیا گیا لیکن خود جی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ پہلے تو چودھری صاحب نے خیال کیا کہ شاید خوفزدہ ہو کر کہیں چھپ رہا ہے لیکن جب پورا دن وہ نہ ملا۔ رکابی میں اس کا راتب اور آنگن میں اس کی سنگلی خالی رہی تو اس کو تلاش کرنے کے لیے کمی لیکن نکلے۔ گاؤں میں یہ بات پھیل گئی کہ چودھری صاحب کا جی پاگل ہو گیا ہے لیکن کوئی اونچی آواز میں یہ بات کرنے جو گا بھی نہ تھا۔ گاؤں والے دو دو تین تین کی ٹکڑیوں میں بڑے بڑے لٹھ لے کر جی کی تلاش کو نکلے تھے۔ حالانکہ عصمت کو یہی بات بُری لگتی تھی۔

”بزدل کہیں کے — کتا ڈھونڈنے جاتے ہیں اور لامٹھیاں ساتھ لے کر جاتے ہیں وہ بچارہ کسی کو کیا کہتا ہے اسی لیے تو ہمارا ملک ترقی نہیں کر سکتا۔ مردوں میں ہمت ہی باقی نہیں رہی۔“

سرکاری سوتے سے لے کر مائی مہاگی کی جھگی تک رات گئے تک لالین لے کر سب تلاش کرتے رہے لیکن جی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ چاند کی آخری راتیں تھیں اور موسم میں ایک خاص قسم کی مستی تھی۔ مالٹے کے درختوں پر کچے مالٹوں پر ہلکا ہلکا غبار مٹی کا چڑھتا تھا۔ اونچے اونچے گتے کے کھیتوں میں رات گئے تک ٹھیری بولتی تھی۔ آسمان بے داغ تھا۔ کہیں کوئی بادل نہ تھا۔ کہیں بارش کے آثار نہ تھے۔

پھر خشک سوتے میں مہاگا ہوا جی رات کے پچھلے پہر بابے سراج نے دیکھا۔ وہ نہ تو رات کو تہجد پڑھتا تھا نہ صبح فجر لیکن ایک عرصہ سے وہ تہجد کے وقت اٹھتا اور یہ گاتا ہوا سوتے کے ساتھ ساتھ چلتا رہتا۔

”جیہڑے ادب نہیں کر دے ماواں دا

منہ کالا بے حیاواں دا

کہو لا اللہ الا اللہ — پڑھو لا اللہ الا اللہ —“

جس وقت گھیر گھا کر جی کو جوہلی میں لائے اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ لیکن بھوک اور جھاگ دوڑ کی وجہ سے وہ نڈھال بھی ہو چکا تھا۔ کسی کئی میں یہ جرات نہ تھی کہ وہ چودھری صاحب کے حکم کے بغیر جی کو گولی مار دیتا اس لیے صبح کے وقت سب نے مل کر جی کو جوہلی کے پچھلے کمرے میں مقفل کر دیا اور اس بات پر خدا کا شکر کیا کہ کسی کو جی نے کاٹا نہیں۔

جس وقت چودھری صاحب صبح کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئے مقفل کمرے میں جی بھونک بھونک کر دیوانہ ہو چکا تھا۔ اُس نے وہ گھڑا توڑ دیا تھا جس سے آخری بار شادو نے نشان کیا۔ چارپائی کے اوپر کھدر کی رضائی بوٹی بوٹی ہو گئی۔ اور خود دروازے اور کھڑکی سے ٹکریں مار مار کر جی

کی سنہری پوستین لہو لہان ہو چکی تھی۔ چودھری صاحب تو شاید خرد بندوق سے جی کو نشانہ بناتے لیکن عصمت شہر کی پٹھی لکھی تھی وہ جی کو مارنے کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ چارپائی پر اوندھے لیٹ کر اس نے رو رو کر آنکھیں سرخ کر لی تھیں۔

چودھراں نے تو پہلے ہی حکم صادر کر دیا تھا کہ بندوق کھڑکی کی سلاخوں میں سے نکال کر جی کا صفایا کر دو لیکن عصمت کی آنکھیں دیکھ کر دوبارہ حکم دینے کیلئے حوصلہ نہ پڑا۔

سارا دن جی کے بھونکنے کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر مغرب کے قریب یہ آواز بالکل بند ہو گئی۔ چودھری صاحب خود کئی بار مقفل کمرے تک گئے اور بند دروازے کی درزوں میں سے دیکھنے کی کوشش کی لیکن اندراتنی چپ چاپ تھی کہ ہر بار وہ دروازے کی چوکھٹ سے لوٹ گئے۔ عصمت کو فونٹ کی پٹھی لکھی فیوڈل لڑکی تھی۔ اس کے ماحول نے اسے ہاٹ ہاؤس کے

بھول کی طرح پالا تھا کالج کی تعلیم نے اس بھول کو رکٹ گلاس کے گلدان میں سجا دیا تھا۔ عصمت کو آرام دہ آسائش بھری زندگی نے بڑا آدمی بنا دیا تھا۔ وہ جانتی ہی نہ تھی کہ جوہلی کے پار یا کالج کی دیوار کے اس پار چوری، بد معاشی، زنا، فریب ہوتا ہے اس کا خیال تھا کہ غریبی اور اس سے متعلقہ تمام جرائم اس لیے ہوتے ہیں کہ حکومتیں ادھر کافی تو جبر نہیں دیتیں۔ وہ گناہ کو انسان سے وابستہ کر ہی نہ سکتی تھی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ دل میں جیسے گندہ اور مٹا ہو ساتھ ساتھ بدہمت ہیں ایسے ہی ہر انسان کے اندر نیکی اور بدی ساتھ ساتھ پٹری کی طرح بچی ہے جس پر بڑے توازن کے ساتھ زندگی کی گاڑی چلتی ہے۔ کچھ اللہ کے نیک بندے نیکی کی پٹری ایسی پختہ بنا لیتے ہیں کہ ان کی گاڑی ایک پہیے پر چلنے لگتی ہے لیکن ایسا ہونا کچھ سہل کام نہیں۔

اتنی آدمی لڑکی کو یہ سمجھ نہ آئی کہ جی کو مارنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس نے پورا دن اور رات جی کو دیواروں سے سروانے کے لیے چھوڑ دیا۔ صبح فجر کے وقت جب مؤذن نے اذان دی تو عصمت دبے پاؤں پھوٹاڑے گئی۔ کہیں بھی کھڑا کاڈر کا نہ تھا۔ پھوٹاڑے انگن میں ابھی تک

سفید گھوڑی کے سموں کے نشان پکی تہی میں دھنسنے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں عصمت کو کیوں یقین تھا کہ اگر جی زندہ ہے اور دیوانہ بھی ہو چکا ہے تب بھی وہ عصمت کو نہیں کاٹے گا۔

عصمت نے بچوں والے جندے میں گول چابی پھرائی۔ تالا کھل گیا۔ تو وہ مانتا سے بھری آواز میں جی جی پکارتی دیوانہ وار کو کھڑکی کے اندر داخل ہوئی۔ لالٹین کے باوجود کھوڑی دیر تک اسے اندھیرے میں کچھ نظر نہ آیا پھر اچانک اس نے دیکھا سلاخوں والی کھڑکی کے عین نیچے وہ اونڈھا پڑا تھا۔ اس کے تختوں سے خون بہہ بہہ کر دو تک جم گیا تھا اور اس کی خوبصورت آنکھیں نیم وا تھیں عصمت بے خوف جی کے پاس جا بیٹھی۔ اس نے جی کا سر اپنے زانو پر رکھا اور اپنے شفون کے دوپٹے سے اس کے چہرے کو صاف کرنے لگی۔ پتہ نہیں کیوں اسے کو نوٹ کی انگریزی، سکول کی اردو اور گھر کی پنجابی بھول گئی اور وہ اپنی دادی کے ریاستی لہجے میں بولنے لگی ”مر وین شہدے۔“ علاج نہ کر سکرے ہن ایس عزیز دا۔“ جب دن چڑھے چودھرائں اسے ڈھونڈتی ہوئی ادھر آئی تو وہ ابھی جی کے آدھے دھڑ کو گو د میں لیے ہوئے ہوا اپنی دادی کے لہجے میں ہن کر رہی تھی جب چودھرائں منت سماجت کر کے عصمت کو ساتھ اندر لے گئی تو اسے ایسے ہلہلا کر بخار چڑھا کہ کئی ہفتے علاج کراتے رہے پھر آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے چودھری صاحب خود عصمت کو کراچی لے گئے۔

جی کے پاگل ہونے کے بعد عصمت کو گاؤں سے حویلی سے پتہ نہیں کیوں ڈرانے لگا تھا۔ بیٹھے بیٹھے وہ ماں سے پوچھتی۔ ”اماں میں پاگل تو نہیں ہو جاؤں گی؟“ چودھرائں پہلے پہلے تو اسے لاڈ سمجھتی رہی پھر اس نے چودھری صاحب سے بات کی کہ عصمت شہدی کو شہر بھیج دیں جب تک اس کی شادی کا بندوبست ٹھیک طور پر نہیں ہوتا اگر یہ اپنے چچا شیر محمد کے گھر رہے تو اچھا ہے۔ ایم۔ اے میں داخلہ دلوانا چاہیں تو دلوا دیں لیکن پڑھی لکھی کا گاؤں میں یوں ڈولتے پھرنا اچھا نہیں۔

عصمت کچھ عرصہ چچا شیر محمد کے پاس رہی پھر اس نے ایم۔ اے میں داخلہ لے لیا اور ماں

باپ کی اجازت کے بغیر نیورسٹی کے ہاسٹل میں شفٹ کر گئی۔ چودھری صاحب جلد از جلد بیٹی کو نکاح میں دینا چاہتے تھے لیکن جوں جوں عصمت کی تعلیم بڑھ رہی تھی ماں باپ کا حوصلہ اس کے سامنے کم ہو رہا تھا۔ اب وہ کئی باتیں انہیں بتاتے بغیر کر لیتی انہیں پتہ بھی چلتا لیکن وہ درگزر کرتے۔ وہ اس کے علاوہ اور کچھ بھی کیا سکتے تھے؟ عمر کے ایسے حصے میں داخل ہو چکے تھے جب اندر باہر آدمی ڈھیلا پڑنے لگتا ہے۔

شادی تو عصمت کی بڑی آسانی سے ہو سکتی تھی کیوں کہ وہ عین مین چودھرائں کی جوانی کا نقشہ تھا۔ چودھری اور چودھرائں اس کے لیے کسی نسلی گھوڑے کی تلاش میں تھے کسی کے سم میں نقص نہ لگتا کسی کی ایال درست نہ نکلتی کوئی دل کی چال میں فیل تھا کوئی پو پائیں۔ عصمت کی ذاتی جائیداد کا یہ عالم تھا کہ شہری اور دیہاتی جائیداد اور دولت دس خاندانوں کو دیساں زندگی گزارنے کی کفیل ہو سکتی تھی۔ لیکن سب سے بڑی مشکل یہی درپیش تھی کہ کہیں لالچی چالاک فریبی لوگ عصمت کو محض اس کی دولت کی خاطر بیاہ کر نہ لے جائیں۔

عصمت نے فقط وقت کٹی کے لیے ایم۔ اے میں داخلہ لیا تھا۔ لیکن ایم۔ اے فائنل میں پہنچ گئی اور کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ لمبے ستواں ناک سانولی رنگت خوبصورت ہونٹوں والی لڑکی کو برن مل سرکا پھر جب وہ امتحان دے کر گھر لوٹی تو ہر وقت کھوئی کھوئی رہنے لگی۔ ابھی تک ماں باپ عربی نسل کا گھوڑا تلاش کرنے میں سرگرداں تھے کسی کا خاندان گھٹیا تھا تو کسی کی جائیداد معقول نہ تھی یہ اڑچیں تو تھیں ہی لیکن اب سب سے بڑی پھلانگ یہ تیار ہونی کہ لڑکا پڑھا لکھا ہی ہو کیونکہ لڑکی ایم۔ اے کا امتحان دے چکی تھی ادھر عصمت چپ کے دور اس نے بڑھاتی جا رہی تھی ماں بیٹی میں واجبی سی بول چال رہ گئی تھی۔ ماں اسے بلاتی ڈرتی کیونکہ عصمت اگر انگریزی میں جواب دے دیتی تو پھر چودھرائں کو بات آگے بڑھانے کے لیے مشکل درپیش ہوتی گاؤں کے معاملات میں عصمت کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ سارا دن اپنے کمرے میں بھاری بھدی پردے برابر کیے بیڈ لیمپ جلاتے ایسے ناول پڑھتی رہتی جو شہر سے وہ اپنے ساتھ لاتی تھی۔ ان رسالوں سے جھپٹی ہوتی

کی چمک سٹی۔

”منگنی ٹھیک ہے ماں مجھے منگنی پر تو کوئی اعتراض نہیں۔“

”لیکن اگر لڑکے کو پتہ چل گیا۔“

”وہ اتنے برس امریکہ رہا ہے وہاں ایسی باتوں کا کوئی نوٹس نہیں لیتا آپ فکر نہ کریں؟“

”تو..... تو..... تو اس شہدے کے ساتھ نہیں کر سکتی تھی جب اتنا بڑا قدم اٹھا ہی

لیا تھا تو اللہ رسول کے حکم کی پابندی ہو جاتی؟“

عصمت نے منہ پھیر کر آہستہ سے کہا ”اس کی سہلی نہیں ہے اماں۔ وہ شادی نہیں کروا سکتا۔“

”ہائے میرے اللہ تو نے تو ہمیں دو کوڑی کا نہ چھوڑا عصمت..... جو پھر بھی کو پتہ چلا تو کیا

وہ منگنی رہنے دیں گی؟“

”آپ مجھے ایک بار اعجاز سے ملنے دیں وہ منگنی نہیں توڑیں گے..... آپ فکر نہ کریں۔“

پتہ نہیں کیوں چودھرائن منٹے میں آگئی اس نے ایک زناٹے دار پورے ہاتھ کا تھپڑ
عصمت کے منہ پر مارا اور چلائی ”بول کون ہے وہ کجنت..... بول بتا۔ تیری جرات کیسے ہوئی
تجھے ہمت کیسے پڑی۔“

چودھرائن کے سامنے اس کی ساس کھڑی تھی عصمت ویسے ہی ڈانگ کی ڈانگ کھڑی
رہی نہ اس کا چہرہ بدلانا تھپڑ کے کوئی آثار اس کے چہرے پر آئے۔ وہ انگریزی اور دو اور پنجابی
اچھی طرح جانتی تھی لیکن پتہ نہیں کیوں ایسے لمحوں میں وہ اپنی دادی کی زبان بولنے لگتی۔
”کدی توں کسے شہدے نال پیار ناں کیتا آئی اماں تیکو کی پتہ۔ اپنا آپ دار نا
کی ہندا آئی۔“

چودھرائن کی اپنی بولی یہ نہ تھی۔ وہ اپنی ساس کو سامنے کھڑا پا کر خاموش ہو گئی۔ بڑی دیر
کے بعد بولی۔

”تجھے پتہ نہیں تھا کہ تیرے باپ کا اونچا شملہ ہے اور وہ کس راجہ، پلے کو پال نہیں سکتا۔“

تو وہ ٹیک پر ڈسکو میوزک سننے میں مشغول ہو جاتی۔ اس سے پہلے اسے غزلیں سننے کا شوق تھا
اور اس کی ماں کو غزلوں کو سمجھتی نہیں تھی لیکن وہ موسیقار کی آوازوں کے سحر میں ضرور گم ہو
جاتی تھی اس نئی موسیقی کی لے چال سے تو چودھرائن بالکل ناواقف تھی۔ اس کے علاوہ چودھرائن
کو رفتہ رفتہ احساس ہونے لگا کہ پڑھی لکھی لڑکی اس کی صحبت میں فوراً اچاٹ ہو جاتی ہے اور
پڑھتے پڑھتے اٹھ کر الماریاں ٹھیک کرنے، اپنے بال برش کرنے، خط لکھنے میں مشغول ہو جاتی
ہے۔ اسی لیے چودھرائن نے عصمت کے کمرے میں آنا جانا قریب قریب چھوڑ دیا تھا۔ پھر سب سے
بڑی اور اکلوتی وجہ یہ بھی تھی کہ چودھرائن اپنے اود بیٹی کے طور طریقوں میں کوئی مماثلت نہ پاتی
تھی۔ عصمت چھری کے ساتھ تھوڑا سا مکھن ٹوسٹ پر لگانے کے بعد سارا دن مکھن کی شکل
نہ دیکھتی۔ چودھرائن بل دار پڑھے کو بھی مکھن کے ساتھ کھانے کی عادی تھی عصمت کے لیے کوک
کے کریٹ شہر سے آتے تھے چودھرائن ان بوتلوں کو دوا سمجھتی تھی۔ پہناوا بھی عصمت کا چودھرائن
کو عجیب لگتا نہ ڈھنگ کی جوتی نہ حساب کا دوپٹہ نہ شرع سے ڈرنے والی قمیض۔ رفتہ رفتہ عصمت
اود چودھرائن دو الگ الگ کیمپوں میں بٹ گئیں۔

لیکن جس روز عصمت کا اصل دل پسند ڈولہا تلاش کر لیا گیا اور منگنی کی رسم ادا ہو گئی اس
رات بڑے زور کا گڑا برس۔ ہزار تلاش کے بعد چودھری صاحب کی پھوپھی کا بیٹا ملا تقایہ سپوت
برسوں سے امریکہ میں تھا۔ اور ایم بی اے کرنے کے بعد وہیں ملازم ہو گیا تھا اچانک اس کی واپسی
سے چودھرائن کا مسہلے ہو گیا۔ یہ منگنی کی رات کا واقعہ ہے جب خاندانی زیورات کے ساتھ ساتھ
نئے ہیروں کے سیٹ عصمت کے پلنگ پر بے جوڑ پڑے تھے کہ چودھرائن کو عصمت نے بڑے
سادہ الفاظ میں بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔

”تو پھر تو منگنی پر کیوں مانی۔ بد بخت میں ان سب کو۔ میں چودھری جی کو کیا منہ
دکھاؤں گی؟“

عصمت کے جسم پر ابھی منگنی کا جوڑا تھا۔ اور اس کے چہرے پر کئی دنوں کے بعد لپ شگ

عصمت ویسے ہی گھڑی تھی، کندہوں پر سُرخ پھلکاری اوڑھے — ہونٹوں پر باسی لب شگ
جھائے اس کی آنکھوں کے دیئے بڑے روشن تھے جیسے وہ زندگی سے ہر قسم کی آس لگائے ہو۔ اسے
چہرے سے ذرا سی بھی شگستگی ظاہر نہ تھی۔

”میرا تو خیال تھا اس گھر میں اتنے گھوڑے، اتنے کتے، اتنی بھینسیں پل رہی ہیں میرا بھی بچہ
پل جائے گا۔ ایک اور لاوارث سے کیا فرق پڑتا ہے؟“ عصمت نے جملہ مکمل نہ کیا۔
پچھلا کمرہ خود بڑی رازداری کے ساتھ رات کے پچھلے پہر چودھراؤں نے تیار کیا، اور دیری
دائی کے آنے سے گھنٹہ بھر پہلے عصمت کو وہاں منتقل کر دیا گیا۔

جس وقت عصمت اور بھری نے اندر سے دروازہ بند کیا اور چودھراؤں نے باہر تالا ڈالا۔
اس کے بعد جیسے چودھراؤں پر شادو کی روح طاری ہو گئی۔ وہ کچے آنکھوں میں گول گول چکر کاٹنے
لگی اس کے ہونٹوں پر ایک ہی دُعا تھی — ”یا اللہ میں تجھ سے ایک ہی دُعا مانگتی ہوں میری عزت
بچ جائے۔“

یہ پچھلا آنکھوں بالکل کچا تھا، لیکن موسموں نے اس کی کچی مٹی کو مضبوط اور پکا کر دیا تھا
اس پر ایک سفید گھوڑی کے سموں کے گہرے نشان تھے۔ ان نشانوں میں اونچے نیچے پاؤں
دھرتی دونوں ہاتھ کبھی آسمان کی طرف اٹھاتی کبھی سینے پر مارتی چودھراؤں ایک ہی دُعا
مانگتے جا رہے تھے۔

کہتے ہیں دُعا مانگنے کا سلیقہ بھی کسی کسی کو ہوتا ہے۔

سننے میں جب عصمت کو ہنسا دھلا کر میت کی چار پائی پر ڈالا۔ تو چودھراؤں پچھلے آنکھوں میں
پرانے گھوڑے سے کپڑوں سمیٹ نہانے میں مصروف تھی! پتہ نہیں کب چودھری صاحب اسے
اپنے کہیں کی بکلی میں لپیٹ کر اندر لائے اور کب ان کی عصمت ہمیشہ کے لیے حویلی سے
رخصت ہو گئی؟۔ لیکن کہتے ہیں کہ اس روز ایسی بادش ہوئی ایسی بادش ہوئی کہ پچھلے آنکھوں
سے پرانے سموں کے تمام نشان ہمیشہ کے لیے صاف ہو گئے۔

مشک نافہ

پہلے آسمان پر مسکراہٹ برابر بدلی آئی پھر موسلا دھار قہقہے برسنے لگے۔
یونہی بد رنگ سی بدلی۔ پھر خدا جانے کیسے وہ نیچے اترتی چلی آئی اور آتے آتے گھنگھو
گھنگھو بن کر یوں چھا جوں برسی کہ گھروالے تار پر سے گیلے کپڑے نہ اُتار سکے۔ بدلی کی طرف کسی
نے نگاہ اٹھا کر نہ دیکھی اور جب وہ دل بادل بن کر گرجی تو اندر باہر سب بھوار کی زد میں آ گئے۔
جس وقت آمنہ چھوٹا سا سوٹ کیس لے کر کاد کی پھلی سیٹ سے اترتی تو یوں لگا۔ شہوت
ن باریک چھڑی کو کسی نے چکی کا پاٹ باندھ دیا ہے۔ وہ ساری کی ساری کھلائی ہوئی مچھائی
ہوئی بغیر پانی کے گھاس ایسی مژمڑہ تھی۔ صرف اُس کے کوہے چار بچوں کی ماں جیسے پلے ہوئے
تھے۔ باقی سب کچھ راشن پر۔ بولتے وقت اس کا رنگ فنی ہو جانا۔ بیٹھتی تو ہرز اوپے سے
اس کے کوہے اُسے نظروں کے سامنے رکھتے۔ آمنہ میں وہ کچھ نہ تھا۔ جس سے خوبصورت
موتیں بنتی ہیں، لیکن اس میں شاید وہ سب کچھ تھا جو اُسے یادگار عورت بنا سکتے تھے۔
مگر ہاتھیوں اور چیونٹیوں کا تھا۔ کبھی ہاتھیوں کے پاؤں تلے چیونٹیوں کا بمون آ جانا۔ کبھی



کھسار چوٹی ریگتے ریگتے ہاتھی کی سونڈ میں پہنچ جاتی۔ تین منزلوں میں بسا ہوا کنبہ اولیٰ بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والا گلشن دیکھتے ہی دیکھتے اُجڑے ہوئے مندر کی طرح ہو گیا جس میں رات کے سہ چمکادیں اُٹھیں لگی ہوں۔ ہوا ٹوٹے پٹ بجاتی ہو اور طاق سے گزرنے والی ہوائیں سیٹیاں سنائی دیں۔

یہ بڑی ماں کا پر وار تھا۔ بیٹے بیٹیاں، بھانجے بھتیجے، بہنیں، نندیں، بھابیوں، دیورائیاں، جھٹھائیاں سب اس گھر میں آنے جانے والے ہوا کے جھونکے تھے۔ چھوٹے بڑے لمبے کھلے منہ بند سانس بند۔ صبا، نسیم، شمیم آندھی، طوفان، بھکڑوں کے ننھے ننھے بھتیجے،

بڑی ماں باہر و لگن میں تخت پوش پر بیٹھی اندہا ہر خالی خالی نظروں سے دیکھتی اور سوچتی یہ کس کا گھر کا ہے؟ میں یہاں کیوں پوکیدار سے کو بیٹھی ہوئی ہوں؟ تخت پوش سے اندوہ کمرہ نظر آتا تھا۔ جہاں وہ شادی کی رات پہلی بار اُترتی تھی۔ وہ بڑا پلنگ جس پر چل چل کر پٹیاں پکڑ پکڑ کر اس نے سات بچے جنمے تھے۔ وہ سات بچے کہاں تھے؟ اتنا دوزخ اُٹھانے کے بعد لٹنے برسوں انہیں پالنے پوسنے کے بعد وہ سلسلے کے سلسلے کہاں گئے؟ بچپن کو اُس نے ہاتھوں بیاہ دیا۔ بیسے اسی گھر میں ہے، پہاڑ او جھل نہ ہوئے پر آنکھ او جھل ضرور ہو گئے۔

یہ سب کچھ کیا تھا؟ وہ کہاں سے آئی تھی۔ اُسے کہاں جانا تھا؟ اس کے ساتھ کون تھا؟ اس کے ساتھ کبھی کوئی تھا بھی کہ نہیں؟ ساری عمر اس نے اپنے شوہر کی بڑی سیوا کی۔ باورچی بنی، جھاڑو بہاؤ، سینا کترنا..... لیکن شوہر کے دل کی کوئی کھڑکی کھلی لے دے کے جب کبھی کوئی ناکام عشق ہو چکنا تو کچھ وقفے کے لئے وہ دم دلا سا دینے والا اس کے قریب ہو جاتی۔ شوہر کے ساتھ اُس کا تعلق ایسا تھا جیسے بہت بھوک لگنے پر کوئلہ دال روٹی بھی رعیت سے کھالے۔

عمر کے بوجھ سے ٹوٹے ہوئے تناور درخت کو دیکھ کر وہ سوچتی۔ یہ غزل سے کرنے والا، پھولوں کو مالش کرانے وقت ہائے ہائے کرنے والا یہ بڈھا آدمی کون ہے؟ ساری زندگی لٹتے بڑے خاندان کا بوجھ اُٹھانے والا یہ بدنصیب کون تھا؟ وہ اُٹھ کر اس کے پاس جانا چاہتی، لیکن بڑھاپے نے خود اس کی کمر توڑ دی تھی۔ ساری عمر رنگ رنگ کے اندھے شیشے اُن کے درمیان ہے اب بڑھاپا آخری دوری بن کر اُن کے درمیان پھیل گیا تھا۔ یہ سارا کارخانہ! — یہ گھر کی چکی جس کا ایک پاٹ وہ خود اور دوسرا پاٹ وہ بدنصیب تھا۔ یہ چکی کب سے چل رہی تھی جسے کوئی کمری کا جالا ہوا میں ڈولتا پھرے اسی طرح اُس کا دل سارے گھر میں بے مصرف ہلکوسے لیتا کسی کو نے میں چپک جانے کی اب اُس میں ہمت باقی نہ رہی تھی، کیونکہ دل بھی اُس کے جسم کی طرح بے ہمتا ہو گیا تھا۔

اُس کا کونسا گھر تھا، وہ مائیکہ چور سسرال کس کے پاس آئی تھی؟ وہ اُن باتوں کو سنتا چاہتی تھی۔ جو اُس سے پرے کی جاتی تھیں اور اُن سے غافل رہتی تھی جو اس کے سامنے ہوتی تھیں۔ وہ کون تھی۔ وہ کس کا تھی؟ کس کی امان تھی؟ ٹوٹے پر والی کبوتری کی طرح وہ سارا دن آنگن سے برآمدے، برآمدے سے کمرے تک اپنی ہی تلاش میں گھومتی رہی۔ پھر آسمان پر ایک چھوٹی سی بدلی چھا گئی۔ بالکل پیسہ برابر۔ یہ بدلی آمنہ تھی۔

آمنہ کے آنے کے پورے دو مہینے بعد ماں جی کے دونوں بڑے بیٹوں میں بول چال بند ہو گئی۔ آمنہ کیوٹیکس لگانے کے لئے ہمیشہ اوپر جانے والی آخری میٹر جی پر بیٹھ جاتی تھی۔ اس طرح اُس کی پشت دیوار کے ساتھ اور اُس کے کولہے میٹر جی سے آدھے اترے ہوئے نظر آتے۔ جلیل کا کمرہ تیسری منزل پر تھا۔ جب آمنہ پرانی کیوٹیکس ادھیڑنے اور نئی پالش جانے کے لئے ننھے ننھے روٹی کے چھاپے۔ میٹر جیوں پر بیٹھتی تو کوئی بار جلیل کو اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر جانا پڑتا۔

”معاف کیجئے۔“

سیڑھیاں اترتے ہوئے جلیل کو کہنا ہوتا۔

آمنہ اپنے زرد زرد سے سڈول پاؤں پیچھے کر لیتی۔ اور کھڑے زانو سے موافق کے فاصلے پر جلیل دم بخود اتر جاتا یا چڑھتا چلا جاتا۔

قدیر بچلے کروں میں رہتا تھا، لیکن آمنہ جب کیوٹیکس لگانے بیٹھتی اُسے دوسری منزل میں کئی کام یاد آجاتے۔ وہ بھی عینک کو درست کرتا بغلوں کی تیز خوشبو پھوڑتا۔ چپ چاپ اُوپر نیچے آتا رہتا۔ آمنہ کے پاس سے گزرتے ہوئے غلط بھر کو اس کے نتھنے رونے والے ہو جاتے اور پھر وہ FASTING BUDHA کی طرح کہیں اندر غائب ہو جاتا۔

قدیر اور جلیل کے تعاقب میں اُن کی بیویاں یوں رہتیں جیسے دن کے پیچھے رات لگی رہتی ہے۔ وہ اپنے شوہروں کی زندگی میں چائنہ تو نہیں کر سکیں تھیں ہاں انہیں اس بات کا اچھی طرح سے احساس دلا دیا تھا کہ زندگی جیل سے کم نہیں، ایسی جیل جس سے چھوٹ کر کبھی کوئی آدمی گھر نہیں جاتا۔ شوہر عرقید اور بیویاں عمر پھرے کے لئے آپس میں جڑ گئے تھے۔ پہلے جلیل کی بیوی نے بڑی ماں سے شکایت کی ”بڑی ماں آپ آمنہ کو ہوسٹل میں کیوں نہیں بھیج دیتیں۔ دیکھیں ناں کتنے جوان لڑکے ہیں۔ لڑکی کی آخر بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔“

جلیل کی بیوی کو یہ فکر تو نہ تھا کہ جوان لڑکے لڑکیوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ البتہ اُسے جلیل کی طرف سے ایک دھڑکا پیدا ہو گیا تھا۔ جلیل اب دفتر سے لوٹ کر سیدھا پلنگ پر لیٹ جاتا۔ پھر شام گئے جب وہ اٹھتا تو اس کا چہرہ تروتازہ لگنے کے بجائے اور بھی تھکا تھکا بے جان نظر آتا۔

”آپ کسی ڈاکٹر کو دکھائیں جی آپ کی صحت ٹھیک نہیں ہے۔“

”بس دفتر میں کام زیادہ ہے۔“

کسی سیر تفریح پر جلیل کا دل مائل نہ ہوتا۔ بس جب وہ میڑھیوں پر بیٹھی آمنہ کو دیکھ لیتا تو تھوڑی دیر کے لئے اُس کے نتھنے خوشی سے پھیل جاتے۔

دوسری شکایت قدیر کی بیوی نے کی۔

”بڑی ماں۔ اس کو ہمارا گھر پسند نہیں ہے آپ اسے اصرار سے یہاں نہ رکھیں ہوسٹل جانے دیں۔“

”بڑی ماں تڑپ کر بولیں۔“ ہائے سب میری بھانجی کے خلاف ہو گئے ہیں۔ اتنا سادہ پروار بستا ہے۔ یہاں ایک مسکین بے گھر لڑکی کو سہارا نہیں مل سکتا۔ اُس کے لئے دو روٹیوں کا کال ہے اس گھر میں۔“

”دیکھ لیں آپ ماں جی۔“

”کیا دیکھ لوں! بتاؤ میرا اپنا ہے کون میرے بیٹے کا ایک فرد اس گھر میں آکر رہا ہے اور سب کے کان کھڑے ہو گئے ہیں ملتے برسوں کے بعد مجھے اتنی اجازت بھی نہیں؟“ ہائے ماں جی کیسی باتیں کرتی ہیں آپ۔“ قدیر کی بیوی روہانسی ہو کر بولی۔

”بے چاری کا ہے کون اس دُنیا میں باپ بیچارہ شیدا مر گیا۔ ماں دائم المریض۔ کچھ پڑھ لکھ کر کمانے جوگی ہو جائے گی تو ماں کا بوجھ بھی اٹھالے گی۔“

”جی اللہ کرے نیک نصیب ہوں کوئی اچھا برل جائے اپنے گھر کی ہو جائے۔“ قدیر کی بیوی خوفزدہ ہو کر بولی اُسے بڑی فکر تھی کہ آمنہ اپنے گھر کی ہوئے۔

”اللہ کرے۔ اللہ کرے پر کیا پڑا ہے شادی میں۔ بچے پر بچہ جننے جوانی گند جانے گی اور بچے پر تپہ کھوتے بڑھاپا آجائے گا کیا پڑا ہے شادی میں۔ اپنا کمانے کھانے موم سے رہے۔“

”آپ ایسی باتیں اُس کے دماغ میں نہ ڈال دینا ماں جی۔ ہمارے ملک میں بھلا گزارہ ہوتا ہے مرد کے بغیر۔“

”ایکلی عورت کو مو بہت —“ بڑی ماں نے آنگن میں نظریں پھرا کر کہا۔

یہ سب کیا تھا؟ اتنی گہما گہمی کے باوجود اتنی اُداسی کیوں تھی۔ دن کے وقت بھی اندھیرا سا کیوں چھایا رہتا تھا؟ اندھیرا بھی ایسا جس میں سب کچھ نظر آتا، لیکن کچھ ایسے کہ پتہ نہ چلتا کوئی چیز کیا ہے؟ وہ یہاں کیوں چوکیدار سے کو بیٹھی تھی؟ اس کا اپنا گھر کہاں تھا؟ گھر جانے کے لئے کوئی گھر مری کو نسا وقت مقرر تھا؟ جن دنوں وہ جوان تھی اور اکیللی تھی تو کیسے اُسے ہر موڑ پر سب بیگانے ہو کر ملتے تھے اور اب وہ بھرے پُرے پر وار میں ٹوٹی کرسی کی ٹانگ جیسی بیکار پڑی تھی۔ کسی طرف سے اپنے پن کی خوشبو نہ آتھی تھی۔ ہر کمرے میں ہر کرسی میں ہر پیر مٹی پر اپنے بیگانہ وار بیٹھے تھے۔

پتہ نہیں اندر ہی اندر کچھ تھا بھی کہ نہیں ہو سکتا ہے کہ قدیر کی بیوی کے دسو سے بے بنیاد نہ ہوں — بظاہر گھر کی سطح جھیل کے پانیوں کی طرح پُر سکون تھی۔ صرف اب قدیر اپنی بیوی کی ہر بات پر نکتہ چینی کرنے لگا تھا۔

”یہ آج کیا پکا یا ہے“

”کھالی تو رہی“

”صبح کا سالن ہوگا“

”نہیں جی ابھی پکا یا ہے سالن شام کو“

”فریج میں رکھ دیا ہوگا۔ ہے نا۔“

”نہیں تو جی“

قدیر کی بیوی دبی رہتی۔ اُسے اب قدیر سے بات کرتے ہوئے خوف سا آتا تھا۔ وہ سارا دن اسی خوف میں بڑے بڑے وہموں میں اس درجہ الجھی رہتی کہ کئی کام آپ سے آپ غلط بھی ہونے لگتے۔ پھر ان غلط کاموں پر ٹھیک کا پردہ ڈالنے کے لئے مزید کئی غلطیاں ہوتیں کئی اور جھوٹ بولنے پڑتے۔

”میرا پا جامہ دھو دیا تھا“

قدیر کی بیوی کا رنگ فنی ہو جاتا۔ وہ ہاں اور نہیں کے درمیان لٹکی رہ جاتی۔

”وہ جی میں دھونے لگی تھی پر ڈاکیا آگیا اُسی وقت رجسٹری لے کر۔ اوپر سے آبا جی

نے شور مچا رکھا تھا کہ کوئی INDEX مل دو میرے گھسنے پر“

”یعنی کہ پا جامہ نہیں دھلا“

”میں جی بتا رہی ہوں کہ —“

”مجھے EXPLANATION نہیں چاہیے۔ سیدھا سا سوال ہے پا جامہ دھلا ہے کہ نہیں“

”نہیں جی —“ عادی مجرم کی طرح قدیر کی بیوی کی گردن ڈھلک جاتی۔ پھر وہ دل

ہی دل میں اپنے آپ کو نوکر وڑگالیاں دیتی، ٹھیک ہی تو ہے جو مجھ سے یوں کہنے بہتے

ہیں کوئی کام اُن کا مجھ سے ہوتا بھی ہے ڈھنگ سے سلیبی تو میری ماں نے تربیت کی ہے میری

شادی کا علم سکھاتے نہیں اور شادی پکڑ کے کر دیتے ہیں یہ قصائی ماں باپ۔ وہ پلنگ

پر اوندھی لیٹ کر کتنی کتنی دیر خود رچی میں مبتلا ہو کر روتی رہتی۔

خدا جانے آمنہ کے ساتھ جلیل اور قدیر کا کچھ تعلق بھی تھا کہ نہیں خدا جانے یہ شور و غل

صرف ان کی سائیکی میں پُج رہا تھا۔ دراصل بات صرف اتنی تھی کہ ایک نئی لڑکی گھر میں آئی

ہوئی تھی۔ پھر ایک روز بڑے زور کا دھماکا ہوا — سب کھانا کھا رہے تھے کہ جلیل اور

قدیر سنی سی بحث کرتے کرتے مینڈھوں کی طرح الجھ گئے۔

پہلے سن سینسٹھ کی جنگ پر بحث ہوئی۔ آمنہ کے آنے سے پہلے جلیل اور قدیر ہم خیال

تھے کہ سن سینسٹھ کی جنگ میں پاکستانی بے جگری سے لڑے اور اُن کا جذبہ قابلِ قدر تھا۔

اب اُن دونوں میں جانے کیا خیر لگ چکا تھا کہ دودھ علیحدہ اور پانی الگ ہو کر ایک دوسرے

کو گھور رہا تھا۔

”یہ مسلمان قوم کا جذبہ ہے بھائی جی سترہ دن تو چلتا ہے سترہ سال نہیں چلتا“

قدیر نے اپنی بہادری کا قاتل رہا تھا نہ اپنے جذبے کا۔ اُسے تو سرے سے مسلمان قوم پر سے ہی اعتبار جاتا رہا تھا۔

”مسلمان ہمیشہ مصیبت پرٹنے پر متحد ہو جاتا ہے۔ بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا“

آمنہ جلیل سے ایک کرسی چھوڑ کر بیٹھی ہوئی تھی اور ہر بار ڈش اٹھا کر جلیل کی طرف بڑھا دیتی تھی۔

”مسلمان کا CALIBRE تباہ کن حد تک بگڑ چکا ہے۔ اس کی MORAL VALUES نہیں رہیں اس کی EMOTIONAL IDENTITY ختم ہو چکی ہے بھائی جی۔ مشکل یہ ہے کہ ابھی تک ہم اپنا تشخص نہیں کر سکے ہیں یہ معلوم نہیں کہ پاکستان کیوں بنا؟ اس کی بقا کیوں ضروری ہے؟“

”تمہیں معلوم نہیں۔ باقی سب کو معلوم ہے“ شان سے جلیل نے آمنہ کی طرف دیکھ کر کہا اور وہ ان اپ ہو گیا۔ جلیل اور قدیر کی بیویاں کھانا بہت آہستہ آہستہ کھا رہی تھیں۔ ان کے نوالے ان کے حلق میں پھنسنے لگے تھے۔

آمنہ ہاتھ دھونے کے لئے اٹھی تو بحث نرم پڑ گئی۔ وہ واپس آئی تو سن ۱۹۴۷ کی جنگ کا ذکر ہو رہا تھا۔

اس جنگ کے بعد دونوں بھائی متفقہ طور پر اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ جنگ ۱۹۴۷ء دراصل بیرونی ممالک کی خود غرض ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر لڑی گئی۔ اس جنگ کو لڑنے، جتانے اور ہمارے لئے ایسی بے شرمی کا باعث بنانے کے لئے نہ ہماری ذاتی کوتاہیاں، نہ ہندوستان کی اسلام دشمنی، نہ بنگالی زبردستی کافی تھی، اس جنگ کو اتنے بڑے المیے میں تبدیل کرنے والے چند بڑے ملک تھے۔

واپسی پر آمنہ کے ہاتھوں میں آم کی بھری ہوئی پلیٹ تھی جو اُس نے قدیر کے سامنے

رکھ دی اور خود بھی قدیر کے پاس والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ جونہی اُس نے پہلا آم کاٹ کر قدیر کو پیش کیا جلیل کے نظریوں میں تپش آ گئی۔

”کسی حرام زادے ملک کی جرأت ہے کہ ویت نام کے مسئلوں میں دخل دے، کسی ماں کے خصم بڑے ملک کی مجال ہے کہ چین کے معاملات میں دخل دے۔ ایک لے دے کے ہم ہی ایسے نامرد رہ گئے ہیں کہ ہر بڑا ملک جو چاہتا ہے۔ ہمارے ساتھ کرتا ہے“ اس کے بعد انہوں نے دو تین بڑی ثقہ قسم کی گالیاں اپنے آپ کو اور پاکستانیوں کو دیں۔ جلیل کی بیوی ڈرتے ڈرتے کھانسی۔

قدیر اب آم کی گٹھلی مڑے لے لے کر چوس رہا تھا۔ اُس نے کنکھیوں سے ایک بار آمنہ کی کیونٹس لگی انگلیاں دیکھیں اور پھر شیر ہو گیا۔

”کیا بات کر رہے ہیں آپ بھائی جی۔ پاکستانیوں نے کوئی ظلم نہیں کئے۔ بلکہ دیش میں یہ سب فائدہ پر لیس کے کرشمے ہیں۔ جو صدیوں سے اسلام دشمن ہے۔ اسلام دشمنی میں تو آپ کو پتہ ہے کہ عیسائی اور یہودی تک یحجان ہو جاتے ہیں پھر وہ ہندوؤں کے ہنر بان کیوں نہ ہوں گے“

اب جلیل پر سٹل سطح پر آ گئے۔

”تمہاری کھوپڑی چھوٹی ہے اس لئے تم ہر مسئلے کو چھوٹی دوربین سے دیکھتے ہو! تم میں باتوں کی تہہ کو پہنچنے کی صداقت نہیں ہے“

”معاف کیجئے ضروری نہیں کہ ہر تربوز کے اندر دس بھی میٹھا ہو“

قدیر چھوٹا تھا۔ عمر میں، قد میں، تعلیم میں۔ لیکن آمنہ کے سامنے یوں کتر بیونت کرواتے ہوئے بڑی شرم آ گئی۔

”مسلمان خود نکمے، کاہل، وقت کی ضرورتوں کو نہ سمجھنے والے ہیں۔ ذرا ان کو دولت میسر آ جائے۔ کبھی یہ ہسپتال نہیں بناتے۔ کبھی کوئی لائبریری تعمیر نہیں کرتے۔ کسی یتیم خانے

کسی دفاہی کام کے لئے ان کی دولت نہیں ہے۔ یہ تو ذرا ادھر دولت گھر میں آئی، ادھر دوسری شادی کا سوچیں گے۔ زانی، عیاش — آوارہ —“ قدیر چلاتا۔

قدیر کی بیوی کے اندر ٹھنڈ پڑ گئی۔ کم از کم قدیر دوسری بیوی کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ جلیل کو یہ تیر نہ ہر میں بچھا ہوا لگا، کیونکہ کچھلے ہی دنوں اُسے دس ہزار کا بونس ملا تھا۔ ”آپ کو خدا دولت دے گا تو آپ بھی یہی کچھ کریں گے جہائی جی — آپ بھی مسلمان ہیں۔ آپ بھی زانی ہوں گے۔ عیاش نہیں گے اور آوارہ کہلائیں گے۔“

اب جلیل نے آم سے بھرے چھکوں کی پلیٹ پورے زور سے قدیر کی جانب چلا دی۔ کمرے میں سناٹا بچا گیا۔ پلیٹ دیوار سے ٹکرائی اور دونوں بیویاں جلدی سے بھاگ کر کچیاں اور پھلکے جمع کرنے میں مشغول ہو گئیں۔

بڑی ماں ٹیلی ویژن نہیں دیکھتی تھیں۔ ٹیلی ویژن میں جو پروگرام ہوتے ہیں۔ ان سے عموماً ان کے من چاہے نظریوں کو بڑی بیٹیس پہنچتی تھی۔ ہر شام کو جب ان کا بڈھا پھڑی لے کر لمبی سیر کو نکل جاتا اور شام کا اندھیرا لگن میں چھانے لگتا تو انہیں کمروں سے خوف آنے لگتا۔ ٹیلی ویژن سے آنے والی آوازیں اور موسیقی عجیب قسم کا شوبہن کر باہر لوگن میں آتی۔ جب بڑی ماں جوان تھیں تو شام بڑے مقدس طریقے سے آیا کرتی تھی۔

پہلے سہ پہر آتی۔ سائے اور دھوپ کا رنگ بدلتا پھر ہولے ہولے قدم قدم پوہ پوہ سورج کی سواری چلتی۔ شام روپی شام لگے اندھیروں میں لپیٹی آتی۔ چڑیاں رین بسیرے لینے چلی جاتیں۔ آسمان پر کونے دار دردار اُرتے نظر آتے۔ گھاس پوہ وخت سب سوگوار ہو کر رات کے منتظر ہوتے سہ پہر سے لے کر رات کے آنے تک بڑا لمبا وقت ہوتا تھا۔ نمازیں پڑھنے، چائے پینے، ملنے ملانے والیوں سے باتیں کرنے کے بعد بھی شام کا کچھ نہ کچھ بچ جاتا تھا، لیکن اب تو سر شام سائے گھر سے عجیب عجیب آوازیں آنے لگتیں۔ کہیں ٹیپ چلتے کہیں گیت گونجتے، کہیں ٹیلی ویژن دھاڑتا، کہیں سکوتر کار ریس دے کر شوہنچاتی نکلتی۔

بڑی ماں کبھی ٹیلی ویژن کے کمرے میں اور کبھی باہر ڈولتی پھرتی۔

یہ سب لوگ کیا دیکھتے بیٹے ہیں؟ کیسے بھلے لوگ ہیں جن کا دل ایسی تصویروں سے ایسے شود سے بھر جاتا ہے؟

لیکن ٹیلی ویژن والے نیم برآمدے نیم کمرے میں کچھ اور ہی رنگ رہتا تھا۔ آمنہ عموماً صوفہ کے ساتھ پشت لگا کر قالین پر بیٹھا کرتی کچھ ایسے رنگ ڈھنگ سے کہ اُس کے کوہے بہت بڑے اور باقی جسم مخنی سا نظر آنے لگتا۔ عام طور پر اس صوفے پر بڑے خالو آکر بیٹھ جاتے، لیکن بڑے خالو ہمیشہ گھاٹے میں بیٹے۔ کیونکہ وہ اس طرح آمنہ سے قریب ہو کر اس کی نظروں سے پشت ہونے کے باعث بہت دودھ ہو جاتے۔

اب نظروں کے عمل کے لئے سامنے آرام گرسی بیٹھنے والا شاہد خوش نصیب ہو جاتا۔ آمنہ کو ہر جملے، ہر لطیفے پر اچھے منظر کے بعد نوٹ ملانے کی ضرورت پیش ہوتی اور شاہد سے زیادہ کوئی اس کا ذوق سلیم نہ سمجھتا تھا۔ ٹیلی ویژن پر پروگراموں کی وساطت سے وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے تھے۔ جتنی دیر پروگرام چلتے نظروں کا ٹرانسمیٹر بھی جاری رہتا۔ پسندنا پسند پر جانین کی طرف سے مہرین لگائی جاتیں۔ جوہنی پروگرام ختم ہوتا، ان پر تفصیل سے بحث جاری ہوتی۔ یہ بحث کچی تسی کی طرح جتنی چاہی جاتی بڑھائی جاسکتی تھی۔ گونپا ہر سارا خاندان اس بحث، تبصرے میں شامل ہوتا، لیکن ٹیلی ویژن سے نظریں ہٹا کر آپس میں ملانے لکھنے والے اس بچہ میں پیش پیش بیٹے۔

پتہ نہیں شاہد کے ساتھ آمنہ کتنے پانیوں میں اُتری؟

پتہ نہیں وہ تخیلے میں کبھی ملتے بھی تھے کہ نہیں، باتیں رسمی تھیں کہ ذومعنی۔ بس بڑی ماں کے پروار میں ایک اور دور کا دھماکہ اس روز ہوا جب اندر ہی اندر شاہد نے پاسپورٹ بنوا کر لندن جانے کا اعلان کر دیا۔ کچھ دن تو بڑی ماں سے سب چھپاتے رہے، کیونکہ شاہد ماں جی کا پیٹ گھروڑی تھا۔ ہر ماں چاہے بیٹے ہی کے کمرے میں رہے، چاہے بدلیں بسے

بیٹے کے تئیں سے پہچان جاتی ہے۔ ایک روز انہوں نے شاہد کا کندھا پکڑ کر پوچھا۔
”سنا ہے بے تو لندن جا رہا ہے؟“

”جی؟“

”اس جمعرات کو؟“

”آپ سے کس نے کہا؟“

”آمنہ کہہ رہی تھی۔“

کسی اور نے یہ بات ماں جی کو بتائی ہوتی تو شاہد اس کے گلے پڑ جاتا۔ اب محض تملدا
کہ پہلو بدل کر بیٹھا رہا۔

”کیوں؟“

”جی ایک سال کا کورس ہے۔“

”اچھا؟“

”شاید دو ایک مہینے پہلے ہی آجاؤں؟“

جانے سے پہلے شاہد سب سے باری باری اُن کے کمروں میں ملنے گیا وہ ملنے ملانے
کو فرض نبھانے کی شکل دینا چاہتا تھا، آمنہ کے کمر سے تک پہنچتے پہنچتے اُسے ایک لیکچر سا
حفظ ہو گیا۔

”سلام علیکم“

آمنہ چارپائی پر بیٹھی نائنوں پر کیوٹس لگا رہی تھی۔

”وعلیکم السلام“

”وہ جی میں جا رہا تھا سوچا۔ کہ.... مات آپ نے۔“ BE WATCHED دیکھا تھا۔

”جی۔؟ اچھا تھا۔“

آمنہ اب اُسے اس پر دو گرام کی کہانی سنانے لگی۔ وہ اتنے قیمتی وقت کو اس طرح رائیگاں

نہ کرنا چاہتا تھا! لیکن آمنہ اُس کے آنے جانے سے بے نیاز کیوٹس لگانے اور کہانی سنانے
میں مشغول تھی۔

”میں جی لندن جا رہا ہوں، کہانی کے اختتام پر شاہد بولا۔

”اچھا۔“ آمنہ نے ایسے کہا جیسے شاہد ماموں کا نجن جا رہا ہو اور شام کو اُس کی واپسی
یقینی ہو۔“

”کچھ واقعے کچھ لوگوں کے دل میں موڑے کر دیتے ہیں۔“ بڑی دیر بعد شاہد بولا۔
”موڑے؟“ نظریں اٹھا کر آمنہ نے پوچھا۔

”میں۔۔۔ وہ آپ....“ یکدم شاہد کو بریک لگ گئی۔ ابھی تک اُس کے ہاتھ میں
منگنی کی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔

”جی۔؟“

”آپ نے LONG HOT SUMMER دیکھا اس ہفتے کا۔“

”ہاں۔۔۔ کمزور تھا اس بار۔“

اب وہ ہیرو کے لباس پر لمبی چوڑی تنقید کرنے لگی۔

”آپ اُرپورٹ نہیں چلیں گی؟“

”کیوں؟“

”میں جا رہا ہوں۔۔۔ لندن۔“

”اوہ۔ آپ نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا؟“

”بتایا تھا!“

”کب۔؟“

”ابھی دس منٹ ہوئے۔“

”اچھا؟“

”تو چلیں گی آپ؟“

”جی اب میں کیسے جا سکتی ہوں“

”کیوں؟“

”اب تو میں نے سر کو تیل لگا لیا ہے“

”تیل کیا کہتا ہے؟“

”دیکھیں تو سہی میں لگ کیا رہی ہوں چوہی سہی؟“

شاہد نے کچھ کہنا چاہا، لیکن پھر یہ سوچ کر کہ آخری دس منٹ کی گفت و شنید سے فائدہ؟ چپ ہو رہا۔ ہاں ایئر پورٹ پہنچ کر جب سارا پروار باری باری اس سے بغلگیر ہو کر اشک شونی میں لگا ہوا تھا۔ شاہد نے اپنے ہاتھ سے انگوٹھی اتاری اور اسباب وزن کرنے والے کنڈے کے پاس ماں جی کو لے جا کر شرمساری سے بولا۔

”ماں جی یہ انگوٹھی آپ واپس کر دیں۔ میں عیدہ سے شادی نہیں کر سکتا“

ایئر پورٹ پر بہت شور تھا۔ گنگنی آواز میں بار بار ایک لڑکی ہوائی جہازوں کے متعلق مائیکروفون پر کچھ کہہ رہی تھی، لیکن کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ دور بے کالے صوفے پر ماں جی کا بڑھا صاف سے آنسو پونچھنے میں مشغول تھا۔

یہ بد نصیب کون تھا؟

ساری عمر اس نے اتنے لوگوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر کیوں اٹھایا۔ کوہکن نے تو ایک نہر کھود کر اتنا نام پایا، لیکن اس نے ساری عمر روپے کی آسانشلوں کی محبتوں کی ان گنت بہریں کھودیں اور محلے میں بھی اُس کا نام نہ ہو سکا۔ کوہکن نے تو اپنی محبت سچی کرنے کو مشقت جھیلی، لیکن اُس نے تو اُن کے لئے بھی جہا جالی جن سے اس کا کوئی دلی کوئی روحانی رشتہ بھی نہ تھا۔ اس کوہکن کو کون یاد رکھے گا؟

اس کا سفر کب سے شروع تھا؟ اس کا سفر کہاں ختم ہو گا؟

یہ بد نصیب کون تھا؟ خدا نے اس کے لئے کیسی سزا مقرر کر رکھی تھی؟

”جی میں عیدہ سے شادی نہیں کر سکتا“

بڑی دیر بعد ماں جی کو سمجھ آئی کہ شاید اپنی بچپن کی منگنی توڑ رہا ہے۔ انہوں نے اس اجنبی لڑکے کو بچپا نپا چاہا۔

لیکن آنکھوں کے ساتھ ساتھ یادداشت کے بچن ہول بھی خالی خالی ہو گئے تھے۔

”میں جانتا ہوں کہ آپ کو بڑی تکلیف ہو رہی ہے، لیکن کیا کروں میں مجبور ہوں“

آج اُسے اپنے آنسوؤں سے شرم نہیں آ رہی تھی، کیونکہ آج سب سے بچھڑ کر رونا بزدلی نہیں تھی۔ آج یہ اظہارِ محبت تھا۔ اپنے بزرگوں کی خوشنودی کو حاصل کرنے کے مترادف تھا۔

لیکن جب سے جلیل اور قدیر اپنے اپنے گھر چلے گئے تھے اتنا بڑا دھماکہ ماں جی کے

گھر میں نہ ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر سوچتی رہیں۔ پھر یہ دھماکہ بھی اُن کے اندرونی شوہر میں ایسے جا ملا کہ انہیں تشنیں کرنا مشکل ہو گیا کہ وہ کس چیز کا اس قدر غم منا رہی ہیں۔

شاہد انگوٹھی پھینک کر چلا گیا، لیکن عیدہ اُسے اتنی آسانی سے معاف نہ کر سکی۔

جس طرح ٹیکسی چلتی ہے تو آپ سے آپ میسر کچھ نہ کچھ بتاتا رہتا ہے، اسی طرح عورت کے اندر بھی ایک میٹر چلتا رہتا ہے نہ جانے کیوں شاہد کے جلنے کے بعد عیدہ نے آمنہ کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا۔

”کرلی کی سمجھتی کیا ہے اپنے آپ کو؟“

ایک دو اور دل جلی میٹیاں جو گھر کے کونے کھدروں میں چھپو ندروں جیسی زندگی

بسر کر رہی تھیں۔ عیدہ کی فورا ہم خیال ہو گئیں۔

”کل دیکھا تھا؟ دیکھا تھا؟ شیفون کی آستینیں اور مرن جوگی سر پر بازو رکھ کر ٹیلی ویژن

دیکھ رہی تھی۔ سارے بیٹھے تھے۔ بڑے خالو، زمر بھتی“

کم صورت، بھدی دو خالہ زاد بھی اس گفتگو میں شریک ہو گئیں۔

”سائے جسم پر آدھ آدھ انچ لمبے بال ہیں“
 ”اُن کو ہائیدروجن سے سنہرے کرتی ہے“
 ”قد بہت چھوٹا ہے“

یہ بہت اچھا پوائنٹ تھا؛ کیونکہ واقعی اُس کا قد بہت چھوٹا تھا۔ فاصلے سے
 نویں جماعت کی طالبہ لگتی تھی۔ اس خاندان کی ساری عورتیں کھڑے کھڑے دروازوں
 کی ریلنگ پر پردے ٹانگ لیتی تھیں۔

”جب تک عورت کا قد نہ ہو۔۔۔ ہائے سُن کیسا؟“

”شاعروں نے تو کہا ہے لانا قد، سروجیسا“

”شاعر کوئی احمق تھوڑے ہوتے ہیں۔ کسی نے کبھی ٹھگنی عورت پر نظم لکھی ہے اُس
 کی تعریف کی ہے۔“ اس پر بظاہر ساری ٹکڑی مطمئن ہو جاتی۔ لیکن دوسو سے بالکل ختم
 نہ ہوتے۔ مچھلیاں سطح آب سے ایک ہی چھڑاپے میں تہہ آب چلی جاتیں۔

ماں جی کا پردہ وار ایک عرصہ سے مادی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اب اوپر سے نیچے تک
 احساس کی انگٹھیاں سی سنگ گئیں۔ سب کی آنکھوں میں اپنے اپنے زاویوں کی سوچ جھلکنے
 لگی۔ بڑے خالو گھر کی سب سے جامع شخصیت تھے اور گو وہ یہاں مستقل طور پر نہ رہتے تھے
 لیکن اب ان کا قیام لمبا ہوتا جا رہا تھا۔ پہلے خالہ کے دانت انہوں نے ڈنڈسٹ سے
 ٹھیک کر لئے پھر مکمل طور پر اپنا اور خالہ کا میڈیکل چیک اپ کرایا۔ روز کراچی سے ٹرک کال
 آتی کہ بزنس میں گھانا پر رہا ہے، لیکن وہ نئی نئی تھویدیاں نکالنے میں سارا دن صرف کرتے۔
 جان ہی نہ رہی تو بزنس کیا خاک ہے گی؟

اب اُن کا زیادہ وقت گھر کی ٹھیکوں بابوں سے باتیں کرنے میں گزرتا۔ جہاں بڑے
 خالو ہوتے وہاں اُن کے مریدان کی ٹکڑی پرے جہاں بیٹھ جاتی۔ الف سے یے تک سارا
 اخبار زیر بحث آتا۔ یہ طبائع اور شخصیت کی مکمل جنگ تھی۔ بڑے خالو ہار ماننے والوں میں

سے نہیں تھے۔ خاموش، خربونے کے بیج کھاتی، بڑے کو بہوں والی آمنہ جب اس ٹکڑی
 میں شامل ہوتی تو خالو کو اپنی تفریح، اپنے کاروبار اپنی زندگی کے ہر شعبے کے لئے آمنہ کی
 مہر درکار ہوتی جیسے کوئی لمبی چھٹی کی عرضی لئے آفیسر کے سامنے کھڑا ہو۔ نہ جانے کیوں اور
 کیسے وہ مکمل طور پر آمنہ کو مرعوب کرنا چاہتے تھے اور مرعوب کرنے کے بجائے مرعوب
 ہونے چلے جا رہے تھے۔ بڑے خالو آمنہ کو اپنے عشق میں مبتلا کرنا چاہتے تھے، لیکن اس کے
 برعکس وہ خود پکی عمر کے عشق کا المیہ ہو چکے تھے۔ آمنہ کو دیکھ کر اُن کا جی چاہتا کہ لڑکوں جیسی
 حرکتیں کریں۔ دیوار پر درختوں پر اپنا اور آمنہ کا نام کرید کر ساتھ ساتھ لکھیں، الٹ بازیاں
 لگائیں، سائیکل کے ڈنڈے پر بٹھا کر سائے شہر کا چکر لگائیں۔ یہ عشق مجبور، بیٹی اور بیوی کا تین لنگا
 جھنڈا تھا۔ بسے وہ اپنی معمری کی وجہ سے کہیں بھی نصب نہیں کر سکتے تھے اور دل کے ایوان
 پر اس کو لہرانے سے دل کی ویرانی اور ہیبت ناک ہو جاتی تھی۔

پھر اچانک خالو اپنی بیوی بچوں کو بڑی ماں کے پاس چھوڑ کر کراچی چلے گئے۔
 یہ فیصلہ اچانک ہوا۔

اور اس فیصلے کے تین دن بعد اچانک بڑی ماں کے بڑے بھتیجے نے خود کشی کر لی۔
 اسی روز آمنہ فلم دیکھنے گئی ہوئی تھی۔ رات گئے فلم ختم ہونے کے بعد وہ اپنی سہیلی کے ساتھ
 چلی گئی، جب سہیلی کے گھر سے اُس کا فون آیا خرم کو مرے پورا گھنٹہ ہو گیا تھا۔ ”کون ہے؟“
 ”ہیلو... ہیلو...“ بھئی آج رات میں گھر نہیں آسکوں گی۔ ہاں! — میری
 سہیلی کا ڈرائیور بیمار ہو گیا ہے اچانک.... جی میں.... یہیں ٹھہر رہی ہوں۔ شاہ جمال
 میں اس کے پاس.... جی؟ — کس نے.... ختم نے؟ — کیسے۔“

پھر فون دونوں جانب سے بند ہو گیا۔

خدا جانے آمنہ پر اس کا کیا اثر ہوا؛ کیونکہ جب وہ دوسرے دن گھر لوٹی تو اس
 کا چہرہ ستا ہوا لیکن آنکھیں خشک تھیں۔

دیکھتے دیکھتے دری برابر بدلی گھٹا ٹوپ اندھیرا بن کر سارے گھر پر چھا گئی۔ اندر باہر پھوہا پڑنے لگی۔ پھر نالہ باری میں کئی شیشے ٹوٹ گئے۔ باہر کے ندی نالوں سے زیادہ اندر جل تھل ہو گیا۔

آمنہ کے خلاف دو ٹ بہت تھے۔ اس کے باوجود جب قیس کا رشتہ اُس کیلئے آیا تو سب حیران رہ گئے۔ قیس تو ولایت پلٹ، ہاتھی دانت تھا۔ گھر کی ساری کنواہیاں مدتوں اُس کی آس میں ور ملا پڑے بیٹھی ہوئی تھیں۔ قیس کی باتیں مصری کی ڈیاں، اُس کی چال ڈھال مغربی ایکٹروں جیسی اور اُس کی آمدنی کسی پچھتہ سرمایہ دار جتنی تھی۔

رات کو جب سب سو گئے اور آخری بار خرم کی ماں نے بڑی ماں کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا: ”ماں جی خرم تو چلا گیا، خدا جانے کیوں؟ میں کسی پر الزام نہیں لگانا چاہتی پر... پر آپ آمنہ کو ہوسٹل نہیں بھیج سکتیں؛ جلیل قدیر نے کبھی قدم نہیں رکھا اس گھر میں شاہد کا خط لندن سے نہیں آیا۔ آپ گھر کو مردوں سے پاک کرنا چاہتی ہیں؟“

اسی رات ملکی ملکی ٹھنڈ تھی، لیکن بڑی ماں اب بھی بلڈ پریشر کی وجہ سے باہر آنگن میں پلنگ ڈالے اوپر سے نیچے تک تین منزلہ مکان کو دیکھ رہی تھیں۔ انہیں اس مکان کی کڑکیاں دروازے دہلیزیں چوکھٹ سب یاد تھیں۔ انہوں نے پوسے تیس سال اس مکان میں دنیا آباد کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن اب وہ جانتی تھیں کہ شعوری کوششوں سے کچھ نہیں ہوتا۔ شعوری کوشش سے ایک گھاس کا پتہ تو انسان اگا نہیں سکا۔ پھر کائنات کیسے بسا لیتا ایک تین منزلہ مکان میں۔

”آپ نے مجھے بلایا بڑی ماں“

”آؤ بیٹھو“

آمنہ پانچویں اس طرح بیٹھی کہ ایک ٹانگ دوسری ٹانگ کے ساتھ نوٹے کا زاویہ بنانے لگی۔ ”سنو آمنہ۔ یہ زندگی عجیب جھنجٹ ہے۔ یہاں انسان کی آدمی عمر معافیاں مانگتے اور

آدمی عمر معافیاں دیتے گزر جاتی ہے۔ معافی مانگتے ہوئے اور معافی دیتے وقت ہمیشہ دو آدمیوں کا رشتہ خدا اور بندے کا رہتا ہے۔ کبھی انسان انسان کے قریب نہیں آتا۔“

”آپ نے مجھے بلایا تھا ماں جی“

”بلایا تھا۔ تو میری بہن کی اکلوتی نشانی ہے اور میری بہن کی ہی نہیں، میرے مائیکہ گھر کی آخری نشانی ہے۔ عجیب جگہ ہے مائیکہ چھوٹ کر اور بھی پیارا ہو جاتا ہے۔ جیسے حضرت آدمؑ کو چھوٹ کر جنت پیاری ہوئی۔ سن آمنہ دو راستے ہیں۔ ہر دو راستے دو ہوکروں کی ایک ہیں۔ آدمی چاہے اپنی مرضی سے کسی راستے پر جائے۔ آخر کو راستہ ایک ہی رہتا ہے۔“

”کونسا ماں جی؟“

”تنہائی کا۔۔۔ انتہا کا۔۔۔ زندگی کے ختم ہونے کا انتظار؟“

”آپ نے مجھے بلایا تھا ماں جی؟“

”بلایا تھا۔ ضرور بلایا تھا۔ دیکھ آمنہ عورت جوان ہو اکیلی ہو اور بے دھیانی ہو تو اُسے مرد بہت۔! بھلا کیا کہا میں نے؟“

”جی عورت اکیلی ہو جوان ہو اور بے دھیانی ہو تو اُسے مرد بہت۔“

”ٹھیک“ بڑی ماں بولیں۔ ”مرد بہت۔“ پر چھایا ہر جگہ پڑتا ہے عمر کا دام ہر جوانی کو زیر کر جاتا ہے۔ پھر اکیلی عورت بے دھیانی نہیں رہتی۔ اور۔۔۔ جب وہ بے دھیانی نہیں رہتی تو بیٹھ چھٹے لگتی ہے۔ تنہائی کا کنکجور رات کے پچھلے پہر تکیے پر پڑ بیٹھنے لگتا ہے۔ یہ راستہ بالآخر تنہائی کے سنگ میل بکھیرتا ملتا ہوتا جاتا ہے۔“

”آپ نے مجھے بلایا تھا ماں جی“

”دوسرا راستہ۔ یہ ہے۔ ساری جوانی بچے جنتے اور سارا بڑھاپا بچوں سے وداع ہونے میں گزر جاتا ہے۔ سارے مردوں پر دروازے بند کر بندی خانے میں عمر گزارنے کی عجیب سزا ہے۔ تین منزلہ مکان میں کوئی تمہیں نہیں جانتا، کوئی تمہیں نہیں پہچانتا، سب

آپ کی عادتوں کو جانتے ہیں۔ آپ کے مزاج کے واقف ہوتے ہیں۔ کوئی آپ کو نہیں جانتا! یہ راستہ میلے میں اکیلے پہننے کا راستہ ہے۔ بالآخر راستہ ایک ہی ہوتا ہے آمنہ تنہائی کا راستہ۔“

”جی؟“

”سن آمنہ ہر انسان چاہے وہ مرد ہو چاہے عورت اندر سے وہ رب ہے۔ چھوٹا سارے رب کی آرزو ہے کہ کوئی ایسا بھی زندگی میں آئے جو اُس کی ذات کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھہرائے۔ جانتی ہے شرک کیا ہے؟ ہر مرد ہر عورت اُسی آرزو میں ساری عمر جھوٹے پتے عشق اور بڑی لمبی لمبی تنہائیاں سمیٹتے ہیں۔ جانتی ہے شرک کیا ہے؟“

”نہیں جی۔“

”رب کی ذات کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا۔“

”پر ماں جی۔“

”سب — ہر لولا، لنگڑا، بھوکا، پیاسا، خوبصورت، بد صورت، کالا، سفید.... جو بھی اس دنیا میں آتا ہے اسی آرزو کے ساتھ آتا ہے۔ ہر انسان چھوٹا سارے رب ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کوئی اور ایسا آئے جو اُس کی ذات کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔ یہی وہ گناہ ہے جو حضرت آدمؑ نے کیا.... انہوں نے ایک روز چوری چوری.... باغ بہشت میں مائی حوا سے پوچھا۔ بول مجھے سجدہ کرے گی.... ماں حوا نے اُن کے قدموں میں اپنا سر جھکا دیا۔ حضرت آدمؑ نے سوال کیا۔ بول کسی کو میرے ساتھ شریک ٹھہرائے گی....

مائی حوا نے اپنے رحم پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی اور تو جانتی ہے کیا سزا ملی دونوں کو.... کیا کہا ہمارے رب نے حضرت آدمؑ سے؟“

”کیا ماں جی؟“

”اللہ نے کہا۔ جازمین پر چلا جا اور اس شرک کی سزا بھگت — جاؤ۔ تیرے

شرک کی یہی سزا ہے کہ تو خدا کو جب بھی ملے گی۔ آدمؑ کی شکل میں ملے گی اور تجھے آدمؑ خدا بننے کا شوق ایسا سوا کرے گا کہ تو ہر خواہے پرستش کروانے کے بعد بھی خالی ہے گا۔ خالی سیلی کی طرح.... یہی تیرے شرک کی سزا ہے۔ تو عورت سے محبت چاہے گا اور وہ چوری چوری اندر ہی اندر پتھر پالے گی اور تیری محبت میں شرک کی مرتکب ہوگی۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی ماں جی۔“

”دیکھ — عورت جوان ہو کر اکیلی ہو اور بے دھیانی ہو تو اُسے مرد بہت.... پر.... راستہ یہ بھی تنہائی کو جاتا ہے اور تین منزلہ مکان میں ہے ساری عمر بچے بننے پھر بھی راستہ تنہائی کو جاتا ہے۔ ہر رب کی قسمت میں بالآخر تنہائی ہے وہ چھوٹا ہو کہ بڑا۔ بول تو نے اپنے لئے کونسا راستہ چنا ہے آمنہ؟“

”میں نے۔ میں نے۔“

”قیس کا رشتہ بھی ہے۔ اور۔۔۔ جب تک آنکھ کا دیار روشن ہے سب کو بھی ہر رنگ کا مل سکتا ہے بول۔ کونسی صلیب چنے گی تو اپنے لئے۔ مشکِ نافہ بن کر پاگل کرے گی سب کو بکھر جائے گی آخر کہ سیپ کے کیڑے کی تنہائی موقی بنائے گی سب سے چپ کر۔ آمنہ نے اپنے ارد گرد دیکھا۔

خترم، شاہد، جلیل، قدیر.... کالج کے کئی خوبرو اُس کی نظروں کے سامنے گھوم گئے اس سائنس گاہ کا کیا اعتبار؟

”میرے لئے قیس کا رشتہ آیا ہے۔ بولے تو ماں کر دوں؟“ آمنہ نے مائی حوا کی طرح اپنے رحم پر ہاتھ رکھا اور بڑی ماں کے سامنے جھک کر بولی۔

”میں شرک کے لئے تیار ہوں بڑی ماں آپ ہاں کر دیجئے۔“

”دیکھ لے مرد کی محبت نہیں ملے گی۔ پھر۔۔۔“

”میں جانتی ہوں۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”مجھے جنت میں پہنچتے بہت عرصہ ہو گیا ہے۔ ماں جی۔“

رنگروٹ

سامنے گھٹیلوں کا ڈھیر تھا اور سب عورتیں پہلا کلمہ پڑھنے میں مشغول تھیں۔ سفید پاؤں پر جابجا چکنی کھجور کی گھٹیلوں کی پاؤں آدھ پاؤں، سیر سوا سیر کی بُرجیاں لگی ہوئی تھیں شیخ وجاہت کی موت کا کسی کو یقین نہ آ رہا تھا لیکن اتنی بات پر سارا محلہ متفق تھا کہ ایسا راسخ العقیدہ سپا اور پکا مسلمان جب سے پاکستان بنا، محلے والوں نے نہ دیکھا تھا۔ سنتے ہیں کہ پاکستان بننے سے پہلے دو گلیاں چھوڑ کر بابا مرید کھیس نیچنے والا رہا کرتا تھا۔ تصور سے کھیس خرید کر لاتا۔ اسی قدر کھیس بیچتا جس سے دن بھر کی روٹی چلتی اور باقی وقت اللہ اللہ کرنے میں گزارتا۔

بابا مرید لیا کے متعلق تو شاید کسی کو شبہ بھی ہو لیکن شیخ وجاہت کے متعلق اندر بابا مرید کو خیال ہی نہ آ سکتا تھا کہ وہ اللہ کا نیک پسندیدہ چنیدہ آدمی نہیں بلکہ جس وقت جنازہ گھر سے رخصت ہوا کئی رقیب القلوب ملاقاتی یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ وہ ان ۷۰۔ ابدالوں میں سے ایک تھا جن کے سہارے دنیا کا نظام قائم رہتا تھا۔

پتہ نہیں گھٹلیاں زیادہ تھیں کہ بیسیاں پڑھ پڑھ کر تھک چکی تھیں۔ پتہ نہیں کس طرف سے آواز آئی؛

”کیوں بیوی جی۔ تم نے تو کئی بچوں کو تران پڑھا یا ہے۔ بتائیے کیا قبر کا عذاب ہوتا

ہے کہ نہیں۔
 "ہوتا کیوں نہیں۔ منکر نکیر جو آتے ہیں قبر میں؛ بواجی نے سفید دوپٹے کا نوں کے
 دونوں طرف اڑس کر کہا۔
 "لیکن جی۔۔۔۔۔ حساب کا دن تو مقرر ہے۔ اس دن سے پہلے صاحب کیا؟"
 کانٹ کی پڑھی ہوئی بڑی ہونے پوچھا۔

اب مصالحت کے انداز میں بیوی جی بولیں:
 "اے بھئی اپنے اپنے عقیدے کی بات ہے۔ بریلویوں کا کچھ عقیدہ ہے —
 دیوبندی کچھ اور سمجھتے ہیں۔ ہم تو سمجھتے ہیں اپنا عقیدہ چھوڑ نہیں۔ کسی اور کا عقیدہ
 پھیر نہیں۔"

متی جو دیر سے اپنی ماں کی بغل میں گھسی آٹس کویم کے لئے روپیہ مانگ رہی تھی جھٹ
 دوپٹے سے منہ نکال کر بولی — "آئی۔ کیا شیخ صاحب کو بھی قبر کا عذاب ہو گا؟"
 ساری غفل پر جیسے گھٹیلوں کی بارش ہو گئی۔ سورتوں کے دلوں پر گومڑ پڑ گئے۔
 "یہ روپیہ اور بھاگو یہاں سے۔"

"ان کو بھی منکر نکیر پوچھنے آئیں گے۔" منی نے ایک اور جملہ کیا۔
 بواجی نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگا لیا اور سردائیں بائیں ہل کر بولیں:
 "نو۔۔۔۔۔ شیخ صاحب کو عذاب کیسا — وہ تو پھولوں میں گئے ہیں خوشبوؤں
 میں بسے ہوئے۔ ان کا حساب کیا؟ حساب تو ہم جیسوں کا ہوتا ہے ہم جیسوں کا۔"
 اس وقت کوئی بی بی موقع کی نزاکت سمجھ کر اونچے اونچے رونے لگی۔ سارے میں
 سسکیاں، آسوا اور، پچکیاں ٹرانسمٹ ہو گئیں۔

لو بھلا شیخ صاحب کو عذاب کیسا؟
 لو بھلا شیخ صاحب کا حساب کیسا؟

جب میں پہلے پہل شیخ صاحب سے متعارف ہوا وہ محلے کے تین معتبر لوگوں کیساتھ
 میرے گھر معمر اور غریب کے دوران آئے تھے۔ میں محلے میں نووارد تھا لیکن شیخ صاحب کی
 آواز، نشست و برخاست، ان کا لباس، ہاتھ رکھنے اور اٹھانے کا طریقہ غرضیکہ ان کی تمام
 شخصیت کا پھیلاؤ دکھ کر ہی میں اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ شیخ صاحب بڑے نیک متقی
 اور پرہیزگار آدمی ہیں۔

وہ چاروں حضرات میرے پاس مسجد کی تعمیر کیلئے چندہ لینے آئے تھے۔ کم از کم اس
 وقت میں ہی سمجھا تھا۔ میں نے جیب سے سو روپے کانٹ نکالتے وقت اپنے آپ کو
 حاکم وقت سمجھا تو شیخ صاحب نے میرے بڑھے ہوئے ہاتھ پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر کہا:
 "نہیں حضرت! مسئلہ یہ نہیں ہے — مسئلہ ذرا دقیق ہے۔"

میں ان کا منہ تکیے لگا۔ باقی تین حضرات جیسے جرات کی مانند صرف کنکریاں کھانے
 آئے تھے، چپ رہے۔

"دیکھیے مسجد تو قریب قریب مکمل ہو چکی ہے۔ میں نے اس کی تعمیر خود دیکھ کر ہے ہو کر
 کروائی۔ آپ چل کر ملاحظہ کر لیجئے کہ میری محنت کا کیا صلہ ملا ہے۔ بس اب پنکھے
 لگنے ہیں اور فرش پڑنا ہے۔"

"میری تو اس سے زیادہ پہنچ نہیں ہے۔" میں نے بجا جت سے کہا۔
 "نہیں نہیں۔ ہم آپ سے چندہ لینے نہیں آئے۔" شیخ صاحب نے محبت سے میرا
 ہاتھ سملاتے ہوئے کہا — "یہ جو آپ کے گھر کے سامنے سرخ مکان ہے یہاں سے
 سنگ مرمر کا فرش بنانے کے لئے بیس ہزار کا چیک ملا ہے۔ رقم اتنی بڑی ہے کہ فرش
 بھی لگ جائے گا اور پنکھوں کا انتظام بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن۔۔۔۔۔"

"لیکن کیا شیخ صاحب — چیک بھنوائیے اور کام چالو کیجئے۔"
 "مشکل یہ ہے صاحب۔ یہ جو لال مکان ملے ہیں ان کا رزق مشتبہ ہے —"

آپ تو اس محلے میں نہ تھے ہیں لیکن ہم سے تو کچھ چھپا نہیں۔

”کیا کہتے ہیں شیخ صاحب۔ بے چارہ سیدھا سا وہ ٹھیکیدار ہے۔ موٹر سائیکل پر آتا جاتا ہے۔ بڑا شریف آدمی ہے۔“

”لیکن بد قسمتی سے اس کی گھروالی کی ماں کا رزق حلال نہیں تھا۔ وہ ادھر اُس بازار کی تھی۔ کون جانے اس رقم میں اس کا کتنا حصہ ہو۔ آپ کو طریقے طریقے سے یہ بات اُن تک پہنچانا ہے یعنی اگر ہم کہیں گے تو پڑوسی ہونے کی رعایت سے ان کی دل شکنی ہونے کے امکانات ہیں۔ لیکن آپ اجنبی ہیں اس محلے میں۔ آپ مناسب الفاظ میں انہیں ہمارا اعتراض پہنچا دیجئے!“

میں میرانی سے شیخ صاحب کا چہرہ دیکھتا رہا۔

جرات خاموش رہے۔

”ہماری آرزو ہے کہ یہ پیسہ پہلے آپ ٹھیکیدار صاحب سے ادھار لے لیں۔ وہ بھلے آدمی ہیں ضرور ادھار دے دیں گے۔ پھر اپنی طرف سے ہیں چندے میں دیں۔ یہ قرض آپ کو ٹوٹانا نہیں پڑے گا۔ دیکھئے اللہ کے گھر کی تعمیر کا سوال ہے۔ شبہ والی بات نہیں ہونی چاہئے۔ آپ کو ثواب ملے گا۔“

میں ثواب کے جگر میں پرٹ گیا۔

”لیکن۔۔۔ لیکن شیخ صاحب! میں اس گھر میں نیا ہوں۔ محلے میں نو وارد ہوں۔ ٹھیکیدار مجھے کیونکہ بیس ہزار ادھار دے گا۔“

”دیکھئے ہم ان کی دلداری نہیں کر سکتے۔ ہم محلے میں پرلے ہیں۔ آپ کو ان کے پاس جا کر جھوٹ بولنا ہو گا کہ۔۔۔ کہ آپ کو بیس ہزار روپیہ درکار ہے اور شیخ صاحب آپ کو وہ چیک دے سکتے ہیں۔ کچھ دنوں کے لئے جو انھوں نے مسجد کی تعمیر کے لئے بھجوایا ہے پھر آپ وہ چیک ہیں دے دیں۔ بس اتنی سی بات ہے۔ ساتھ ہی باتوں باتوں میں یہ

بھی بتادیں کہ شیخ صاحب کیوں چپک نہیں لے سکتے۔“

گو بات میرے پتلے نہ پڑی لیکن وہی کچھ ہوا جو شیخ صاحب نے فرمایا تھا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ جو تین جرات شیخ صاحب کے ساتھ آئے تھے انہوں نے بات LEAK کر دی اور ٹھیکیدار کی بیوی کئی راتیں روتی رہی۔ اس نے اپنے شوہر سے وعدہ لیا کہ وہ کبھی مسجد میں نماز پڑھنے نہیں جائیں گے۔ کچھ عرصہ ٹھیکیدار صاحب مسجد میں تشریف نہ لائے پھر یہ خاندان خدا جانے کہاں جا بسا اور ان ہی کے گھر میں ایک اجنبی آجئے۔

اجنبی سے مجھے یاد آیا کہ اجنبی اکرام اللہ سے بھی میری پرانی یاد اللہ ہے۔ اس نوجوان نے ابھی پانچ سال پہلے ساہیوال میں سروس شروع کی تھی۔ وہاں اس اجنبی سے میرے بڑے اچھے مراسم تھے۔ ہر نوجوان آدمی کی طرح جو سروس شروع کرتا ہے ان کے بھی بہت سے اصول تھے آدرش تھے۔ یہ رشوت کے نام پر بدگنا تھا۔ اس کا تکیہ کام تھا کہ اگر حکومت کی چوری ہی کر نہا ہے تو اس کے خزانے سے چراؤ۔ اس کا وقت نہ چراؤ۔ وقت کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ ماں فوت ہو گئی تو پورا دفتر اٹھ کر نئے کے بعد لاہور گیا۔ اکرام اللہ کے دفتر میں کبھی آپ نے انہو دوستان، اگر وہ سفارشاں، جماعت خوشامد پسنداں نہ دیکھی۔ اس کی میز پر کبھی کوئی ناٹل بھی جمع ہو کر کالی صندوقچی میں پڑی نہ رہتی تھی۔ دوست ملنے آجاتا تو فوراً پوچھتا:

”فرمائیے۔ کوئی کام کہ گپ شپ؟“

دوست بیچارہ کنیا کہ عندیہ بیان کرتا تو فرماتے: ”جناب آج شام پانچ بجے میرے گھر۔ میرا خاںساں پچوٹے بہت اچھے بناتا ہے۔“

اکرام اللہ کے خلاف رفتہ رفتہ کافی بغض جمع ہو گیا۔ چالاک ٹھیکیداروں، رشوت خوروں، ایس ڈی او، پولیس کے متعلقہ غرض مند لوگوں نے مل ملا کر اکرام اللہ کی تبدیلی کروادی۔

جس روز نئے محلے کی مسجد میں سنگ مرمر کا فرش دھو دھلا کر پہلا جمعہ پڑھایا گیا تو خطبے کے وقت میری نظر سامنے والی صف پر گئی۔ پشت سے تو ادنیٰ اجنبی اکرام اللہ ہی لگتا تھا۔

لیکن گردن اور کندھوں پر دافر چربی دیکھ کر مجھے کچھ شبہ سا بھی پڑ گیا کہ شاید پانچ سال میں اکرام اللہ اتنا موٹا نہ ہو گیا ہو۔ بلکہ آدمی ہی کوئی اور ہو۔

غماز ختم ہونے کے بعد جب میں باہر نکل رہا تھا تو کسی نے مجھے پیچھے سے پکڑ لیا۔ پٹ کر دیکھا تو اکرام اللہ تھا۔ وہ اب پہلے اکرام اللہ کا جھومساڑ تھا۔ بہت تپاک سے ملنے کے بعد اس نے مجھے اپنے دفتر کا پتہ بتا دیا:

"یاد رقم میرے پاس کل دفتر آتا۔ بالکل پیسہ لاٹری بری کے سامنے۔ ساتھ ہی سمو سے ملتے ہیں۔ خوب مزے دار۔ ضرور آنا۔"

دوسرے دن میں اکرام اللہ کے دفتر پہنچا۔

اس کی کسی کے سامنے چھ آدمی بیٹھے تھے۔ تمام میں جو آدمی سب سے ممتاز تھا وہ شیخ صاحب تھے۔ سامنے ایک پلیٹ میں سمو سے تھے۔ ایش ٹرے سگریٹوں سے بھری ہوئی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ حضرات کافی دیر سے یہاں بیٹھے ہوں گے۔

میں کوئی آدھ پون گھنٹہ بیٹھا رہا۔ پہلی ٹکڑی میں سے کوئی شخص بھی نہ اٹھا۔ ہاں دو چائے اور اشخاص کا اعانہ ہو گیا۔ بالآخر جب میں چلنے لگا تو اکرام اللہ بولا:

"یاد ہے یار میں سا بیواں میں کس قدر احمق اور کسٹرا آدمی ہوا کرتا تھا۔ مجھے تو شیخ صاحب نے انسان بنایا۔"

شیخ صاحب بھینی بھینی مسکراہٹ مسکرائے:

"بس جی۔ آپ کا نٹوں میں نہ گھسیٹے۔ آپ کا دفتر راستے میں بڑتا ہے۔ میں یہاں ٹولنٹن مارکیٹ گوشت خریدنے آتا ہوں۔ ساتھ ہی آپ کو بھی مل لیتا ہوں۔ ایک پننٹہ دو کا ج۔"

اکرام اللہ نے آواز گرا کر کہا۔ "بخدا پہلے پہلے جب یہ آتے تھے تو مجھے غصہ چڑھ جاتا تھا۔ لیکن اب ان کی وجہ سے میرا منہ نظر تبدیل ہو گیا ہے۔ میں اب اپنے جاب کو اپنے لئے وبال نہیں بناتا۔ آخر پچیس سال کام کرنا ہے۔ RELAX کر کے

کرنا چاہئے۔ شیخ صاحب کی مہربانی ہے کہ مجھے اپنے پیسے میں نازل بنایا۔ پتہ نہیں کیا بات ہے کہ اس روز کے بعد میں نے اکرام اللہ سے ملنے کی کوشش نہیں کی بلکہ مسجد میں بھی جب وہ جھپٹھنے آتے تو میں ان سے نظریں چار کرنے سے گھبرا جاتا۔

شیخ صاحب سے البتہ ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ وہ واقعی بہت سچے معاملے کے پکے صوم و صلوٰۃ کے پابند، صاحب کتاب کے گھرے آدمی تھے۔ محلے میں جو اہمیت انکی رائے کو تھی کسی اور کو نہ تھی۔ امانتیں ان کے پاس آنکھیں بند کر کے رکھوائی جاتیں۔ لوگوں کی مدد وہ بے دریغ کرتے۔ غرضیکہ شیخ صاحب محلے کے ماڈل آدمی تھے۔

میری بیوی میری عادتوں سے نالاں ہو کر کہہ اٹھتی:

"ایک شیخ صاحب بھی تو ہیں۔ ان کی مثال سے اچھا محلہ مسلمان ہو گیا۔ ایک آپ ہیں آدمی آدمی رات تک آپ برج کھیلے ہی نہیں تھکتے۔ کم از کم یہ تو دیکھ لیجئے کہ اولاد پر کیا اثر پڑ رہا ہے۔"

میں چڑ کر کہا کرتا۔ "تم اثر پڑوانے دیاں جایا کرو۔ شیخ صاحب کے گھر۔ کوڑے کے گھر میں کوڑے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ بگلا بگلا کو ہی جنم دیتا ہے۔"

یہ رمضان سے دو دن پہلے کی بات ہے کہ میں خیم صاحب کے گھر گیا۔ ان کا گھر ہمارے محلے میں نہیں لیکن محلے سے متصل گلی میں موجود ہے۔ عصر اور مغرب کے درمیانی وقفے کا ذکر ہے۔ تمازت بہت تھی اور صحن گلی میں یوں بیٹھا تھا جیسے کوئی شخص گم بھاپ میں کھل جھکو کر آپ کو اس میں دم چبوت کرنے کیلئے بیٹھا ہو۔ پہلے تو میں نے ارادہ کیا کہ خیم صاحب سے پھر ملاقات کی جا سکتی ہے لیکن مجھے کیرہ درکار تھا اس لئے میں نے باڈی کنواسٹہ دروازے پر دستک دی۔ شیخ صاحب نے میرے لئے دروازہ کھولا۔

اب باتیں شروع ہوئیں۔ شیخ صاحب میرے سامنے اپنا مطلب بیان کرنے سے

قاصر تھے۔ میں شیخ صاحب کے سامنے کیمہ مانگنے سے قاصر تھا۔ بالآخر مغرب کی نماز حجت گئی۔ شیخ صاحب کو فکر تھی کہ کہیں وہ مسجد نہ پہنچ سکیں اس لئے میری موجودگی کے باوجود انہیں اپنا عندیہ بیان کرنا پڑا۔
”سعیدہ کا کچھ سامان دوپٹی سے آرا ہے۔ دو ایک دن میں ڈرائی پورٹ پر پہنچ جائے گا۔“

بعد میں مجھے پتہ چلا کہ سعیدہ شیخ صاحب کی منجھلی بیٹی ہے اور اس کا شوہر دوپٹی میں ایک امریکی فرم کا مینجر ہے۔

”دو ایئر کنڈیشنر ہیں ایک فریج ہے۔ باقی کچھ چھوٹا موٹا بجلی کا سامان ہوگا۔ اگر تم انتظام کر دو تو ہربانی ہوگی۔ سعیدہ کو تو اس میں کچھ دلچسپی نہیں۔ بچوں کی پھیر میں۔“
نجم ڈرائی پورٹ پر بڑی توپ چیر تھا لیکن اس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ اپنا سامان بھی کل ڈیوٹی ادائے بغیر کبھی نہیں نکالتا۔ اس وقت اس کا رنگ فنی ہو گیا۔

”بات یہ ہے شیخ صاحب کہ آپ ہفتے کے روز میرے پاس پہنچ جائیں۔ میں آپکو سہولت کے ساتھ گودام میں سے سامان نکلوا دوں گا۔ وہاں عموماً تین تین مہینے سامان پھنسا رہا ہے۔ بس میں تو اسی قدر کر سکتا ہوں۔ باقی ڈیوٹی وغیرہ تو جس قدر مقرر ہے آپ کو ادا کرنی ہی ہوگی۔“

اب شیخ صاحب نجم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے کمرے کے آخری صوفے پر لے گئے میں خاموش بیٹھا رہا۔ کبھی کبھی لکھنویوں سے دیکھ لیتا۔ نجم کبھی ہر کھلتا نظر آتا کبھی ٹھوڑی۔ کبھی ابرو کھینچتا کبھی ناک میں انگلی پھیرتا۔ شیخ صاحب بڑے استقلال سے بیٹھتے تھے جیسے لکڑی کے بنے ہوں۔ ان کا ایک ہاتھ نجم کے کندھے پر تھا اور دوسرا اپنی تھوڑی میں پڑا تھا۔ ایک بار بھی ان کی جسمی زبان میں تلملہٹ گھبراہٹ یا شرمندگی کا اظہار نہ ہوا۔

جس وقت مسجد سے عشا کی اذان شروع ہوئی نجم صاحب رام ہو چکے تھے۔ وہ شیخ صاحب

کے ساتھ میرے پاس سے گزرے اور مدغم آواز میں بولے:
”بس اب آپ فکر نہ کریں شیخ صاحب! کہہ جو دیا سعیدہ میری بہن ہے۔ آپ کو فکر کی ضرورت نہیں۔“

پتہ نہیں سعیدہ کا سامان بغیر ڈیوٹی کے گھر پہنچ گیا کہ نہیں صرف نجم نے مجھے کیمہ اٹھا دینے سے انکار کر دیا۔

یہ مت سمجھئے کہ شیخ صاحب بگلا بھگت آدمی تھے۔ ان کی سلیٹ کل طور پر پڑھتی تھی۔ ان کی آمدنی میں کبھی ایک کوڑی بھی حرام کی شامل نہ ہوتی۔ وہ کبھی رشوت دینے یا لینے کے متکلب نہ ہوتے۔ وعدے کے پابند۔

حقوق العباد پر سختی سے کاربند

سارا معاملہ گواہ ہے کہ شیخ صاحب بڑے سچے آدمی تھے۔

یہ اور بات ہے کہ ان کی وجہ سے کئی ایسے سچے آدمی جھوٹ پر آمادہ ہوئے جو ابھی شیخ صاحب کی طرح سچے نہ بنے تھے (جو ابھی اپنے راستے پر مکمل یقین نہ رکھتے تھے راسخ العقیدہ نہ تھے۔

میں ابھی ابھی شیخ صاحب کے گھر سے آیا ہوں۔

وہ پلنگ پر ایسے پڑے ہیں جیسے کاٹھے اخروٹ کی لکڑی سے بنے ہوں۔ ناک انکھیں، ٹھوڑی، پیشانی سب میں موسموں کو بھیل لینے کی سختی ہے۔ اپنے مسک پر جے رہنے کا پختہ یقین ہے۔ عورتیں تو ضعیف الاعتقاد ہوتی ہیں۔ خواہ مخواہ سوچتی ہیں کہ شیخ صاحب جیسے آدمی سے بھی منکر کیر حساب لیں گے؟

حساب کتاب سے شیخ صاحب کا تعلق؟

اور پھر یہ بھی اعتقادات کی بات ہے۔

بھلا ایسے آدمی کا حساب کیا جس کی اپنی ہلیٹ بالکل صاف ہو۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ شیخ صاحب کی وجہ سے کئی لوگ جھٹک گئے۔ لیکن شاید ان لوگوں کو بہر کیف شاہراہ سے پکڑ ڈالوں پر اترنا ہی اترنا تھا! ایسے رنگ روٹ تو ہر وقت برائی کی تعلیم لینے کو تیار رہتے ہیں۔ اس میں بھلا شیخ صاحب کا حساب کتاب کیسا؟

کینخلی

میں اپنے برآمدے میں گھر کی گھنٹی بجانے کے بعد بالکل کسی مہمان کی طرح منتظر بیٹھا تھا گھر والے شاید سو رہے تھے۔

لوگ گرمیوں میں شام کے چار بجے عموماً سویا ہی کرتے ہیں۔ گھنٹی بجانے والوں کو یہ بات تو بھول جاتی ہے۔ وہ صرف اس قدر یاد رکھتے ہیں کہ اب تو چار بج چکے ہیں۔ ملنے ملنے کا وقت ہو گیا ہے۔ گھر والے بیدار ہو چکے ہوں گے۔ میں نے دوبارہ گھنٹی بجائی اور پھر اینگل آئرن کے غیر آسودہ صوفے پر بیٹھ گیا۔

شاید میری دونوں بیٹیاں اپنی ماں کے ساتھ شاپنگ پر گئی ہوں۔ بیٹا گھر کی خاموشی سے تنگ آکر ہمسائے میں کسی دوست کے گھر کیسٹ سننے چلا گیا ہو۔ رفیق ملازم تھوڑی تھا۔ وہ تو اس گھر کا چوہدری تھا اس لئے عین ممکن ہے کہ اس وقت وہ ریڈیو پر فل بلاسٹ لگاٹے پنکھے کو فل پیٹیڈ پر پلٹے بنیان پہنے لانی چار پائی پر فل ٹاس سو رہا ہو۔

لیکن یہ لوگ اگر جلتے بھی ہوتے۔ اگر میں گھر کے اندر داخل بھی ہو جاتا تو ایک عرصہ سے اس گھر کے لوگ کہیں چلے گئے تھے۔ میری بیوی اور بیٹیاں ایک ٹولہ تھیں۔ منگنیاں، شاویا، آمین، میلاد، مینا بازار، انارکلی، پینورا اسٹراٹ کے کئی سانچے کھاتے تھے۔ وہ تینوں آپس میں خوش تھیں۔ دونوں بیٹیوں کے ہمیز بن رہے تھے۔ کپڑے اور زیور کی باتیں میں نہ

تو رہتا لیکن جیسے ادنیٰ ٹیلی فون پر باتیں سنتا ہے۔ آدھا حاضر آدھا غائب۔ میری بیوی بھی سینگ کٹا کر پھڑوڑ میں شامل ہو گئی تھی۔ نئی تراشش کا لباس، نئی وضع کے بال، باتوں میں آزادی۔ تھقوں میں عجیب قسم کی بے حیائی..... بیٹیوں سے مستعار لی ہوئی جوانی۔ میری بیٹیوں کو مجھ میں صرف اتنی دلچسپی رہ گئی تھی کہ میں چیک لکھ کر دیتا رہوں اور وہ خرچ کرتی رہیں۔ باقی وقت وہ بازاروں میں اپنی ماں کے ساتھ گزارتی تھیں جو تھوڑا بہت وقت پیسوں کی طرح بچ جاتا اسے وہ ٹیلی فون پر صرف کر دیتیں۔

ساجد بے چارہ تھرڈ ایئر میں تھا۔ گم سم سا نوجوان۔ ابھی ٹھیک سے زندگی کے ساتھ سمجھوتہ نہ کر سکا تھا۔ اس کی موری بند جینز اور تولنے کے کپڑے کی بنیان تلے ایک دبلا سا جسم تھا۔ ہنسی کی ہڈیاں ابھری ہوئی اور آنکھوں کے نیچے گوشت دھنسا ہوا تھا۔ اس دبیلے پن کے باوجود وہ صبح پانچ بجے جو گنگ کرنے جاتا۔ اپنی ڈاٹ گنڈول کر نا فرض سمجھتا اور شام کو سوئنگ کے لیے چلا جاتا۔ اس کے مشغلے محدود تھے۔ موٹر سائیکل چلانا، کبیسٹ پر ڈسکو موسیقی سننا، رنبرٹ سے کوک پینا، آئس کریم کھانا، ٹیلی فون کھڑکانا، ٹیلی وژن دیکھنا اور دوستوں کو باپ کے سٹیٹس سے مرعوب کرنا۔ لیکن بیوی بچوں پر ہی کیا موقوف تھا پتہ نہیں شہر کے جملہ لوگ کہاں چلے گئے تھے۔ جلیو میرے جگری دوست خواجہ اور مظفر کی تو تبدیلی ہو گئی لیکن باقی میل ملاقات کو کیا ہوا۔ جہاں جہاں میں جوانی میں اپنی بیوی کے ساتھ باقاعدہ جانا کرتا تھا اب ان گھروں میں پانچ سات منٹ کے بعد گفت گو کے سگنل ہی آنے بند ہو جاتے۔ کچھ ایسے دوست احباب بھی تھے جن کے ساتھ میری بہت پرانی دوستی تھی لیکن یہ دوست جیسے کپڑا شریک ہو جائے تو فٹ نہیں آتا، یہ دوست بھی وقت کے ساتھ شریک ہو گئے تھے یا شاید میں ہی کسی اور سمت میں ٹکل گیا تھا۔

میں نے گھڑی دیکھی تو چھ بچ رہے تھے۔ گھنٹی بجائی اور جالی کے دروازے کے ساتھ کندھا لگا کر کھڑا ہو گیا۔

بنیان اور پاجامے میں ملبوس رفیق نے دروازہ کھولا۔

"آئیں سرجی۔ بڑی مزیدار فلم ہو رہی ہے۔ ہیر و کو مار پٹ رہی ہے۔"

"میں دو گھنٹے سے گھنٹی بجار ہا ہوں دروازہ ہی نہیں کھلتا۔"

"نیکم صاحب کہہ رہی تھیں کہ دروازے پر کوئی ہے۔ ہم سب سمجھ رہے تھے سرجی کہ فلم میں گھنٹی بجتی ہے۔ آجائیں آجائیں....."

رفیق مجھے دعوت دے کر پھر کوٹھے پر اوپر والے لاؤنج میں چڑھ گیا۔ غالباً سب ہی آ کر پر کوئی ہندوستانی فلم دیکھ رہے تھے۔ میں آہستہ آہستہ اپنے کمرے میں گیا۔ غسل کیا۔ کپڑے تبدیل کئے۔ اپنا پاسپورٹ ویزا اور ادرا میں سنبھال کر کھا اور پینگ پر لیٹ کر جب میں نے تکیہ تہ کر کے گدی کے نیچے رکھا تو اوپر کی فلم ختم ہوئی اور وہ سب سلپر گھسیٹتے ہنسنے ہنساتے گزریں پونچھتے میرے کمرے میں آ گئے۔ انہیں معلوم ہی نہ تھا کہ میں چائے کا آیا ہوا ہوں۔

"ویزا اکل ہو گیا....." بوڑھی نوجوان بیوی نے مسکرا کر پوچھا۔

"کس کس شہر کی اجازت ملی ابو....." بڑی بیٹی نے سوال کیا۔

"دھرم سالہ، گورداسپور، امرتسر....."

"ابو..... کیا کریں گے آپ دہاں..... ہمارے بغیر....."

"کم از کم آپ مجھے ساتھ لے جاتے ابو....." گہری آنکھوں والے ساجد نے قدر

غم سے کہا۔

لیکن میں تو ان سب کو ساتھ لے جانا نہیں چاہتا تھا۔ میں تو اپنے بچپن سے مصاخرہ کرنے اپنی ادنیٰ جوانی کی یادوں کو تازہ کرنے ان دوستوں سے ملنے جا رہا تھا جن کو میں ان گھروں سے بہت پہلے جانتا تھا۔ کوئی چیز کوئی جذبہ کوئی ایسی بات تھی جو مجھے بھین دلا رہی تھی کہ جس وقت میں دھرم سالہ کے کوٹوالی بازار میں بچپن کا تو ایک بار پھر میں زندوں میں سے ہوں گا۔ میرے پیر زہین پہ ہوں گے اور میں زندگی سے لائق نہ رہوں گا۔

میرے ارد گرد میرا خاندان ہندوستان کے متعلق سوالات کرتا رہا لیکن میں غیر حاضر تھا۔ میری نظروں میں وہ مناظر گھوم رہے تھے جن میں میرے شعور نے پہلی مرتبہ جنم لیا۔ جگسونا تھا، گھنیا را، اپر دھر سالہ، ڈل لیک، کیا اب بھی وہ مندر وہیں ہوگا جو کوٹوالی بازار کی چڑھائی سے نظر آتا تھا۔ کیا اب بھی صبح کے وقت دھولی دھار کا پہاڑ سفید برف کا کوٹ پہنے پہاڑوں کے پیچھے سے نظر آتا ہوگا وہ ساری وادی جس میں یول کیمپ آباد تھا۔ جو رات کے وقت دیوالی کی طرح جگمگاتی تھی، کیا اب بھی وہ وادی ویسے ہی ہوگی پیچھے بھیدی خانے کی آبادی کیا ویسے ہی ہوگی اپر دھر سالہ کے چوک میں کیا ناروجی کی دکان میں اسی طرح دھندلاتی ہوگی کیا گوروں کے قبرستان میں لارڈ اگیں کی قبر کے ارد گرد اب بھی ڈیپلیا کے پھول ہوں گے کیا قبروں کے ارد گرد بنی ہوئی روشوں سپلیٹی رنگ کی بھری پٹی نظر آئے گی

وہ مناظر زندہ تھے ان پر چڑھنے والا سورج اور غروب ہونے والی چاندرا تیں اب بھی سانس لے رہی تھیں۔ چڑھ کے اونچے اونچے درخت، مردت سے لدی ہوئی جھاڑیاں، سرخ پھولوں سے آگ بنے ہوئے بن کے درخت اور مڑکوں کے کنارے چمکیلی ہری کوٹوالی والی آکھ کی جھاڑیاں میں ان تمام مناظر میں لوٹ جانے کے لئے بے قرار تھا۔ ان مناظر میں، میں زندہ ہو سکتا تھا۔ یہاں سے وہاں تک کل ۲۴ سال کا وقفہ تھا۔ ان ۲۴ سالوں میں جو بھی واقعات ہوئے جن لوگوں سے میں ملادہ سب کچھ خواب میں گزارے ہوئے لحظات کی طرح تھے اور ان خوابوں کے پرے ایک حقیقت تھی ایک زندہ حقیقت

دھر سالہ اور اس کی نو عمری۔

اس نو عمری میں قنچی موڑ پر وہ مجھے ملی تھی پہاڑی لڑکی ایسی پہاڑی لڑکی نہیں جیسی فلموں میں ہوتی ہے بلکہ ایک پڑھی لکھی پہاڑی لڑکی جو شائستگی میں پڑھتی تھی۔ اور کوٹوالی بازار سے اوپر اس مڑک پر رہتی تھی جس سے ایک پگڈنڈی پردہ باغ کو جاتی تھی۔

اس کا چہرہ ہاتھ باز سب زرد زرد تھے۔ لہذا اس میں نام کو نہ تھا۔ موڑ کے بڑے پتھر پر وہ اکیلی بیٹھی تھی۔ شاید اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس جنگل میں بہت زیادہ بندر بھی رہتے ہیں کیونکہ وہ بڑی شائستگی سے ایک اونچے درخت کی لمبی شاخوں کو دیکھ رہی تھی۔ پیراجا تک ان لمبی شاخوں سے بندرا چل چل کر مڑک پر آئے گئے تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور شاید اس نے دل میں شکر یہ ادا کیا کہ میں مڑک پر چلا آ رہا تھا وہ مجھ سے دو تین قدم پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

اس کا ہر قدم مڑک پر نہیں میرے کہیں اندر پڑ رہا تھا۔ ہم دونوں میں عمر کا غالباً کچھ زیادہ فرق نہ تھا۔ تعلیم کا بھی نمایاں خالصہ نہ تھا لیکن ہم دونوں کے درمیان دو تین قدم کا فاصلہ ہمیشہ رہا۔ اس زمانے میں بہت قریب آنے کے اگر مواقع بھی مل جاتے تو حوصلہ نہ پڑتا۔ جب ہم دونوں کلب کے پاس پہنچے تو اس نے مڑک کے ساتھ ساتھ بہنے والی کول میں گم دھوئے میں مڑک کے دوسرے کنارے اس کی طرف پشت کر کے کھڑا رہا۔ گو میرا چہرہ نیچے وادی کی طرف تھا لیکن میں اسے اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ اس کے گفتنے ہاتھوں کے پھیلنے ہوئے ناخن، پنچوں پر اکٹھا جسم، سب میری نظر میں رہا۔

”میرا نام ریاض ہے۔“

میں نے ہوا میں کسی کو بتایا۔

”جیون۔“ اس نے مڑک کو اطلاع دی۔

”جیون؟ یہ کس کو جیون دینے کے لئے پیدا ہوئی ہے۔“

دھر سالہ میں چوڑا پونچھ کے بعد بارش ہوتی ہے۔ جولائی اور اگست کے مہینے میں سورج دیکھنے کے لئے ترستے ہیں۔ پندرہ دن کی بھڑکی لگتی ہے اور کہتے ہیں کہ گرلی اپنے انڈے بیٹتی ہے۔ اس دوران اگر سورج نکل آئے تو گرلی کے تمام انڈے تباہ ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد گرلا انڈے پر بیٹھتا ہے اور ایسی بھڑکی لگتی ہے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے سرکنے لگتے ہیں۔ لینڈ سلائیڈ ہوتے ہیں۔ کولیں پانیوں سے بھر جاتی ہیں اور گھروں کے اندر جوتے، ٹالین

اور بتردوں کو پھونڈی لگ جاتی ہے۔

جیون مجھے اسی ہی بارش میں بھگو گئی۔ وہ گرمیوں کا موسم گزارنے دھرمسالہ آئی ہوئی تھی۔ ستمبر میں پھر اسے شانتی نکلتی لوٹ جانا تھا۔ ان برساتوں میں وہ کئی بار مجھے سڑکوں پر ملی۔ ہر مرتبہ ہم دونوں نے اپنا اپنا تعارف کرایا۔

”مجھے ریاضت کتنے ہیں۔“

”جیون.....“

اس کے چلے جانے کے بعد مجھے پھونڈی لگ گئی۔ میں کئی بار اس کے گھر گیا ٹھیکیدار صاحب اور اس کے گھر والے مجھے بڑی محبت سے ملتے اور پھر جیون کی باتیں ہوتیں جو شانتی نکلتی ہیں پڑھتی تھی اور سادھنا پوس کی طرح ناچتی تھی۔

نہ میں نے شانتی نکلتی کے درشن کے نقشے نہ میں نے کبھی جیون کو ہی ناچتے دیکھا تھا۔ ہم دونوں تو اپنا اپنا تعارف کرانے سے کبھی آگے نہ بڑھ سکے لیکن بہت نہیں کیا بات بھی چونتیس برس گزر جانے کے باوجود ابھی تک اس تعارف کو گل کرانے کی آرزو مجھ میں کہیں دھڑک رہی تھی۔

اور پھر دھرمسالہ میں سریندر بھی تو تھا۔

ہم دونوں سکول اور کالج کے سکیڈائز تک اکٹھے پڑھتے سہے تھے۔ سریندر کا باپ وکیل تھا۔ اور گھنیا والی ساڈ پرکھڑے کے پار رہتا تھا۔ وہ اور میں ڈل کے میڈ پر اکٹھے جابیا کرتے تھے بلکہ بھاگسو اور ڈل ایک سے مجھے متعارف کرانے والا ہی وہ تھا۔

”سریندر..... سریندر۔“

وہاں وہ سب کچھ ہے جو یہاں نہیں ہے۔ وہاں جیون ہے۔ وہاں صرف ایک ایسا برآمدہ ہے جہاں کھڑے ہو کر گھنٹی بجانے پر بھی کوئی باہر نہیں نکلتا۔

اسی سب کچھ کی تلاش میں پاسپورٹ، ویزا، ہندوستانی کرنسی اور کئی واقف کاروں کے پیغامات لے کر میں ہندوستان روانہ ہوا۔ دل میں اپنے بچپن کے شہر کو دیکھنے کی آرزو دہن

کی طرح شرمائی شرمائی بیٹھی تھی۔

جس وقت میں لوہر دھرمسالہ کے بازار میں اترا تو پہلی بار میں نے عسوس کیا کہ وہ شہر جو میں بچپن میں دیکھ چکا ہوں غالباً یہ وہ شہر نہیں ہے۔ سب جگہ آباد تھی۔ نئے نئے پھرے، نئے نئے مگر، آوازیں..... ایسی آوازیں جو یہاں سے کبھی نہ آتی تھیں، آ رہی تھیں۔ مہذب انسان جہاں بھی جاتا ہے اتنا سارا شور مچاتا ہے جتنا ہے۔

دل کو سمجھایا، تب دھرمسالہ کی کل آبادی پانچ ہزار تھی۔ اب تیس پینتیس ہزار کے لگ بھگ ہے۔ شور تو ہو گا ہی..... اس میں دھرمسالہ کا قصور نہیں، لوگوں کا ہے۔ مناظر استعمال شدہ صوفے کی طرح تھے۔ جگہ جگہ سے روٹی جھانک رہی تھی۔ سبز رنگ ہو گئے تھے۔ آکھے کے درختوں کی شکل بدل گئی تھی۔ نہ بھاگسو تھا نہ ڈل ایک۔

ڈل ایک ایک گد لے پانی کی جھیل تھی جس کا سیف الملوک کے پانیوں سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔ صبح جب دھولی دھار نکلا تو اس کی اونچائی، ہیڈت اور خوبصورتی بھی مشکوک تھی۔ ہوٹل سے سارا وقت ایسی خوشبو اٹھتی تھی جس کا ناک عادی نہ تھا۔ میں پھرتا رہا۔

اجنبی مناظر میں..... اجنبی چہروں میں..... نفصا ہوا، درخت پہاڑ سب بدل چکے تھے۔ اسی طرح پھرتے پھرتے میں نے سریندر کو تلاش کر لیا۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ گھر بڑا تھا۔ اس کی بیوی پھر بھی کبھی اور بچے ماڈرن تھے۔ وہ سب بظاہر مجھ سے بڑی اچھی طرح سے پیش آئے لیکن ان کے چہرے پر ان کے دل کے اندر میرے خلاف کہیں کدورت تھی..... جیسے اس بیوی کے دل میں ہوتی ہے جس کا شوہر اسے چھوڑ کر نئی بیوی اپنالے۔

سریندر نے مجھے ہندوستان کی معاشی ترقی کے متعلق بہت کچھ بتایا۔ اس کی تان ہر بار اس بات پر ٹوٹتی تھی کہ دیکھو ہندوستان ڈیزل انجن بنانا ہے، پاکستان ایسے انجن بنا سکتا ہے۔ نہیں بنا سکتا۔

”ہندوستان اپنی موٹر کار بناتا ہے۔۔۔۔۔ تم کاریں اپورٹ کرتے ہو۔“
”کتنی بُری بات۔“

”ہندوستان ہر سال اتنے کارخانے لگاتا ہے۔“
”ہندوستان میں ہنگامی نہیں ہے۔“
”ہم لوگ ساڈھ ہیں وطن پرست ہیں۔“

میں سرنیدر کے پاس سارا وقت نہیں بیٹھا رہا بلکہ تھلے میں آیا بیٹھا تھا۔ اس کی تمام باتوں میں انکساری اور پیار کے باوجود ایک احساس برتری تھا۔ میں دوست سے ملنے گیا تھا۔ میری ملاقات ایک وطن پرست ہندوستانی سے ہوئی۔ وہ مجھے کئی جگہ لے گیا کئی کھانے کھلائے۔ کئی لوگوں سے ملایا۔

لیکن میری اس سرنیدر سے ملاقات نہ ہو سکی جس سے ملنے میں دھرم سالہ گیا تھا میں اس ملنداری سے ہاتھ ملانے نہیں گیا تھا جو ہندوستان کے باشندے بطور قومی ذمہ داری کے ہم سے استعمال کرتے ہیں۔ وہ اور میں اکٹھے رہے اور اس کے باوجود میں نے محسوس کیا کہ وہ کسی اور سمت میں بڑھ گیا ہے اور میں کسی اور سمت میں پھیل گیا ہوں۔ ہماری شناختیں آپس میں گتھم گتھا نہیں ہو سکتیں۔

سرنیدر سے ملنے کے بعد میں جیون سے ملتے ڈرتا تھا۔

لیکن پھر بھی میں ٹھیکیدار صاحب سے ملنے گیا۔

پہلا مکان ڈھا دیا گیا تھا۔ اس کی جگہ اب نیا ڈنگا تعمیر ہو چکا تھا اور ایک خوبصورت کوٹھی مڑک کے کنارے کھڑی تھی، بالکل گڑیا گھر۔ پہلے تو ان سب نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا لیکن پھر جیون اندر سے آئی۔

اس کی شکل، آواز، جسم کسی ہیڈ مسٹر کی جیسا تھا۔

چہرہ پورے چاند کی طرح گول اور ڈبل چین نے اس کو لانی کو تنچے سے بیضوی بنا دیا تھا۔

جسم پر کٹن کی خوبصورت ساڑھی تھی۔ ایسی ساڑھی جو پاکستان کی بیگمات بہت پسند کرتی تھیں بالوں کے جوڑے میں موتیے کی کلیوں کا ہار لپٹا ہوا تھا۔

”یہ جیون نہیں ہو سکتی۔“ میں نے اپنے دل میں کہا۔ یہ کسی کی جیون جوتی نہیں ہو سکتی۔ ایسی صورتوں اور جسموں والیاں تو جلتے دیئے بجھا دیتی ہیں۔ مجھے وہ جیون یاد تھی جس کا انک ایک ہوا کے جھونکوں نے زرد کر رکھا تھا۔ جس کی لمبی سیاہ چوٹی میں ہمیشہ ایک جھنگلی گلاب لٹکا ہوتا۔ ابھی گرا کہ گرا۔ جو شانتی نکلتی تھی جس کے جسم کے ہر بل میں زرت تھا۔

یہ موٹی، دبک، اونچی آواز میں بولنے والی۔۔۔۔۔ سارے گھر پر آؤں چلا نیوالی۔ کون تھی۔۔۔۔۔ کیا گھوڑے کے اندر سے گدھا نکل آیا؟ کیا پاکستان کی میٹھی بلی کو نکولیاں لگنے لگیں۔

”میرا نا آریا میں ہے۔“ میں نے بمشکل تمام کہا۔

”میں نے پہچان لیا ہے آپکو۔۔۔۔۔ اف شہریان آپ کتنے بدل گئے ہیں۔ بال بھی سفید کر لئے ہمارے۔۔۔۔۔ او۔۔۔۔۔ نینا، منوج۔۔۔۔۔ بھلا۔۔۔۔۔ انکل ریاض سے ملو۔۔۔۔۔ یہ بڑے ہینڈ سم ہوتے تھے۔ روکیاں نہیں گھوڑ گھوڑ کر دیکھا کرتی تھیں۔۔۔۔۔“

نینا، منوج اور بھلانے انکل ریاض پر نگاہ ڈالی اور پھر تعجب سے اپنی ماں کو دیکھا۔ تو یہ بڑی جزیلین بھی کتنے جھوٹ بولتی ہے۔ بھلا انکل ریاض کبھی ہینڈ سم ہو سکتے ہیں؟

میں کتنی ہی دیر وہاں بیٹھا سامنے وادی کی طرف دیکھتا رہا جہاں دریائے بیاس کہیں دُور ایک لمیر نظر آ رہا تھا، میں نے کئی بار کوشش کی کہ میں پینتیس سال پیچھے چلا جاؤں۔ کئی بار جیون نے چاہا ہو گا کہ وقت ایک بار پردہ اٹھا کر ماضی کی ایک جھلک دکھا دے لیکن ہم دونوں ایک ہی دستانے میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جس وقت میں ٹھیکیدار صاحب کے پہاڑی بیگلے سے باہر نکلا تو مجھے چڑھ کے درخت پر کسی سانپ کی لمبی کپنی نظر آئی۔ میں نے اسے احتیاط سے اتار کر ایک پلاسٹک کے لفافے میں بند کیا اور پاکستان لوٹ آیا۔

جس وقت میری بیٹیاں ہینڈ پرنٹڈ ساڑھیوں کے تحفے وصول کر چکیں۔ میری بیوی نے ڈائمنڈ کا کسٹ گلے میں ڈال لیا اور ساجد نے کھدر کا گزرتہ پا جامہ بغل میں داب لیا تو میری بیوی نے پوچھا:

"آپ اپنے لئے کیا لائے ہیں۔"

"ہاں بتائیے ابو۔ اپنے لئے کیا لائے ہیں آپ؟"

"ضرور کافی لائے ہوں گے۔"

"نیں نہیں کا جو۔"

"موتی سوپ۔ ہیں نا ابو۔ ان کا بھی صابن مشہور ہے۔"

"سپاریاں۔"

میں نے سوٹ کیس کے بیچے سے پلاسٹک کا لفافہ نکالا اور اس میں سے سانپ کی کینپلی نکال کر سب کو دکھائی۔ لڑکیوں نے کراہت سے اس کو چھوٹا اور میری بیوی نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا:

"میں یہ کینپلی لایا ہوں دھرم سالہ سے جیسے سانپ اپنی کینپلی میں دوبارہ داخل نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔ ایسے ہی کوئی شخص اپنے ماضی سے نکل آنے کے بعد پھر اس میں داخل نہیں ہو سکتا جب جوانی، بچپن، شہر، لوگ۔۔۔۔۔ دوست، محبوبائیں چھوڑ جاتی ہیں تو پھر ان سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔"

میرا خاندان ہمیشہ کی طرح میری باتیں سمجھنے سے قاصر رہا۔

صرف ساجد نے کینپلی کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا: "ابو اسے میں رکھ لوں اپنے کمرے میں۔ میرے دوست بڑے امپریس ہوں گے۔"

کیمیا گر

بابا خیر بہت کم اس قصباتی بازار کی طرف آتا تھا لیکن جب کبھی وہ آتا دکانوں کی رونق بڑھ جاتی۔ اونگھتے دکاندار اونچی آوازوں میں ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگتے۔ سید و نقباء بغد سے قیمہ بنتے ہوئے فوہ لگاتا:

"اومے بابا خیر و چلا آرہے۔۔۔۔۔ بابا خیر۔۔۔۔۔ دینے پہلوان بابا خیر دی تو ہے۔۔۔۔۔ دیکھتا نہیں۔"

دینا باطمی پسناری بھی تھا اور آڑھت کی دکان بھی کرتا تھا۔ بابا خیر کو نمکڑی لگی میں سے ابھرتا دیکھتا تو اس کی باچھیں کھل جاتیں۔ چھوٹی سی دکان کی متفرق اشیاء پر جھگم جھگم سی نظر ڈالتا ہوا مکڑی کی سریرھیوں پر آکر کھڑا ہو جاتا اور باوا ز بلند کرتا: "شیخ جی شکبجہ پھر کس لینا۔ ادھر دیکھیں کون چلا آرہا ہے۔"

لیکن شیخ صاحب کبھی نظر اٹھا کر خیر و بابا کی طرف نہ دیکھتے۔ دکان کو لمبی سے جھٹاتے جلتے ابری کو انگلیوں سے ہموار کرتے اور رشید کو متنبہ کرتے ہوئے کہتے: "بیٹا رشید۔ دیکھ گتا ٹھیک کاٹنا۔ تو ایسی کاٹ اٹا ہے کہ مجھے پھر کتر بیونت کرنی پڑتی ہے اور انچ انچ گنا ضائع ہو جاتا ہے۔ پیسہ دو پیسے کی اس بھی ٹوٹ جاتی ہے۔"

لیکن جلد ساز کا بچہ رشید قینچی اور گتے کو زانو پر رکھ کر ٹاٹ ایک طرف کرتا اور دینے



کی دکان پر نظر بنالیتا۔ دینے کی کتنی ساکھ تھی سبھی اسے بھاگ بھاگ کر ادھار دیتے تھے۔ شام کو نفع نقصان کا پڑتا لگنے بیٹھتا تو سکوں کی کھنکھنی آواز دھونک آتی۔ اور تو اور بابا خیرو بھی ہمیشہ دینے ہی کی دکان پر آتا۔ جلد ساری دکان پر تو سکول کے وہ ماسٹر ہی آیا کرتے تھے جن کی عینک کی کافی ٹوٹی ہوتی تھی اور پاؤں میں اکھڑے ہوئے بڑے فلیٹ بوتے ہوتے تھے۔ دینا کی دکان کی دائیں طرف مولانا بخش موچی اپنی صندوقچی منادکان میں رہتا تھا اور بائیں جانب حلوائی کی دکان تھی۔ بابا خیرو کا نام سنتے ہی مولانا بخش آرا اور ستالی چھوڑ گئے کو کھسک آتا اور ہنس کر کہتا: "دینے تیری ہٹی پر تو بھروسہ ہے بھئی۔ بابا خیرو بھی آئے گا تو تیری چوٹ پر ہی آئے گا۔ ہمیں اس بندہ میں کون پوچھتا ہے؟"

چھاپو حلوائی گھان میں ہاتھ ڈالتا۔ کڑکڑتے تیل میں پکڑے چھوڑتا اور چپک کر کہتا: "کبھی دو پیسے کے پکڑے تک ہم سے نہ لے ہم بابا خیرو کا کیا یاد کریں گے بھلا؟"

دینا ہنستا رہتا اور بابا خیرو کا منتظر رہتا۔ بابا خیرو اس قصبے کا سب سے پر امر شخص تھا۔ وہ قصبے سے دو میل دور۔ دیں کے پھاٹک کے پاس رہتا تھا۔ قصبے کی آبادی کے لئے وہ ایک معے سے کسی طرح کم نہ تھا۔ ایک آنکھ پر سبز کاغذی اندھیری ہوتی۔ مٹی کا سنی صدی کی جیبوں میں بہت سے رقعے اور نسخے جمع رہتے۔ یوں لگتا جیسے بابا خیرو نے جیبوں میں گیندیں چھپا رکھی ہیں۔ بابا خیرو لنگڑا ہوا دینے کی دکان تک پہنچتا۔ اپنی چھوٹی جیب کو ٹوٹا اور سبز تھم کو احتیاط سے سنبھالتا ہوا سیڑھیوں پر بیٹھ جاتا۔ بابا خیرو الف لیلی کی داستان تھا۔ وہ اس بازار میں لکھنٹ بادشاہ بن کر کبھی داخل نہ ہوا بلکہ وہ تو دھیلے پیسے پر جھگڑتا تھا پھر بھی اس کی باتوں میں جادو تھا۔ وہ مٹی کو صونا کرنے کا فن جانتا تھا۔ اس کی پر امر شکل۔ اس کا انداز گفتگو اتنا مختلف تھا کہ دکانداروں کی اس بستی میں بچل بچ جاتی۔ یہاں صبح سے شام تک خون پسینہ ایک کرنے والوں کا گردہ پیسے پیسے کے لئے سرگرداں رہتا۔ جب بابا خیرو جیبوں میں نسخے چھپائے دینے کی دکان پر چڑھتا تو ان لوگوں کو اپنی نگ دو پریشانی ہونے

لگتی اور وہ بھی سوچنے لگتے کہ کاش پیسے بنانے کا کوئی سہل نسخہ ہاتھ آجاتا تو وہ بھی ہاتھ پر ہاتھ دھر کر آرام سے بیٹھ رہتے۔ نہ کوئی فکر رہتا نہ فاقہ۔

دینے کی دکان پر بیٹھ بڑھ جاتی۔ سید و قصائی بغدا، چھری اپنے شاگرد کے سپرد کر کے آ بیٹھتا۔ بھیری والا اپنا ریڑھ پاس کھسکلاتا اور مولانا بخش فری کے چمڑے کو پرکھنا چھوڑ کر پوچھتا: "کیوں بابا آج پھر نسخہ بنوانے آئے ہو جی؟"

بابا خیرو مولانا بخش کی بات کا جواب کبھی نہ دیتا۔ اور کہتا: "دینے مجھے جلدی ہے مگر سودا دینا ہے تو دوسرے دن میں چلا۔"

چھاپو حلوائی کی کڑاہی میں سے تازہ پکڑوں کی خوشبو مٹکتی اور سارے بازار کو لپیٹ لیتی۔ وہ ہنس کر پوچھتا:

"بابا خیرو۔ میں نے تو سوچا ہے اب یہ دھند نہ کروں گا۔ اگر تو اپنے ساتھ لگالے تو نورجائیں قسم اللہ کی پیراں والے کے دروازے پر پھولوں کی چادر چڑھاؤں۔ سنا ہے تو نے چاندی بنا کر شہر میں نہ بچی ہے۔ چاندی بنا لیتا ہے بابا خیرو۔ بتاناں!"

بابا خیرو ایک آنکھ سے گلے مڑے کاغذ کو ٹول ٹول کر پڑھتا اور پھر دینے سے مخاطب ہوتا۔ "ہڑتال درقیہ دو تو لے۔۔۔ دیکھ بچلی بار کھائی ٹھیک نہ تھی۔ ساری محنت اکارت گئی۔"

دینا نا نو پر کھنی جاتا اور ہاتھ بھر تازہ زردور کتے ہوئے کہتا: "تو خود جو کھلے بابا خیرو تیری اپنی دکان ہے تجھ سے فرق کی بات کبھی کی ہے؟"

مولانا بخش کے جی میں ہڑتال درقیہ کا نام سن کر کھد بھڑ ہونے لگتی۔ وہ بابا کی بے نیازی کو صبر کر پوچھتا: "کیوں بابا خیرو۔ کیا کبھی کچھ بنا بھی ہے یا یونہی ٹامک ٹوٹیاں مارتا پھرتا ہے۔" بابا خیرو لمحے جھک کر تازہ زردور سے نظریں ہٹا کر مولانا بخش کو گھورتا۔ پھر کہتا۔ "اور تیری طرح سارا دن بیٹھا ادھوڑی کے جوڑے نہیں سیتا رہتا۔ باریک کام کرتا ہوں باریک کام۔ تیری

خود کا غنہ بن گیا ہے.....“

سب دکاندار ہولے ہولے ہنسنے لگتے۔

لیکن رشید کی ناک پر پسینہ آجاتا۔ وہ سوچتا آبا دینے کی دکان پر کیوں چہا نہیں جاتا۔ گھڑی دو گھڑی اگر گپ بازی ہو بھی گئی تو کون سی قیامت آجائے گی۔ جب کبھی بابا خیر و آتا وہ ٹاٹ کا پٹ میر کا کراسے دیکھتا رہتا اور وہ تمام باتیں بھی سنتا جو دینے کی دکان پر ہوتیں۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ چینی پھینک کر دینے کی دکان پر چڑھ جائے اور بابا خیر و کے پاؤں پکڑ لے لیکن ساتھ بیٹھا ہوا بابا بالکل ویسا پھاٹک بن کر مانع ہو جاتا جو بابا خیر و کی بھونپڑی کے کچھ ہی فاصلے پر پڑیوں کے ادھر کھڑا تھا۔

بابا خیر و کو رشید نے پہلی بار اسی پھاٹک کے قریب دیکھا تھا۔ رشید ان دنوں گلی سے نکل کر بڑی مسجد میں پڑھنے جاتا تھا۔ بسترہ بغل میں داب کر تھنٹی بھلاتا وہ اور اس کا ساتھی فقیہہ کبھی کبھی ریل کا نظارہ کرنے مسجد ہی سے غائب ہو جاتے۔ میل دو میل پیدل چلنے کے بعد جب انہیں ریل کا پھاٹک نظر آتا تو وہ دونوں بھاگنے لگتے۔ شہر کو جانے والی گاڑی کیساتھ ٹنکی ہوئی خلقت کھڑکیوں میں سے بھاگتے ہوئے چہرے، اگاڑ کا جھکے دل و ڈبہ ان کیلئے کتنی پراسرار چیزیں تھیں۔ سیٹی بجاتا باپ پھوڑتا، آج کل جب دور افتی میں غائب ہو جاتا تو وہ دونوں خود آج کل بن کر دیر تک پڑیوں پر کھیلنے رہتے لیکن انہیں روز روز گاڑی دیکھنا نصیب نہ ہوتی۔ کیونکہ ان کے قصبے سے پڑی خاصی دور تھی اور گھر پہنچنے تک اندھیرا ہو جاتا تھا۔ جس روز بھی رشید گاڑی دیکھ کر لوٹا شیخ جی کے ماتھے پر بل پڑ جاتا۔ وہ شیشے کی موٹی عینک ناک پر پھنسائے قبر بھری نظروں سے اسے گھورتے اور پھر انگوٹھے اور شہادت کی انگلی میں کان پکڑ کر کہتے:

جگہ میں ہوتا تو پھانہ لگا کر کسی دن جوتی کی جگہ اپنی کھوپڑی ہی چوڑی کر لیتا۔“
مولا بخش پر ان باتوں کا کبھی کچھ اثر نہ ہوا تھا۔ وہ اپنے ہاتھی جیسے دبلے تیشہ پنجاب پر جا کر ہولے ہولے ہنسنے لگتا۔ پھر ریٹھے والا اندیر اپنی چلم بابا کو پیش کرتے ہوئے کہتا:
”بے بابا کش لگا کش۔ حق کے دمرے ہیں۔ نشتے کا نشہ باجے کا باجر۔ جلتزنگ بخت ہے میرے حقے میں۔“

دینا بڑھ کر گڑ گڑی پکڑ لیتا اور بابا خیر و کو پیش کرتے ہوئے بول اٹھتا: ”بابا تو پورا چلم چٹ ہے۔ ایک منٹ میں چلم گل بن جاتی ہے ساری کی ساری۔“
بابا منہال منہ سے لگاتا تو دم بھر کونسنہ بھول کر باتیں کرنے لگتا۔ اس کی بانوں میں بڑی ترنگ آجاتی۔ وہ کہتا:

”جب جان تھی تو حقہ پیتا تھا۔ اب تو دل ہلا لیا کرتا ہوں۔ نہ کبھی سنے کا دم لگا یا نہ کبھی چرس پی۔ خالی مولی دھوئیں میں کیا دھڑلے۔ بے بھائی دینے جلدی سے دو تولے ورق چاندی کے تو تول دے مجھے دیہ ہوتی ہے۔“
اب دینا لاڈ بگھار کر کہتا: ”جا پھر بابا کچھ نہیں دوں گا تجھے کھٹے گاؤں سے آتا ہے تو بھی۔ دو گھڑی بیٹھ بانیں کر۔ پھر چلے جانا۔ سچ پنج تو نے چاندی بنا کر بیچی تھی نا؟ سنا، گورنمنٹ تیرے پیچھے لگی رہتی ہے۔“

بابا منہ سے منہال نکال کر سرخ رنگی داڑھی میں انگلیاں پھیرتا اور کہتا: ”اے چاندی بنانا کیا مشکل ہے۔ یہاں تو چکر ہی اور چل رہا ہے۔ دیکھو جو خدا کو منظور ہوا تو ایک دن تم سب میں موتی بانٹنے آؤں گا۔“

کلفی نیچنے والا لڑکا ایک لخت بول اٹھتا: ”اور مجھے نہ بھول جانا اس دن بابا خیر و ہم بھی تیری رعایا ہیں۔“

پھر دینا دبی زبان میں طنز کرتا: ”بیچارے شیخ کو بھی یاد رکھنا۔ بے چارہ گناہاں بھاتا جاتا

”گدھے! میں اپنی گاڑھے کی کماٹی تجھ پر صرف کر رہا ہوں اور تجھے گھومنے پھرنے کا چسکا پڑ گیا ہے۔ جلد سازی کی اولاد ہے بنے دینے کی نسل نہیں کہ تجوری میں سے توڑے۔ نکال نکال کر ضائع کرتا رہوں گا۔“

لیکن ایسی جھڑکیوں کا رشید پر کچھ بھی اثر نہ ہوتا۔ اس کی نظروں میں تو انہن کے گھومتے پھرنے، دوسرے کو کتے ہوئی سیٹی اور ریل کا پھانک گھومتا رہتا۔ باپ کی بھڑکیاں کھٹاکھٹیں کہیں کھوجائیں اور رشید گاڑی پر چڑھ کر شہر پہنچ جاتا جہاں اونچی اونچی عمارتیں، سینما گھر اور لمبی لمبی کاریں تھیں۔

کبھی کبھی جب فقیر اور رشید لائن پر پہنچتے اور بڑی دیر تک ریل گاڑی نہ آتی تو وہ دونوں پٹری سے پتھر اٹھا اٹھا کر دور دور پھینکتے گتے اور ایسے میں رشید اور فقیر بے پر علمیت کا دورہ پڑ جاتا۔

رشید کہتا: ”براہ راست انتظار شدید الموت“

فقیر اہستہ ادرکتا: ”دریں چہ شک؟ دریں چہ شک؟“

تھوڑی دیر بعد رشید پھر کہہ اٹھتا: ”بھائی! انتظار شدید الموت“

اب فقیر نے کو غصہ آجاتا اور وہ کہتا: ”کوئی اور محاورہ نہیں آتا تجھے..... لاقتضو“

..... لاقتضو.....

رشید بھی پھر جاتا اور جھٹکا پوچھتا: ”اچھا تجھے کوئی اور محاورہ آتا ہے۔“

”ہاں ہاں! فقیر لائن پتھر سے بجاتا ہوا کہتا اور پھر بڑی سوچ بچار کے بعد بات کرتا:

”انگھتے کو ٹھیلے کا ہانہ۔“

اس محاورے کو سن کر رشید ہمیشہ گہری سوچ میں پڑ جاتا اور چونکہ فقیر اس کا شاگرد تھا

اسی لئے وہ اسی سے پوچھتا: ”فقیرے یار! یہاں ٹھیلے کے کیا معنی ہیں۔“

فقیر نے کو دنیا جہاں کے علموں سے واقفیت تھی۔ نیلی چڑیا کے انڈے چرانے کا طریقہ وہ

جانتا تھا۔ بخارات سے انہن کیونکر چلتے ہیں اور کیسے چلتے ہیں؟ ان کے متعلق اسکی معلومات بڑی وسیع تھیں۔ مسجد کے مولوی صاحب کو نسا خضاب لگاتے ہیں اور خضاب بنانے کی کو کوئی ترکیبیں ہو سکتی ہیں ان کے بارے میں بھی وہ لمبی چوڑی تقریر کر سکتا تھا لیکن جب رشید اس سے محاوروں کے معنی پوچھتا تو وہ گڑ بڑا جاتا اور کہتا: ”ٹھیلے کے معنی ہیں ٹھیلہ پر جانا اور کیا؟“

”یعنی یہاں کیا معنی ہونے؟“

فقیر ابد محاسن سا ہو جاتا اور جلدی سے بیان کرتا: ”جب ٹھیلے پر سوار ہو تو اونگھ آجاتی ہے اور آدمی گر جاتا ہے یعنی اونگھتے کو ٹھیلہ گرنے کا ہانہ ہو جاتا ہے۔“

”اچھا۔“ رشید معنوں پر غور کرتا۔

فقیر موضوع کو بترکے ساتھ دور پھینک کر کہتا: ”الانظر! شدید الموت“

اب رشید کو موقع ملتا اور وہ شہنی بگھارتا ہوا چلتا: ”لاقتضو..... لاقتضو“

اور بار بار ایسا ہوتا کہ دور سے ریل گاڑی کے پیچھے لاقتضو کا ورد کرتے فضا میں بھنبھنا، سی پیدا کرتے سنائی دیتے۔ ریل کا پھانک بند ہو جاتا۔ رشید اور فقیر اپنے اپنے اور تختیاں سنبھال گاڑی کے انتظار میں بہت بن کر کھڑے ہو جاتے۔ لیکن ایک دن گاڑی بہت لیٹ ہو گئی تھی۔ فقیر اگھر سے ایک پیسہ چرا کر لایا تھا اور انہوں نے یہ پیسہ لائن پر دس جگہ جما کر اٹھا لیا تھا۔ انہیں اُس دن گاڑی کا کتنا انتظار تھا۔ گاڑی آتی پیسہ پکٹتا تو پھر کہیں ان کا تجربہ صحیح نکلتا۔ وہ چلتے چلتے پھانک کے بہت قریب آگئے تھے۔ شام کے دھندلے میں پھانک کے چوکیدار کی کڑکڑی کے پھول چمک رہے تھے اور دور سٹیشن کی بتیوں کی روشنی مدھم سا بیولا بنی فضا کو منور کر رہی تھی۔

اس دھندلے میں سٹیشن کی طرف سے ایک اتنی عین پٹری کے درمیان میں سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ یہ اتنی دلیں پاؤں کو دبا کر لنگڑاتا ہوا چل رہا تھا اور اس کی تہہ ہوا میں

اڑ رہی تھی۔ فیقرا اور رشید خواہ مخواہ گھبرا کر ایک بھاڑی کے نیچے پھوپ گئے۔ بابا خیر وین پٹری کے وسط میں ابھرتا آیا۔ اس کی ہندی رنگی داڑھی سیاہ نظر آرہی تھی اور وہ اپنے آپ سے باتیں کئے جا رہا تھا۔ جب بابا ان سے کچھ فاصلے پر پہنچ گیا تو فیقرانے رشید کو کہنی ماری اور پیچھے چلنے کا اشارہ کیا۔ بابا خیر وین بھاڑی سے نکلا اور کچی سڑک پر ہولیا۔ فیقرا اور رشید جو نہی بھاڑی کے دوسری طرف پہنچے چوکیدار نے بھاڑی بند کر دیا۔ دُور مضامیں لا تقصو پکار رہی ہوئی گاڑی کی بھینٹنا ہٹ، بلند ہوئی۔ لیکن آج ان کے سامنے ایک نئی کہانی تھی۔ ایک گاڑی سے بھی پراسرار شخصیت ننگرائی چلی جا رہی تھی۔ انہیں تو یہ بھی بھول گیا تھا کہ لائن پر فیرے کا اگوتا پیشہ انجن کے انتظار میں ہوئے ہوئے لڑ رہا تھا۔

بابا خیر وین نے اپنی کوٹھڑی کلپٹ بند کر لیا تو رشید اور فیقرانے درز میں سے جھانکنا شروع کیا۔ اندر اندر تھا اور بابا خیر وین بدروح کی طرح ادھر ادھر منڈلا رہا تھا۔ پھر چلے پر مٹی کا دیا جلا۔ بابا خیر وین نے چٹائی پر بیٹھ کر اپنی جیبوں کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ چٹائی پر تنگی تنگی پٹریوں کا ڈھیر لگ گیا۔ پھر بابا خیر وین نے کہیں سے ایک پرانا ترازو نکالا اور ایک ایک پڑیا تو لے لگا۔ انجن کی آواز اب بہت بلند ہو گئی تھی اور اس کی گڑگڑاہٹ جھلا کر انہیں پکار رہی تھی۔ وہ دونوں لائن کی طرف بھاگے۔ چمکتے ہوئے جگنوؤں کی قطار بہت دور نکل چکی تھی۔ مضامیں غبار تحلیل ہو چکا تھا لیکن چمکتی لائن پر پھیلنا ہوا پیسہ پڑا تھا۔ ان دونوں کو بابا خیر وین بھول گیا اور وہ خوشی سے اچھلنے لگے۔

دوسرے دن وہ دونوں لائن پر نہ جاسکے لیکن رشید کے دل میں پچھلی سی ٹپی تھی۔ وہ کہہ اس کے ذہن میں بابا خیر وین کی تصویر ابھرتی رہی۔ وہ ساری رات بابا خیر وین کے متعلق سوچتا رہا جو دیکھ دونوں کان اباجی کی تواضع کے باعث در در کرتے تھے لیکن بابا خیر وین کا پراسرار وجود

ان کی طرف تو جبر بھی نہ کرنے دیتا تھا۔ رات بھر وہ عجیب عجیب خواب دیکھتا رہا۔ جیسے مدغم دیا جلا کر وہ غاروں میں پھرتا رہا ہوا اور کوئی بدھ لالٹھی اٹھائے اس کے تعاقب میں بھاگ رہا ہو اس خواب نے کئی صورتیں اختیار کیں لیکن اس خوف کا تانا بانا قائم رہا جو اس کے دل کو گھیرے ہوئے تھا۔

مسجد میں سورہ مزمل کو رٹتے رٹتے وہ رک گیا اور فیقرا سے پوچھنے لگا:

"یاروہ آدمی کون تھا؟"

"کون سا آدمی؟" مولوی جی کی نظر پچا کر فیقرانے جواب دیا۔

"وہی کل شاوالا؟"

"وہ تو بابا خیر وین ہے۔ ہماری دکان پر آتا ہے۔"

مولوی صاحب غیر متوجہ دیکھ کر گرجے: "ارے خیر وین! گھر سے یہاں باتیں کرنے آئے ہو؟ ابھی مرغابنا دوں گا تو سب باتیں اڑن چھو ہو جائیں گی۔ پتہ نہیں انہیں ایسی کونسی ضروری باتیں کرنا ہوتی ہیں۔ کیوں بے بنیے کی اولاد۔ کیوں بھکا رہا تھا اس ٹٹ پونجے کو؟" کچھ نہیں جی۔" فیقرا مننا یا۔

"اب جو آواز آئی تو اٹنا لٹکا دوں گا۔" مولوی صاحب گرجے۔

رشید نے پھر سورہ مزمل کو لمبی لمبی آوازیں لگا کر پڑھنا شروع کیا لیکن اس کی نظروں کے سامنے پھر بھونپڑی اور بابا خیر وین آگئے۔ وہ فیقرے کو کہنے مار کر بولا:

"یار تمہاری دکان پر بابا کیا کرنے آتا ہے۔"

میں نے بساطی کے لٹکے فیقرے نے گردن اٹھا کر فخر سے کہا: "سو دلیسے آتا ہے اور کیا؟"

"کیسا سودا؟"

"بعد میں بتاؤں گا۔" مولوی صاحب دیکھ رہے ہیں۔

اتنے میں مولوی صاحب نے انہیں لٹکارا۔ دو دو دھولیں گدی پر جمائیں اور مکتب کے تمام بچوں کے سامنے مرغلابٹنے کا حکم صادر کر دیا۔

شام کو جب وہ دونوں گھر کی طرف پلٹ رہے تھے تو رشید کے لبوں پر سوالوں کی بوچھاڑ تھی فقط فقیر بیٹے کا موڈ خراب تھا۔ اسے رہ رہ کر مولوی صاحب کی جھڑکیوں پر غصہ آ رہا تھا۔ اس کا لبہ چلتا تو مولوی صاحب کو چٹکی بھر زہر کھلا دیتا۔

بسترہ جھلاتے ہوئے وہ بولا: "مجھے ایک عمل آتا ہے اگر چالیس دن پڑھیں تو پھر جس کسی پر پڑھ کر پھونک دیں بس وہیں جسم ہو جاتا ہے۔ اس کی راکھ تک نہیں ملتی۔"

اگر کبھی پہلے دن ہوتے تو رشید کا تجیل بھڑک اٹھتا لیکن اس دن تو اس پر بابا خیر سوا تھا۔ اس نے سنی ان سنی کر کے کہا:

"بابا خیر و تمہاری دکان پر کب آتا ہے۔"

"کبھی کبھی آتا ہے۔ مولوی صاحب کی کیا ساط ہے۔ بڑے بڑے اس عمل کے سامنے ٹھہر نہیں سکے لب پڑھنے کی دیر ہے جتنی دیر یہ عمل کریں ناں تو ایک سہو چادر باندھ کر کسی کھجور کے پیڑ تلے چلے کاٹنا پڑتا ہے۔"

"کیوں آتا ہے بابا خیر۔"

"نسخہ بنوانے اور کیا؟"

"چاچا دینا علاج بھی کرتا ہے کیا؟" رشید نے پوچھا۔

"علاج؟ کیوں علاج کیا؟"

اب رشید نے خفیف ہو کر کہا: "خود ہی تو کہہ رہا تھا کہ بابا خیر و نسخہ بنوانے آتا ہے۔"

فقیر اذیر تک ہنسا رہا۔ مولوی صاحب کی بخشی ہوئی بے عزتی کا ردنا ڈھل گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ ابھی اس سے بھی گھٹیا اور ذلیل لوگ دنیا میں زندہ ہیں۔ اس نے جب ہنس

میں کر تکی ہو گئی تو بولا: "ارے گدھے! وہ کوئی بیمار فقیر ہی ہے۔ وہ تو دوسری طرح کے

نسخہ بنوانے آتا ہے۔ جادو کے نسخے..... گندے تعویذ کی چیزیں لینے آتا ہے بابا خیر۔"

"ہیں؟"

"اور کیا بابا خیر تو جادو گر ہے..... بڑے بڑے جن اس کے تابع ہیں۔ چاہے تو راتوں رات مولوی صاحب کی چار پائی اٹھا کر قبرستان میں پہنچا دے چاہے تو تمنا کے قبضے میں لال آئندھی آجائے۔"

"اچھا؟"

فقیر اور بھی چھوٹنے لگا..... "اور کیا۔ میرا چاچا باتیں کیا کرتا ہے چاچا کہتا تھا کہ ایک دن بابا خیر و نے مٹی کو ہاتھ لگایا تو وہ چاندی بن گئی اور پھر وہ یہ چاندی لے کر نیچے شہر چلا گیا۔"

رشید نے پریشان ہو کر پوچھا: "تو پھر بابا اس جھوٹی مٹی میں کیوں رہتا ہے۔ اپنی کوٹھی کیوں نہیں بنوا لیتا تحصیل دار صاحب کی طرح....."

فقیر نے قہقہہ لگایا اور ہنس کر بولا: "مولوی صاحب ٹھیک کہتے ہیں ہے تو ٹوٹ پڑنا ارے یہ جادو گر غنی ہوتے ہیں غنی..... انہیں ٹھکر ہوتا ہے اپنے کام کا..... چاچا کہتا ہے اگر یہ مودہ مایا میں پھنس جائیں تو پھر قدرت جاتی رہتی ہے۔"

"مودہ مایا۔ وہ کیا؟"

فقیر نے دینے کی بات کو دہرا کر گویا اپنی فطرت کا ثبوت دیا تھا اب لڑکر کہنے لگا:

"مودہ مایا ایک چیز ہوتی ہے۔ ابھی تو بہت چھوٹا ہے تجھے ان چیزوں کی سمجھ نہیں آ رہی۔ رفتہ رفتہ آتی سمجھا جائے گی۔"

رشید فقیر کے کی بات سن کر اپنے قد اور عمر کو دل ہی دل میں کوستا چلنے لگا لیکن بابا خیر و کو دوبارہ دیکھنے کی تمنا اور بھی جوان ہو گئی۔

ڈالے گا۔ پٹھانے کا کھانے کا لیکن تیرے جی میں آتی ہوگی کہ باپ کہیں مرے تو اس کے نانوں کو ڈبوئیں۔۔۔۔۔ مولوی صاحب نے مارا تو کیا بڑا کیا تیرے بھلے کی ہاتھ ہوں گے بے چارے۔۔۔۔۔ تیری ماں آج زندہ ہوتی تو میں پوچھتا۔ کہنتی تھی کہ میرا بچہ تو تحصیلدار بنے گا۔ یہاں مکتب ہی سے اٹھنے کی صلاح بن رہی ہے۔ دوبارہ اگر مولوی صاحب کی شکایت کی تو دھک کر رکھ دوں گا۔۔۔۔۔ کھانے پینے کا لاڈ ہوتا ہے پہنے اور نہنے کا لاڈ ہوتا ہے لیکن اولاد کو بگاڑنا کون سا لاڈ ہے۔ بیٹھ جا ابھی اور سنتی مکھ۔

مولوی صاحب کے ساتھ ساتھ باپ کو بھی دل میں کوستا رشید اٹھا اور تختی دھونے بیٹھ گیا۔

فقیرا تو سات دن سے بنات حاصل کر چکا تھا لیکن رشید کو روز روز مرغابنا پڑتا تھا۔ اس روز وہ ظہر کی نماز کے وقت مسجد سے کھسک گیا۔ سب سے بڑا دھڑکا اسے اس بات کا تھا کہ اگر شیخ جی نے بازار میں دیکھ لیا تو پھر خیر نہیں لیکن دل میں ٹھان چکا تھا کہ آج تو فقیرے سے وہ عمل پوچھ کر ہی اوکں گا جس سے لوگوں کو ہمس کر نے کی طاقت اپنے میں آجاتی ہے۔ وہ بازار کی کمثر پر بزاز کی دکان کے پاس بڑی دیر تک چھپا رہا۔ شیخ جی نے جب نماز کے لئے دکان بند کی تو اسی وقت ایک چھوٹی سی کار عین اس کے باپ جلد ساز کی دکان کے سامنے آکر رک گئی۔ رشید اچھی طرح دیکھ نہ سکا کہ شیخ جی رخصت ہو گئے کہ ابھی کھڑے تھے گا کہ سب سے باتیں کر رہے ہیں۔

تنگ بازار میں چھپتا چھپتا وہ دینے کی دکان تک پہنچا۔ کالی کاری اڑے کر اُس نے ایک بار باپ کی دکان پر نظر ڈالی۔ دکان کے تختے بند تھے۔ سٹنٹ سیڑھیوں پر رنگین کاغذوں کی کچھ کتیں بھری پڑی تھیں اور ٹاٹ کا ساٹبان ہوا میں جھول رہا تھا۔ وہ ایک دکان پر چڑھ گیا۔ سٹنٹ ہاتھ میں ترازو سنبھالے فقیرا بڑی چابکدستی سے کچھ تول رہا تھا اور ننھی لڑکی روکن کے لئے تعاضا کر رہی تھی۔ جب رشید چوروں کی طرح بدن چلائے اسکے

فقیرا تو مولوی صاحب کی مار سے بنات پا گیا لیکن جلد ساز کا رشید ابھی تک پھنسا ہوا تھا پورے سات دن جب فقیرا مسجد نہ آیا اور مولوی صاحب کی لعنت پھٹکارا کیلے رشید کو برداشت کرنا پڑی تو اس کا جی ڈوب گیا۔ وہ سارا دن بیٹھائی سوچتا رہتا کہ کاش میں وہ عمل ہی فقیرے سے سیکھ لیتا تاکہ مولوی صاحب کو راہ بنانے میں آسانی ہوتی لیکن فقیرا تو مسجد چھوڑ کر دکان پر بیٹھنے لگا تھا۔ شام کو شیخ جی نے کبھی رشید کو باہر نہ جانے دیا تھا اور دن بھر رشید کو مکتب سے چھٹی نہ ہوتی تھی کہ فقیرے سے ملاقات کرتا۔ یوں تو مکتب کے نمانچے فقیرے کو چھوڑتے رہتے تھے اور اونچے اونچے گایا کرتے تھے:

”اے فقیرا تیری فقیری دور اے۔“

لیکن فقیرا ان باتوں سے کبھی نہ پڑا تھا۔ اسے تو مولوی صاحب کی مار سے نفرت تھی۔ کس طرح وہ دونوں کانوں سے اٹھ کر الف کر دیتے تھے۔ کس طرح گدی میں تڑا تڑا دھولیں پڑتی تھیں۔ جس روز فقیرا اپنے باپ کی دکان پر بیٹھا ہے اس سے ایک دن پہلے اسے اور رشید کو بے بجا دھکی پڑی تھیں۔ فقیرا تو گھراتے ہی پھر گیا۔ تختی، بستہ، قلم، دوات سب پھینکی اور دینے سے کچھ اس طرح بات کی کہ دینے نے بھی فیصلہ کر لیا کہ مسجد میں چاروں کے لئے تیل دینا اور جمعرات کو مولوی صاحب کے لئے نوٹیوں کا انتظام کرنا بالکل گھٹے کا سودا ہے فقیرا دکان پر بیٹھے گا۔ ایک ایک دو گیارہ۔ باپ بیٹا مل کر کام کریں گے تو ہزار قسم کے ال بل سے بنات مل جائے گی۔ دینے نے تو اپنے پیسوں کو کھرے کرنے کی ہوجی اور فقیرے کو دکان پر گدی نشین بنا کر بٹھالیا لیکن جب رشید نے شیخ جی سے مکتب کا کچا چھٹا کہہ سنایا تو الٹی آمنتیں گلے کو آئیں۔ شیخ جی نے رشید کا کان ہاتھ میں پکڑ لیا۔ عینک کان پر لٹکائی نرغرا بننے لگا اور وہ بل ڈاک کی طرح غڑائے:

”اے کئے کئے کئے! آئے آئے! آئے کئے کئے تیرا بڈھا باپ پیسے جوڑتا ہے کہ تجھے مکٹی سکول میں

پاس آکر بیٹھ گیا تو وہ بولا:

"دو پیسے کی چیز لیتی ہے اور اتنی کی چھلونی لگتی ہے۔ جا بھاگ جا۔"
 لڑکی بڑا سامنہ بنا کر بڑ بڑاتی ہوئی چلی گئی لیکن رشید پر یک لخت فیرے کا کچھ
 رعب سا پڑ گیا۔ وہ بڑے مؤدب لہجے میں گویا ہوا:

"تم نے مکتب کیوں چھوڑ دیا فیرے؟"

"مکتب؟ ارے وہاں کیا دھرا تھا؟ صبح سے شام تک مار مار مارا۔۔۔۔۔ یہاں
 مرے سے بیٹھا ہوں۔ چار گنے روز چا چا مجھے دیتا ہے۔"

"وہ کا ہے کو؟"

فقیر اس کا ریا اور کہنے لگا: "وہ ستوری ملتی ہے۔ حق ہو تلہ ہے مول تول کر نیوالے کا۔"
 رشید کی آنکھوں میں رشک آ گیا اور وہ دانوں سے ناخن کاٹنے لگا۔ فقیر اور بھی
 فخریہ انداز میں بولا: "اور کچھ اوپر سے بھی آمدنی ہو جاتی ہے۔ صرف چا چا حساب کا
 بہت کھرا ہے۔ ہیرا پھیری کرنے کا موقع کم ملتا ہے۔"

ساتھ دلی دکان سے چھوٹو اتنی نے نعرہ لگایا: "کیوں بیٹا! یار بلی آئے بیٹھے
 ہیں۔ ان کا منہ میٹھا کرنا ہو تو گرم گرم امرتیاں بیھوں۔"

فیرے کے ماتھے پر پل پڑ گیا۔ وہ اونچی آواز میں لیکن مؤدب لہجے میں بولا: "نہیں چلیا
 گھر کی بات ہے۔ شیخ جی کا رشید ہے جی؟"

"اچھا۔"

کالی کار والا حلوئی کی دکان پر پہنچا کچھ مٹھائی خریدنے لگا۔ فیرے نے اپنی دکان
 ہانک لگائی۔ "سرکار کچھ ادھر بھی ہیرانی کرنا۔ صبح سے بوہنی نہیں کی مندا حال ہو رہا ہے۔"

کار دالے نے مسکرا کر کہا: "بھٹی فی الحال تو کچھ نہیں چاہئے۔ ہاں اگر دس روپے کا
 توڑ ہو تو عنایت کرو۔"

"لیجئے سرکار ابھی لیجئے۔" فیرے نے پیسے گن کر جب کار دالے کے حوالے کئے تو
 ایک آنہ کم تھا۔ فقیر اپنی تہہ سنبھالتا اٹھ کھڑا ہوا۔ اور کہنے لگا:

"جی میں ابھی اکٹھے کر آیا۔ میرا تو خیال تھا پورے نکلیں گے۔ لیکن۔۔۔۔۔"
 "کوئی بات نہیں۔ اکٹھے کے لئے تردد نہ کریں۔" کار دالے نے ماتھ ہلاتے ہوئے
 جواب دیا اور حلوئی کا حساب چرکانے لگا۔

"جناب ایسے نہیں ہو سکتا۔ حساب حساب ہوتا ہے۔"

لیکن فیرے نے یہ بات اتنی دیر سے اور ایسے مدہم طریق سے کہی کہ کار دالا اکٹھے
 سے بے نیاز واپس کار میں بھی پہنچ گیا۔

فیرے نے رشید کو آنکھ ماری اور بولا: "کیوں بے وہ مکتب والوں کا کیا حال ہے؟"
 اب تک رشید بار بار علی کے متعلق پوچھنا چاہتا تھا لیکن زبان پر بات ہی نہ آتی تھی۔
 جب فیرے نے خود بات چھیری تو لجاجت سے کہنے لگا:

"مولوی صاحب نے تو ناک میں دم کر دیا ہے۔ اب تو اور بھی سخت ہو گئے ہیں۔
 پل پل میں مار پڑتی ہے۔"

فیرے نے گلے میں سے ایک انکئی نکالی اور صدی کی اندرونی جیب میں اڑس لی۔
 رشید کہنے لگا: "اگر تو مجھے وہ عل سکھا دے تو میں ایک بار تو مولوی صاحب کے
 بدلہ لے لوں۔ کھجور کا درخت میں نے ڈھونڈ لیا ہے۔"

فیرے نے تعجب سے پوچھا: "کون سا؟"

"وہی دوسرے کو بھسم کرنے والا۔ اور کون سا؟"

"اچھا! بیٹا اس بھی اچھے اچھے منتر یہاں آتے ہیں لیکن یہاں نہیں چا چا آ رہا
 ہے تو شام کو وہاں پہنچ جانا میں آجاؤں گا۔"

"کہاں؟"

فقرے نے اسے دکان سے اٹھاتے ہوئے کہا: "بھئی وہیں لائن پر۔ اور دیکھ ساتھ پانچ پیسے بھی لانا یاد رکھے۔ سب کام بن جائے گا تیرا۔"

"پانچ پیسے کیوں؟"

فقرے نے بڑے رعب سے کہا: "بابا خیرو سے تجھے تعویذ لکھوا دوں گا۔" رشید کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ تعجب سے بولا: "بابا خیرو سے؟"

"ہاں بیٹا۔ اور اب بھاگ جا۔ میرے چاچے نے تجھے دیکھ لیا تو میری خیر نہیں۔ وہ دکان پر یا ریلوں کا گٹھ جوڑ پسند نہیں کرتا۔"

رشید کو مکتب چھوڑنے میں کچھ دیر لگی لیکن اسی دن فقرے کی بدلی ہوئی حالت دیکھ کر وہ ایک بات کا فیصلہ کر چکا تھا یا تو فقرے سے بابا خیرو سے تعویذ لا کر دے گا اور وہ مولوی صاحب کی بے جا مار سے بچے گا۔ اور اگر کسی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو سکا تو مکتب کو خیر باد کہنا ہی پڑے گا۔

جب وہ بسنہ اور تختی لے کر لائنوں تک پہنچا تو جھٹ پٹا سا ہو چلا تھا۔ مولوی صاحب نے اسے جمعرات کی روٹیاں اکٹھی کرنے بھیج دیا تھا اور وہ بددلی سے دو چار گھر دیکھ کر کھٹک آیا تھا۔ دل میں اسے خوب علم تھا کہ دوسرے دن پھر دھواں دار گایوں اور زنا بڑ توڑ مار کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن اس کے جی میں ایسے پختہ ارادے جنم لے رہے تھے کہ ابا اور مولوی صاحب دونوں کی شخصیتیں منمنی ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گئی تھیں۔

اس نے مہتلی میں پانچ پیسے اتنی زور سے بھیجنے رکھے تھے کہ وہ پسینے میں بھیگ گئے تھے۔ یہ وہ پانچ پیسے تھے جو کسی رشیدہ نے روٹیوں کے ساتھ مولوی صاحب کو چراغوں میں تیل ڈالنے کے لئے بھیجے تھے۔ جب بھی اسے اپنی چوری کا خیال آتا اس کی ناک

کی پھنگ پر ننھے ننھے قطرے ابھرتے۔ رشید کو لائن پر بیٹھے بڑی دیر ہو گئی۔ پھانگ کے چوکیدار نے لائن پار کرنے والی سڑک کے دونوں پھاٹک بند کئے۔ دور سے انہن کی خوش آئند سیٹی ہوا میں لہرائی۔ رشید کے جی میں آئی کہ ایک پیسہ نکال کر لائن کی چمکتی سطح پر رکھ دے لیکن اسے فقرے کا انتقام تھا۔ اگر ایک پیسہ کم ہو گیا تو بہت ممکن ہے بابا خیرو تعویذ لکھ کر نہ دے۔ جو ننھی شعلے اڑاتی دھوئیں چھوڑتی گاڑی اس سے کچھ فاصلے پر سے گزری وہ گزروں پیچھے بھاگ کر کھڑا ہو گیا۔ آج اسے انہن کے دھمکے سے لرزتی زمین سے نامعلوم سا خوف آ رہا تھا۔ ڈبل کی جلتی ہوئی بتیوں کے عکس روشن تختے بنے اس کے پاس سے گزرے جا رہے تھے۔ پھر انہن گاڑی کو انوار کے بہت دور چلا گیا۔ پھاٹک کھل گئے لیکن کریر اور ڈبیلیسے چھپا ہوا علقہ جیسے سم کر رہ گیا۔ نفیرا ابھی تک نہ پہنچا تھا اور رشید کو بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ لائن کیساتھ ساتھ چلتا ہوا پھاٹک تک پہنچا اور پھر سڑک پر ہوا۔

وہ بابا خیرو کی جھونپڑی تک پہنچے تو گیا لیکن اندر جانے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ ڈوٹے ہوئے دروازے کے ساتھ ہی جا بھاگوٹے کی راکھ کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں تھیں۔ رشید نے دروازے کے ساتھ منہ لگا لیا۔ اور اندر جھانکنے لگا۔ اندر گھٹپ اندھیرا تھا اور کچھ بھی سمجھائی نہ دیتا تھا۔ کتنی ہی دیر رشید ادھر ادھر سے جھانکنے کی کوشش کرتا رہا لیکن خستہ کوٹھری کے اندر روشنی کی ایک بجلی نہ پھوٹی۔ بالآخر رشید نے دروازہ دھکیلنا چاہا تو جوئی کو اڑدرا سے بھولے کسی نے پیچھے سے اسے پکڑ کر اپنی طرف گھمایا۔ سامنے بابا خیرو کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ غصے سے متمایا ہوا تھا۔ بھرے ہاتھ کا ٹاپا خیر رشید کے منہ پر جاتے ہوئے بابا بولا:

"کیوں بے حرامی۔ سارا شہر چھوڑ کر فقروں کے گھر ہی ڈاکہ ڈالتا تھا؟۔ حرام زادے پھر کبھی یہاں دیکھا تو تیرا ب ڈال کر بھسم کر دوں گا۔"

پھر اس کے کان اینٹھ کر کہنے لگا: "اس دن بھی میں نے تجھے جھاڑیوں کے پیچھے دیکھا تھا۔ جوتی چور۔ اٹھائی گمراہ۔ کس کا لڑکا ہے تو؟"

رشید کے نام منسوبے، سارے ارادے حلق ہی میں خشک ہو گئے۔ اسے مارے خوف نہ آتا تھا لیکن بابا خیر و تو جادوگر تھا اور کون جانے لستی سے اتنی دور اجاڑ سسنان جگہ میں ابھی پل بھر میں اس کا کلیہ ہی نکال لیتا۔ رشید نے جلدی سے کان چھڑایا اور سر پٹ بھاگنے لگا۔ دُور تک بابا خیر کی آواز اس کا تعاقب کرتی رہی۔ وہ لداکار لداکار کہہ رہا تھا: "حرار زادے۔ پھر کبھی ادھر آیا تو ہڈیاں توڑ دوں گا۔ میرا بچہ نہیں بابا خیر وہوں خیر....."

جب تک قصبے کی بتیاں نظر نہ آئیں وہ بھاگتا ہی چلا گیا۔ بار بار مڑ کر دیکھ لیتا کہ میں بابا خیر و تعاقب میں چلا تو نہیں آ رہا۔ ساری راہ اس کی نظریں فقیر کے کوڑھوٹنی ربڑی لیسکے سولے بھاگتی بیڑیوں کے اور کچھ بھی نظر نہ آیا۔ غیور بھی میں پہنچ کر اسے اپنے پانچ پیسے اور تختی یا فائی لیکن اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ ان چیرروں کو ڈھونڈنے لگتا۔ چوروں کی طرح وہ گھر میں داخل ہوا۔ شیخ جی گھر میں موجود نہ تھے۔ ہنڈیا چولھے پر دھری ابل رہی تھی۔ اس نے چار پائی پر بیٹھ کر کٹورہ بھر ٹھنڈا پانی پیا تو جان میں جان آئی۔

اس کے بعد اس نے چائے کی طرف جانا ہی چھوڑ دیا۔ فقیر نے کئی بار اسے ترغیب دلائی لیکن رشید نے ٹال دیا۔

رشید کو مکتب چھوڑنے میں بڑی دقت پیش آئی کیونکہ شیخ جی کے دل میں اپنے اکلوتے رشید کے لئے بڑے بڑے خواب تھے جو پڑھائی کے بغیر پورے ہو ہی نہ سکتے تھے لیکن رشید نے فقیر کے کی خوشنمائی دیکھ لی تھی اور وہ بھند تھا کہ وہ بھی دکان پر کام کرے گا۔ بالآخر

شیخ جی کو ہتھیار ڈالنا پڑے اور رشید بھی دکان پر جانے لگا۔

جب سے فقیر کے کو دکان کی سمجھ بوجھ پیدا ہوئی تھی دینا زیادہ وقت منڈی سے سودا لانے اور رکھنا بھی کی جانچ پڑتال میں وقت گزارتا۔ ترازو کی ڈنڈی اب فقیر کے ہاتھ ہی میں رہتی تھی۔ گاہکوں سے مول تول کرنا، باقی دکانداروں سے لین دین رکھنا اور دکان کی تمام ذمہ داری اسی کی تھی۔ چھاپھ حلوائی سے اب فقیر کے مراسم بہت اچھے ہو گئے تھے اور جوئی دینا منڈی جاتا وہ بڑی، دودھ، جلیبیاں خرید کر فرو رکھاتا۔ فقیر اٹھوڑے ہی عرصہ میں گھبرو ہو گیا تھا۔ گاہکوں کے گڑھے بھر گئے تھے اور ٹوٹری کے پتے گوشت کی ننھی سی گہرائی اُبھیر آئی تھی۔

شیخ جی ہمیشہ بازار کی جانب پرست کر کے بیٹھتے تھے۔ انہیں بازار کے شور و شغب سے کوئی سروکار نہ تھا۔ آرام سے بیٹھے جلدیں کسا کرتے۔ کبھی کبھار کوئی دلچسپ مسودہ ہاتھ لگ جاتا تو اسے علیحدہ رکھ دیتے اور گھر لاکر بیٹے کی روشنی میں پڑھنے لگتے لیکن رشید ہمیشہ دینے کی دکان کا رخ کر کے بیٹھتا تھا۔ بار بار اس کی نظر سامنے اٹھ جاتی۔ دینے کی دکان پر جو بیٹھ رہتی تھی۔ بھانت بھانت کے گاہک آتے تھے ان کا نظارہ وہ اپنی دکان سے بیٹھ کر ہی کر لیتا۔ اسے لٹی بنانے سے نفرت تھی۔ گتا کاٹنا اور کھٹکنا اسے بڑے فضول کام نظر آتے تھے کیونکہ صبح سے شام تک اتنی ساری کتابیں سینے، جوڑنے اور جلد بندی کرنے کے بعد اسے ایک آدھ بھی دستوری نہ ملتی۔ شیخ جی کی دکان پر آتے ہی وہ لوگ تھے جو کل سے ہی چمک مٹکے اور فقیر سے نظر آتے۔ کبھی کبھار کمیٹی سکول کے ماسٹر آتے لیکن وہ ہمیشہ بل پر کام کرواتے تھے اس لئے اوپر کی آمدنی کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ مولوی صاحب کی قید سے چھوٹ کر بھی رشید کو آزادی نصیب نہ ہوئی اور آزادی سلب ہو جانے کا اسے اتنا رنج نہ تھا جتنا دکھ اسے اس بات کا تھا کہ اب کماؤ ہو سکے گا۔ باوجود وہ ایک پانی کا حقدار نہ تھا۔ اس کی ذاتی پونجی صفر تھی۔ نئی داسکٹ اور سرخ جوتی خریدنا تو درکنار وہ تو آج تک دو

کرنے کی کھفی بھی نہ خرید سکا تھا۔ اس لئے جب ایک دن ایک لڑکا اپنی کتابیں بندھوانے آیا تو رشید نے اس سے چار آنے زیادہ وصول کر لئے۔

لیکن شیخ جی سے اس بچے نے کہیں بڑی۔ دوسرے ہی دن شیخ جی نے رشید سے پوچھا: —

”وہ ہٹری جغرافیہ کی کتابیں حمید صاحب کا لڑکا بندھوا کر لے گیا تھا؟“

رشید لکھ بھر کو کانپا اور آہستہ سے بولا: ”جی!“

”ابری لگاٹی تھی؟“

”جی!“

اب شیخ جی اس کے قریب آکھڑے ہوئے اور بولے: ”کیوں میاں شکستے میں جلدیں کس لی تھیں۔“

رشید نے گیدڑ بھکی کے انداز میں چڑ کر کہا: ”جی اور کیا ایسا ہی بے وقوف سمجھا ہے نیچے۔“

شیخ جی نے آسمان میں کھول کر لمحہ بھر کو اسے گھورا اور پھر کہنے لگے: ”جی۔ اور آپ کا کیا خیال ہے لئی دو گھنٹے میں خشک ہو گئی ہوگی۔“

”جلدیں تو خشک ہی لگتی تھیں۔“

”اور کتنے پیسے لئے تھے اس لڑکے سے۔“

اب رشید کی زبان کو تالا لگ گیا۔

”کیا رقم وصول کی تھی اس سے؟“

رشید خاموش رہا تو شیخ جی نے اسے کان سے پکڑ لیا اور بولے: ”اس اڈے میں

ہیرا پھیری نہیں چلے گی۔ ایک دھڑی کا بھی فرق نکلا تو ہڈی پسلی ایک کر دوں گا۔ میں نے

ساری عمر میں ایک زبان رکھی ہے۔ کبھی گاہک سے جھوٹ نہیں بولا۔ ایک وقت ہو کھی کھائی ہے

لیکن جھوٹ کی نیو ڈال کر عمارت کھڑی نہیں کی — تجھے رہنا ہو تو وہ جاہلو تو جا۔ لیکن میں لین دین کا کھرا ہوں۔ یہاں بھاڑ تاڑ کی گنجائش نہیں۔ کان کھول کر سن لے۔ اگر آئندہ ایسی حرکت کی تو کھڑے کھڑے نکال دوں گا۔“

رشید کو پھر کبھی ہیرا پھیری کرنے کی ہمت تو نہیں پڑی لیکن اس کی حسرتیں ان گنت ہو گئیں۔ وہ خالی وقت میں بیٹھ کر ایسی چیزوں کے خواب دیکھنے لگا جو بازار میں کھلے بندوں کی جیب سے نکلتے۔ جب کبھی فرصت ہوتی یا فیکرے کو کام نہ ہوتا تو وہ گھڑی دو گھڑی کے لئے اس کے پاس بھی جا بیٹھتا۔ لیکن فیکرے سے ملنے کے بعد اس کی طبیعت اور بھی پریشان ہو جاتی۔ وہ سوچنے لگتا کہ کوئی ایسا طریقہ نہیں ہو سکتا کہ راتوں رات انسان امیر ہو جائے۔ کسی طرح چھپڑ پھپڑ جاسے اور سونے چاندی کی بارش ہونے لگے — کہیں سے چھپا ہوا خزانہ چلتے چلتے مل جائے — کوئی لکھ بھری اپنا وارث بن کر مر جائے۔

ان خوابوں کو اور بھی تقویت ملتی۔ یہ تخیلات اور بھی رنگین ہو جاتے۔ اگر کبھی بازار میں بابا خیر و آنکلتا — وہ بابا خیر و کا سامنا کرنے سے ڈرتا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں چمک آجاتی۔ وہ ٹاٹ کا ایک مڑاٹھا کر دینے کی دکان بار بار دیکھنے لگتا۔ سینے بننے کی دکان کی ساری باتیں کان لگا کر سنتا۔ اس کا کتنا جی چاہتا تھا کہ کسی دن ہمت کر کے بابا خیر و سے پوچھ ہی لے:

”بابا۔ کیا تمہیں سونا بنانے کا نسخہ آتا ہے۔ کیا تم نے چاندی بنا کر دیکھی ہے۔“

شیخ جی کا خیال تھا کہ سید سے شادی ہو جائے کے بعد رشید بھی فیکرے کی طرح دکان کا ہی ہو کر رہ جائے گا لیکن رشید تو اور بھی الجھ کر رہ گیا۔ شیخ جی نے اتنی محنت سے ایسی

جانفشانی سے اسے کتابت کا فن سکھایا تھا۔ شیخ سعدی کے اور حافظ کے اشعار مکھ مکھ کر قطعے لکھنے سکھائے تھے لیکن اب رشید کی لکھائی کا یہ عالم تھا کہ تمام گامک شکایت کرتے تھے۔ نہ دائرے ٹھیک بیٹھتے نہ نوک پلک ہی درست ہوتی۔ نقطے بھی چھوٹے بڑے لگنے لگے تھے۔ مسطر گھٹنے پر چائے قلم کی نال روشنائی سے بھر کر وہ بیٹھا رہتا۔ چوری چوری شیخ جی اس پر نظر ڈالتے لمبی سانس بھرتے اور پھر عینک ناک پر جما کر جب حدیں باندھنے لگتے۔ اب انہیں دینے بساطی کی زندگی پر رشک آنے لگا تھا۔ ان کا فقیر اسارے بازار میں کس قدر معتبر تھا۔ گاہکوں سے پک بھپک کر پیش آتا۔ اسے کمرے کھوٹے کی پہچان تھی۔ معاملے کی اہمیت کو پک بھپکتے ہی پہچان لیتا تھا۔ شیخ جی نے دینے سے مشورہ کیا تو وہ جھٹ بولا:

”دوبول پڑھو اور شیخ جی۔ بال بچے کی محبت سب کچھ ٹھیک کر دے گی۔ آپ ہی آپ سدھر جائے گا۔“

شیخ جی نے اپنی برادری کی سب سے سکھ در کی شہر سے لاکر اس کے گھر بسائی تھی۔ سلیم بڑی سلیقہ شعار اور نفاست پسند تھی۔ اس نے آتے ہی اپنے کمرے میں نیا کینڈر اور موتیوں سے کڑھی ہوئی خوبصورت تصویر دیوار پر لٹکائی تھی۔ اس کے ہاتھ کے بنے ہوئے میز پوش اور چادریں ہرے نیلے بسنتی پھولوں سے لری ہوئی تھیں۔ بالوں میں جنبی کا تیل لگاتی تھی۔ دوپٹوں میں ساگودانے کی ایسی کلف لگاتی تھی کہ اچھ سے اچھی کتاب کی جلد بندی کے لئے کبھی رشید نے استعمال نہ کی تھی۔ رشید کی خاموشی اور بدلی کی شیخ جی کو تو سمجھ نہ آتی تھی لیکن سلیم ٹوہ میں تھی۔

ایک رات کھانے کے بعد رشید کھڑی چادر پانی پر چپ چاپ لیٹا تھا۔ آنکھیں میں مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ طاقتے میں دھرے دیئے کی مسلسل کانپ رہی تھی۔ شیخ جی دھوکہ کے ساتھ والی مسجد میں عشا کی نماز پڑھنے گئے تھے جب سلیم نے

نے اپنا چہنا ہوا دوپٹہ اتارا اور بڑی بے تکلفی سے ادوائن کی طرف جا بیٹھی اور بولی:

”کیوں کسی سے نہیں بولنا کیا؟“

رشید نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ رشید کا پاؤں کھجلا کر کہنے لگی: ”مرثام نہ سو جایا کریں۔ صحت کے لئے بڑا خراب ہے۔“

رشید کو سنہی آگئی لیکن وہ بن کر بولا: ”تنگ نہ کر دھیمیاں میں سو رہا ہوں۔“

اب وہ بھپاک سے اٹھی اور کہنے لگی: ”تو یہ دیا خواہ مخواہ جل رہا ہے۔ بجھا دوں

اسے؟“

”نہیں رہنے دو۔“

پھیمیاں طاقتے کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ دیئے کی دھم دھم میں اس کی کاجل بھری آنکھیں بانوں میں پڑے ہوئے کنگن اور ناک کی سنخ سی کیل چمکنے لگی۔ بالوں کی لٹ مانتے سے پرے کرتے ہوئے پھیمیاں بولی:

”نہ جی۔ یہاں کیا سب نے جلنے کا ٹھیکہ لیا ہے۔ کم از کم دیا تو آرام کرے۔“

اس نے منہ سے سٹی بنائی اور بکے سی سفید گردن بڑھا کر دیا بجھا دیا۔ آنکھیں میں چاند کی چاندنی ہر طرف پھیل گئی۔ بیری کے پتے سیاہ لور سفید کے دھبے بن کر فرش پر منعکس ہو گئے۔

”ادھر اچھیاں: رشید نے آواز دی۔

پھیمیاں طاقتے کے قریب ہی کھڑی رہی۔

رشید بولا: ”اس گھر میں سبھی کیوں جلیں۔ میں کافی نہیں ہوں کیا؟“

زیر لب پھیمیاں نے اس پر بھی اور جلدی سے بولی: ”جلیں آپ کے دشمن۔“

رشید نے لمبی سانس بھری اور بولا: ”مہمارے کرم جل گئے جو فحش سا شوہر ملا کسی اچھی

جگہ بیاہی جاتیں تو کاہے کا غم ہوتا۔ صبح و شام پو لہا جھونکنا..... ڈھنگ کا کوئی کپڑا

یہاں اس عمر میں انہیں دھکا بھی تو نہیں دے سکتے تھے۔ کوئی ایسا کام کیوں نہیں کرتے جس کی خبر چاچا جی کو نہ ہو۔ بظاہر تم جلد سازی ہی کرتے رہو لیکن کچھ معقول آمدنی کی صورت بھی بن جائے۔

رشید نے دیکھی ہو کر جواب دیا۔ ”بھیلے لوگ! کام تو بہت سے ہیں لیکن نانواں کہاں ہے۔ نانواں ہوتا تو تیرے لئے کاپنج کی چوڑیاں نہ لے آتا۔“

چھیاں نے نظریں جھکا کر اپنے لنگھوں کی طرف بڑے پیار سے دیکھا اور پھر بولی:

”یہ لنگھ تو خیر میں نہیں دے سکتی، میری ماں کی نشانی ہیں لیکن میری دھگدھگی پیچ لیجئے۔ پورے سوا دو تولے کی ہے۔ لیکن ایک شرط ہے۔“

رشید نے دھگدھگی کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے جلدی سے پوچھا: ”شرط... وہ کیسی؟“

چھیاں نے لنگھیں گھماتے ہوئے کہا: ”شرط یہ ہے کہ چاچا جی کو پتہ نہ چلے کہ آپ کوئی ادا کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی دکان پر بڑی محنت کی ہے اپنی اولاد کی طرح یہ پیشہ بھی انہیں بچوں کی طرح عزیز ہے۔ اگر انہیں پتہ چلا کہ آپ دکان سے بے وفائی کر رہے ہیں تو انہیں بڑا بچ ہوگا۔“

”اور اگر انہوں نے پوچھا کہ ہُن کہاں سے برسنے لگے تو؟“

”آپ کہہ دیجئے گا کہ دکان سے نفع زیادہ ہونے لگا ہے۔ آج کل وہ دکان پر کم جاتے ہیں انہیں شک نہ گزرے گا۔“

پھر آہستہ سے چھیاں نے پوچھا: ”کوئی ایسا کام ملے گا؟“

رشید نے ہنس کر اس کی لٹ کو ماتھے پر سے کیا اور بولا: ”بھیلے! کام تو بہت ہیں۔ انشاء اللہ دیکھنا اب کیا بنتا ہے۔ دھگدھگی کے لئے گھبرانہ نہ نئی بنوا دوں گا۔“

چھیاں کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک ڈرا سی دیر کو لرائی اور پھر وہ بولی: ”واہ۔ یہ

نہیں..... جب سے آئی ہو سونے کا زیور تو درکنار کاپنج کی چوڑیاں بھی تمہارے لئے نہیں لاسکا۔ تمہارا کیا خیال ہے مجھے ان باتوں کا خیال ہی نہیں آتا؟ تمہارا خیال ہوگا پتہ نہیں کس معشوق کے لئے دو تار ہوتا ہوں میں!“

چھیاں کی ہاتھیں کھل گئیں۔ وہ بڑے انداز سے چار پائی کی طرف لپکی اور فرش پر ہی دوڑا نو ہو کر بیٹھ گئی۔ رشید نے پہلو بدل کر اس کی طرف دیکھا اور کہنے لگا:

”چھیاں۔ میں نے تو بڑی کوشش کی کہ کسی طرح ہمارے حالات سنو رہاؤں لیکن اباجی کے نزدیک تو ہر طرح کا نفع چوری ہے، ڈاکہ ہے، رہزنی ہے۔ یہاں تو جینے کا نام ہی ہیرا پھیری ہے۔ کوئی کیا کرے۔“

چھیاں نے حیرانی سے پوچھا: ”لیکن چاچا جی تو خود دکاندار کرتے ہیں۔“

”اس دکان سے تو اتنا بھی نہیں ہوتا کہ رات کو ڈھنگ کا کھانا کھا لیں۔“

”پھر!“

رشید نے چپڑ کر کہا: ”میں نے ایک بار مشورہ دیا تھا کہ جلد سازی اور کتابت کا کام چھوڑ کر ہم بھی آٹھت کر دیں لیکن انہیں تو چرٹ ہے۔ جس کام میں نفع ہوگا اسی سے انہیں نفرت ہوگی۔ ایک بار میں نے شہر جاکر تجارت کرنے کا مشورہ دیا تو ٹال گئے۔ کہتے ہیں آج دکان میں خدا برکت دے گا۔ اگر مولائے چاہا تو یہیں کچھ سبیل بن جائے گی۔“

”پھر آپ کی کیا صلاح ہے۔ یوں چلنے سے تو کچھ نہ بنے گا۔“

رشید نے ہولے سے آہ بھری اور بولا: ”یہی اگر کچھ پونجی ہوتی تو میں آپ کچھ

کام چلاتا۔“

”توبہ توبہ..... اور چاچا جی کو بیچ منجھڑا میں بھیڑ جاتے؟“

رشید نے تنک کر پوچھا: ”تو کیا ہم نے ان کا ہتھکڑیا لیا ہے۔“

چھیاں نے نرمی سے اس کے ہاتھوں میں انگلیاں ڈبو کر کہا: ”نہیں ٹھیکہ تو نہیں

آپ سے اچھی ہے کیا۔"

اسی وقت شیخ جی کھنٹے سے راہ ٹٹولتے ڈیوڑھی میں پہنچے اور وہیں سے چلے گئے؛
"کیوں پھیاں۔ آج دیا نہیں جھلایا۔ جھبڈھے کی گر کر کوئی ہڈی ٹوٹ گئی تو بوانے کے
لئے پیسے کہاں سے آئیں گے۔"

پھیماں نے بیک کر دوپٹہ اٹھا یا اور پھر طلاچے کی طرف بڑھ گئی۔

"اس وقت تو مشکل ہے شیخ جی۔ کاروبار مندا ہے۔ قسم پختن پاک کی سونے
کے بیوپار کو ہی آگ لگی ہے۔ رقی تو لے کا حساب کرتا کرتا انسان پاگل ہو جاتا ہے
اور بچت کوڑی کی نہیں۔۔۔۔۔ پہلے اس میں ہزاروں کالین دین رہتا تھا۔ اب تو سارا
حساب ہی بٹا کھاتا بن گیا ہے۔"

پھر مدو ہولے ہولے سننے لگا اور شیشے کی صندوقچی پر رکھے ہوئے زیور واپس ہنز
لال اور پیلے کاغذ میں پیٹنے لگا۔

رشید نے چند لمحے سوچ کر آہستہ سے دھک دھکی نکالی اور اسے سہیلی پر رکھ کر بولا:
"چاچا جی یہ دھک دھکی لایا تھا بیچنے کے لئے۔"

"توبہ! توبہ! توبہ! تمہاری چیز میرے ہاں نہیں بک سکتی بیٹا!"
رشید کی ٹانگیں کانپنے لگیں لیکن اسے ایک گونہ سکون ملا کہ چلو خیریت ہوئی میرے
ہاتھوں پھیماں کا زیور نہ بکے گا۔
"اچھا۔۔۔۔۔ تو میں چلتا ہوں۔"

مدو نے اس کی قمیض کا کونہ پکڑ کر اٹھا لیا اور آہستہ سے بولا: "ارے نہ لسی نہ پانی
بیٹھے بیٹھے۔۔۔۔۔ تمہاری ضرورت میری ضرورت ہے۔ کہو کتنے نوپے درکار ہیں۔"

"جتنے میں یہ زیور بک سکے چاچا!"
مدو نے دھک دھکی لے کر روشنی کی طرف گھائی پھر بے پروائی سے صندوقچی پر ڈال کر
کہا۔ "بازار کا بھاؤ مندا ہے بیٹا۔ سو سو اسو کی چیز ہوگی۔ کو تو کچھ رقم تمہیں
ادھار دے دوں۔"

"وہ آپ کی مہربانی ہے۔"
پھر مدو نے صندوقچی سے کچھ نوٹ نکالے اور انگلیوں میں تھوک لگا کر جلدی جلدی
گفتے لگا۔

رشید نے دوسروں پرے ریشمی رومال میں کس کر باندھے پھر انہیں اپنی قمیض کی جیب
میں ڈالا۔ پھر واسکٹ کی اوپر والی جیب میں جلدی سے گھسیڑ دیئے۔ مدو سار کی ساری
چمک دمک اور آن بان اس کی نظروں کے سامنے تھی۔ اسے مدو کی دکان پر بیٹھے دو تین گھنٹے
لگ گئے۔ بیڑ کم ہوتی تو وہ عرض درعا کرتا۔ اس کے سامنے سونے کے کنگھی بکے۔ ایک
دیہاتی نے اپنی بیوی کے لئے بہت خوبصورت پاز میں خریدیں۔ ایک عورت دیر تک
متذبذب بیٹھی سوچتی رہی کہ اپنی بیٹی کو جگنی بنوادے یا منہلی بہتر رہے گی۔ مدو
کبھی منہلی سبر کاغذ پر رکھ کر دکھاتا کبھی جگنی لہرا کر پیش کرتا۔ اتنے خوبصورت اور چمکتے
زیور دیکھ کر رشید پر عجیب کیفیت طاری تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ دھک دھکی بیچ کر ایک
جرڈاؤ بازو بند اور کانوں کی ہلکی ہلکی بالیوں کا ایک جوڑا خریدے۔ پھیماں کے بھرے بھرے
اور سفید بازو سے ایک لخت سونے سونے نظر آنے لگے۔ پھر اس کے جی میں آئی کہ اس
جھنجھٹ سے یہی بہتر ہے کہ دھک دھکی صاف کر داکر پھیماں کو لوٹا دے اور وہ اٹھ بھی جاتا
اگر مدو اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر بے تکلفی سے نہ کہتا:

"کیوں شیخ جی۔ کچھ پیسے درکار ہیں۔"

"ہاں۔" چوروں کی طرح رشید نے جواب دیا۔

ایک پرانا پرزہ پڑھ رہا تھا۔ رشید کے قدم خود بخود فقیرے کی طرف بڑھنے لگے۔ مولا بخش موچی بڑے جوش سے کہہ رہا تھا:

”کیوں بابا۔ اگر چاندی بن جاتی ہے تو بناتے کیوں نہیں۔“
بابا خیر نے موٹی سی گالی سے مولا بخش کو نوازتے ہوئے کہا: ”تو بیٹھا اپنے جوتے سی۔ چاندی سے تجھے کیا۔ فقیرے ارے فقیرے، بننے کی اولاد! ارے پھیندنے سے پکڑ کر تول۔۔۔۔۔ ڈنڈی مارنے سے باز نہیں آتا ناں۔“
فقیرے نے ترازو بابا خیر کی طرف بڑھا دیا اور جلدی سے بولا: ”بابا۔ تم خود جو کھ لو۔ ہمارا پٹا الٹ جائے جو رتی کا بھی فرق ہو۔۔۔۔۔“

چھاپو حلوائی نے لٹوٹوں کے تھال پر ورق سجاتے ہوئے کوئی ہزارویں دفعہ کہا: ”ہم تو اس مٹھائی کے دھندے سے بھر پائے ہیں ساتھ لگا لو بابا خیر۔ سنا ہے تمہارے پاس بڑے بڑے نسخے ہیں۔ کوئی تعویذ ہمیں بھی مکھ دو اور کچھ نہیں تو اٹھ اسی تیل گھی کے۔ یو پار میں برکت دیدے۔ چلا سنے کا لا بھر ہی ہو جائے۔“
بابا خیر نے اپنی پوٹلیاں باندھتے ہوئے دیر تک کچھ زبانی حساب کتاب کیا اور پھر حلوائی سے مخاطب ہوا:

”چھاپو ہلو ان۔ یہ لمبے پھیر ہیں۔ سونا چاندی بنتا ہے لیکن گن چلے گئے۔۔۔۔۔ چاند کا ورق بھی تو کسی نے بنایا ہی تھا ناں؟ اپنی تو بائیں آنکھ ہی ان تجربوں کی نذر ہو گئی ہے اور پوچھ لو کسی سے کبھی جی میل نہیں ہوا۔۔۔۔۔ لیکن جو ہوئی۔“

یہ کہہ کر بابا خیر واٹھا۔ اس نے اپنے چھوٹے سے قبیلے میں تمام پڑیاں لپیٹیں۔ پیسے چکائے اور لنگڑا تا ہوا چلنے لگا۔ اس کے اوجھل ہوتے ہی چھاپو نے کہا: ”بھید ضرور ہے کوئی۔ بڑھاپے کی وجہ سے درزیوں بے کار زندگی کٹنے سے رہی اور آج تک اسے بھیک مانگتے کسی نے دیکھا نہیں۔“

”مجھے ڈھائی سو روپیہ درکار تھا کم از کم۔“

”سیر دست تو صرف دو سو ہیں۔ تمہارا کام چل سکے تو چلا لو۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ یہ تمہاری دھک دھکی میں رکھ لیتا ہوں۔ رقم ہوگی تو لے جانا۔۔۔۔۔ اس کا نمونہ شہری ہے میں بنا لوں گا تو بکری ہو جائے گی میری۔“

”ہاں ہاں۔۔۔۔۔ چاچا آپ رکھیں اسے۔“ رقم پکڑتے ہوئے رشید نے کہا۔
رنگین رومال میں دو سو روپے باندھ کر رشید باہر نکلا تو بمشکل تمام بولا: ”جی۔ اس بات کا ذکر اب سے نہ کرنا۔۔۔۔۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔“

مدد کسی فلم کے دلال کی طرح مسکرایا اور سر ہلا کر کہنے لگا: ”بابا۔ مجھے بچہ سمجھا ہے کیا۔ کام بن جائے تو عینے کے بعد اپنی چیز لے جانا۔۔۔۔۔ بعد کو میں ضامن نہ رہوں گا۔۔۔۔۔ ہاں!“

رشید زیور گردی رکھ کر جب دکان سے باہر نکلا تو اس کے ذہن میں کوئی پروگرام نہ تھا۔ اسے سمجھ نہ آ رہی تھی کہ ان دو سو روپوں سے وہ کیا کاروبار کرے گا اور کیوں کر یہ دو سو ہزاروں میں بدل سکیں گے؟ آج تک اس کے پاس کبھی اکٹھے پاس روپے بھی نہ ہوئے تھے اور وہ خوابوں میں لاکھوں کا چکا تھا۔ کبھی سوچتا تھا آپیسے کی مشین لگا لوں کبھی جی میں آتا فیون کا کاروبار کروں۔ چوری چھپے کی آمدنی ہوگی، ابا کو کبھی خبر نہ ہو سکے گی اور یو پار بھی لاکھوں کا ہوگا۔ پھر سوچنے لگتا کہ شہر چل کر قسمت آزادوں تو وارے نیارے ہو جائیں گے یہ وارے نیارے کیونکر ہوں گے! اس کے متعلق اس نے کچھ بھی نہ سوچا تھا۔

فقیرے کی دکان پر آج خوب رونق تھی۔ رشید نے چوری چوری گزر جانا چاہا لیکن فقیرے نے آواز دے کر کہا:

”کیوں میاں! اب تو بڑے آدمی ہو گئے ہو بات بھی نہیں کرتے۔“

رشید نے دینے کی دکان پر دیکھا تو بابا خیر وہ بیٹھا نظر آیا۔ وہ مکڑی کی سیڑھیوں پر بیٹھا

مولا بخش ہنسنا اور کہنے لگا: "شیرے نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے خود بابا خیر کو چاندی بناتے دیکھا ہے۔ بابا خیر کے گھر میں چاندی کی پوری دیگ رکھی ہے۔"

"دیگ؟" — چلم کاکش ادھورا چھوڑ کر قضاٹی نے پوچھا۔

مولا بخش جلدی جلدی بولا: "اب تو شیدا بڑے گھر پہنچ گیا ہے ورنہ میں نہیں سامنے بچھو ادیتا۔ یاد نہیں اس کے ٹھسے؟ بازار سارے کو خرید لیتا۔ ریشمی لنگی، تے کی جوتی، ڈب میں ہزاروں گورمنٹ پیچھے لگ گئی تھی اس کے۔ بابا خیر تو زندہ بچ گیا شیدا کیڑا گیا۔"

فقیرے نے قیصر میں لگے ہوئے سونے کے بٹنوں کو ملتے ہوئے کہا: "پر میں نے تو سنا تھا کہ چاچا شید سے پر چوری کا مقدمہ بنا تھا۔"

مولا بخش نے ہنس کر کہا: "وہ تو گھروالوں نے بات بناٹی تھی۔ اسی بابا خیر کیساتھ مل کر شہر چاندی سونا بیچنے جاتا تھا۔ گورمنٹ پیچھے لگ گئی۔ پکڑا گیا اور کیا؟"

رشید کے پاؤں اپنی دکان کی طرف نہ اٹھے بلکہ وہ تیزی سے بابا خیر کے تعاقب میں چلنے لگا۔ فقیرے نے دتین آوازیں بھی دیں لیکن رشید سنی ان سنی کر کے چلتا گیا۔ باوجودیکہ خیر ونگڑا تھا پھر بھی اس کی چال میں ہلاکی تیری تھی۔ آبادی سے بہت دور کھجوروں کا جھنڈ اور اینٹوں کا جھٹ تھا۔ یہاں پہنچ کر رشید اور بابا خیر میں صرف چند گز کا فاصلہ رہ گیا۔ رشید کی چال کست پڑ گئی کیونکہ اسے سمجھ نہ آ رہی تھی کہ آخر وہ بابا خیر سے کسے لگا گیا؟ بالآخر بابا خیر نے تعاقب کرتے رشید پر ایک نظر ڈالی اور خود ہی بولا:

"صُب کا تعویذ پورے دس روپے میں لکھ کر دوں گا لیکن شرط یہ ہے کہ شام سے پہلے پیدے کسی انار کے درخت پر ٹیک لگا دینا اور چالیس دن تک صبح و شام پانچ پتنگ ہماری خدمت میں حاضر کرنا ہوں گے۔ رجوں جوں پتنگ ہوا میں ارٹے گا محبوب پر تعویذ کا اثر ہوگا۔"

رشید نے منمناتے ہوئے کہا: "جی تعویذ تو نہیں کھوانا مجھے۔" سمجھا۔ علاج کی غرض سے آیا ہوگا۔

اب رشید بابا خیر کے قریب آ گیا اور بہمنت کہنے لگا: "نہیں بابا۔ یہ بات نہیں ہے۔ بابا خیر نے رشید کو مرے پیر تک گھوڑا بھر لے کر کچھ سوچ کر ہنس دیا۔ اس کے چہرے سے تمام بھیاں بک پن ختم ہو گیا اور رشید نے ہاتھ باندھ کر یک دم کہا: "مجھے اپنے ساتھ لگا لے بابا خیر۔ بخدا کبھی دم نہ ماروں گا۔" پتنگ کا دم پھلے دیکھا ہے کبھی۔

"جی۔"

بابا خیر نے سر ہلا کر کہا: "پتنگ پھٹی ہے۔ کانپ ٹوٹی ہے۔ ڈوٹٹی ہے لیکن دم چھتا ساتھ رہتا ہے۔ ہمارا کام بڑا مشکل ہے بابا لوٹ جا۔" میں انشاء اللہ دم چھتا بن کر ہی رہوں گا۔

"دیکھ لے سوچ سمجھ لے۔ پانسہ پلٹنے دیر نہیں لگتی۔ کون جلنے لے تو ہزاروں میں کیسے اور میں بھیک مانگتا پھروں۔"

رشید نے بڑی منت بھری آواز میں کہا: "میں ساتھ چھوڑنے والا نہیں۔ تو پھر شام کو کچھ نذر نیاز لے کر پہنچ جانا۔ شاگردی کوئی لڑکوں کا کھیل نہیں — اور دیکھ پتنگ اور گولے نہ بھوننا۔ ڈور کو ماتھا میں خود لگاؤں گا۔"

"بہت اچھا جی۔ پیسے چاہئیں تو آپ مجھ سے ابھی لے لیں۔"

"نہیں بھٹی شام کو۔ ایسی جلدی کیا ہے۔ میرا ڈیرہ پتہ ہے نا۔"

رشید نے دُشوک سے سر ہلاتے ہوئے کہا: "جی ہاں لائٹوں والے پھاٹک کے پاس

یہ نا؟"

"بس وہیں..... وہیں....."

نیم اندھیرا ہوا تو کنیاتی ہوئی پتنگ کو بابا خیر و فضا میں سے اتارنے لگا۔ ہلکا سا سیاہ دھبہ اب ہولے ہولے زمین کی طرف بڑھ رہا تھا اور بابا خیر و کمر رہا تھا:

”اپنی عمر میں بہت کچھ سیکھا ہے رشید..... بہت کچھ سکھا یا ہے۔ لوگوں سے قلعی کا پانی خشک نہیں ہوتا۔ شکرگف کی قوم نہیں بنتی۔ ان ہاتھوں نے گندھک آمد سار کا تیل بنایا ہے..... وہ کشتے مارے ہیں کہ مردہ چھو لے تو جی اٹھتا..... اب تو ہمت ساتھ نہیں دیتی ورنہ تجھے بتاتا کہ سونا بنانا کیا چیز ہے۔“

جھپ کھاتا کھاتا کچھ ہی فاصلے پر ٹھپ سے گرا۔ رشید نے جھاک کر دلوچ لیا۔ بابا خیر و گولے پر دوڑ چڑھانے لگا۔ اندھیرا ہر طرف پھیل گیا تھا۔ دور سٹین کی بتیاں، میولا بنی فضا میں مدھم مدھم روشنی بکھیر رہی تھیں۔ سروک کی دونوں جانب پھاٹک بند ہو چکا تھا۔ بابا خیر و اور رشید کوٹھڑی کی طرف چل دیئے۔ دیئے کی روشنی میں بابا خیر و کے چہرے پر ان گنت لمبیروں کا جال سا نظر آنے لگا۔ اس نے پتنگ اور ڈوری کھڑی جھلنگا چار پائی کے سچے کھسکا دیں اور چٹائی پر بیٹھ کر کچھ پڑیاں اور پوٹلیاں کھولنے لگا:

”دیکھ یہ سیٹھ کنڈا ہے..... یہ جھنگلی شلجم ہیں اور یہ ہے چوہے کئی..... آگ جلا..... اور دیکھ آگ بھی دو قسم کی ہوتی ہے۔ کوئلے کی آچ کا کشتہ کچھ اور ہوتا ہے اور خٹائی کی تاثیر کچھ اور ہوتی ہے..... ان تھابیوں کو ہولے ہولے جلانا۔ اگر آگ تیز ہوئی تو پتھر کنڈا پوہے کئی کی تاثیر کو چاٹ جائے گا۔“

رشید آگ جلانے لگا لیکن بار بار اس کی نظر کونے میں پڑی ہوئی دیگ پر جاتی تھی۔ پھر اس دیگ پر سے نظر ہٹا کر وہ بابا خیر و کو دیکھنے لگتا۔ ساری شاہ پتنگ بازی میں گونانے والا بابا خیر و اس وقت عینک چڑھائے ہوئے بڑے انہاک سے پوٹلیاں کھول کر چیزیں قتل رہا تھا۔ اس کا چہرہ اس وقت بے حد پر جلال نظر آ رہا تھا۔

رشید نے آگ جلائی۔ کوٹھڑی میں دھواں سا پھیل گیا۔ جب وہ دروازہ کھول کر بیٹھنے

لگا تو دیگ کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس بے سرو سامانی میں جھپکتی دیگ بڑی مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔

”اس دیگ میں کیا تھا بابا خیر و؟“

بابا خیر و نے لمحہ بھر کو دیگ کی طرف دیکھ کر کہا: ”اس دیگ میں؟..... اس میں چاندی تھی بیٹا چاندی..... قناعت کرتا تو عمر کو یہ دولت کافی تھی لیکن..... خیر آگ جل گئی؟“

رشید دیگ کو دیکھتا ہی رہ گیا۔

”آگ جل گئی رشید۔“

”جی۔۔۔“

بابا خیر و نے تڑاؤ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: ”ایک پلڑے میں سما کر ہے دوسرے میں گندھک۔ دونوں کو کھیل کر نہ ہے۔ چل میں بتاؤں۔“

”جس وقت رشید کھڑے ہوا تو بارش شروع ہو چکی تھی۔ بجلی رہ رہ کر چمکتی تو اسے پانی میں آگے بڑھتے ہوئے اپنے بوٹ نظر آ جاتے۔ ساری راہ اس کے دل میں یہی سوچ تھی کہ کس طرح دوسرے دن ریشمی تہ اور بگڑی خریدے گا کیونکہ بابا خیر و کی فرمائش پوری کرنا ضروری تھا اور بزاز کا شیخ جی سے تعلقات اتنے گہرے تھے کہ بات نکل جانے کا اندیشہ تھا۔

اپنی ڈیوڑھی کا دروازہ اسے ذرا سا کھلا نظر آیا۔ قریب پہنچا تو اس نے ایک سائے کو دروازے میں کھڑے پایا۔ پھیماں نے ذرا سا چہرہ باہر نکال کر کہا:

”ذرا آہستہ آہستہ آگے آ جا چا جی جاگ رہے ہیں۔“

”پھر؟“

پھیماں نے ہولے سے کہا: ”میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ آپ سو رہے ہیں۔“

کمرے میں پہنچ کر اس نے دروازہ بند کیا تو پھیماں نے پوچھا: ”کچھ کام بنا؟“

"امید تو ہے"۔
پھیماں ہولے سے بولی: "لیکن اتنی دیر سے نہ آیا کریں۔ چاچا جی آج کٹی بار پوچھ چکے ہیں۔"

"جب اس گھر میں سونے کی اینٹیں آئیں گی تو سب پوچھنا بند ہو جائے گا۔"
پھیماں نے لمحہ بھر اس کی طرف مشکوک نظروں سے دیکھ کر منہ پر انگلی رکھ لی اور کہنے لگی:
"آہستہ بولنے ذرا۔"

"کچھ کھانے کو ہو تو جلدی لا۔ آج تو سارا دن گھومتے ہی گزر گیا ہے۔"
لیکن پھیماں جگہ سے نہ ہلی اور پوچھنے لگی: "کام کیا شروع کیا ہے مجھے تو بتائیں۔"
"سب پتہ لگ جائے گا جلدی کا ہے کی ہے کچھ کھانے کو تو لا۔"
پھیماں چلی گئی تو وہ گیلے بوٹوں سمیت چارپائی پر دراز ہو گیا۔ اس کی نظروں کے سامنے چاندی سے بھری ہوئی دیگ گھومنے لگی۔

دوپہر کی دھوپ موکھے میں سے اتر کر عین وہاں پڑ رہی تھی جہاں پھیماں کا پھولوں والا رنگین کیس پڑا تھا۔ بابا خیرو کے پاس رشید کو گئے پورا ایک ہفتہ ہو چلا تھا۔ رشید کی جیب میں جو چوٹی تھی وہ کھوٹی تھی اور جو اشیاء بابا خیرو نے خرید کر لانے کو کہا تھا ان پر پورے تیس روپے لاگت آگئی تھی۔ چار دن سے تو وہ دکان پر بھی نہ گیا تھا۔ اسے وہ احساس ہو رہا تھا کہ اب کام بننے ہی والا ہے اور جوں جوں یہ احساس بڑھتا اس کی بے چینی بڑھتی جاتی۔ دھمکی لگتی، کانوں کی حرکتیں گئیں۔ . . . چاندی کی پازیس گئیں حتیٰ کہ وہ موتیوں والی تصویر بھی یک گئی جو پھیماں حمیز میں لائی تھی اور جو اتنے ہی سامنے والی دیوار کی زینت بن گئی تھی پھیماں خاموشی سے اپنی چیزیں رشید کو پکڑا رہی لیکن جب رشید نے کنگن طلب کئے تو پھیماں نے

صاف انکار کر دیا۔ کنگن پھیماں کی ماں نے مرتے دم اس کی باہوں میں پہنائے تھے۔ یہ اس کی مرحوم ماں کی یاد سے بھی زیادہ مقدس تھے۔ دو ایک بار تو رشید نے دبی زبان میں ان کا مطالبہ کیا لیکن پھیماں جو بے حد ہنس مزاح کی عورت تھی ہر بار ہلکے ہلکے اٹھی۔

آج صبح سے رشید کے داغ میں بابا خیرو کا ڈیلا گھوم رہا تھا۔ وہ چارپائی پر جیت لیٹا پھیماں کو دوپٹہ چھٹنے دیکھ رہا تھا۔ ایک لخت اس نے محسوس کیا کہ پھیماں کی باہیں منگی ہیں ان پر وہ کنگن نہیں جنہیں وہ رات کے وقت بھی نہ اتارتی تھی۔

"تمہارے کنگن کیا ہوئے پھیماں؟" رشید نے بالآخر پوچھا۔
پھیماں نے نظریں اٹھائیں اور منہ بنا کر کہا: "بند کر دیئے ہیں میں نے۔"
فید کی نظریں اس کیس پر کھٹکتی جہاں دھوپ تختہ بنی چمک رہی تھی: "کیوں؟"
وہ آہستہ سے بولا۔

"مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں وہ بھی بابا خیرو کے ہتھکے نہ چڑھ جائیں۔ نہ آپ کو نظر آئیں گے نہ آپ مانگیں گے۔"

رشید اٹھ کر بیٹھ گیا اور بڑے جوش سے بولا: "پھیماں۔ یہ کام بے استاد کے نہیں ہوتا۔ بابا خیرو استاد ہے۔ میں نے اسے خود چاندی بناتے دیکھا ہے۔"

پھیماں چڑ کر بولی: "جتنا سونا اس کے پیچھے تم نے گنوا یا ہے اس سے تو ہم چاندی کے ٹوٹے خرید لیتے۔ تو بہ! بڈھا ہے کس قدر شوقین الزمانے کی کوئی فرمائش ایسی نہیں جو رہ گئی ہو۔"

رشید نے بابا خیرو کی طرف داری میں کہا: "شوقینی کی کیا بات ہے۔ اکیلی جان ہے کسی طرح تو اپنا راجھا راضی کرنا ہی پڑتا ہے۔ . . . سونا بنانا بھی تو بڑی بات ہے۔"

"مجھے تو چور لگتا ہے پورا۔ . . . سونا بنا سکتا تو یوں تم سے چیزیں نہ مانگا کرتا۔"
رشید نے جلدی سے کہا: "ارے یہ قوت! میں اس کا کوئی سا گھر بھر دیتا ہوں۔ . . ."

کبھی کبھار کوئی ایک آدھ چیز لے جاتا ہوں۔ بابا خود ہی بڑا سخی ہے۔ بڑا وسیع کاروبار ہے۔ آٹے دن شہر جاتا ہے بڈھا۔ سونا بیچنے ہی جاتا ہے ورنہ اس کے کون سے لڑکے کالجوں میں پڑھتے ہیں۔

”تمہیں تو ابھی سونے کی کیل تک بنا کر نہیں دی۔“

رشید چڑکھ بولا: ”ممتا رے جانو تو ہینک لگے نہ بھٹکڑی اور سونے کی اینٹیں کہیں سے مل جائیں۔ گندھک آملہ سار کا تیل بنانا سیکھ لیا ہے۔ پاتال جنت کے عمل کرنا جانتا ہوں۔ اب دو چار دن اور لگاؤں تو یقیناً سونا بن جائے گا۔ نسخہ میں جانتا ہوں فقط دو ایک باتیں وقت طلب ہیں۔ جو یہی گتھیاں حل ہو گئیں تب رے لئے سونے کی اینٹیں لادیں گے۔“

”میں تو کہتی ہوں کوئی اور کام کرو۔ اب تو چا چا جی بھی شک کرنے لگے ہیں۔“ چھیاں بابوں میں لنگھی کرتے ہوئے بولی۔

”اور کیا کام کروں۔ کہتی ہو تو شہر چلا جاتا ہوں لیکن وہاں بھی کتابت ہی کرنا پڑے گی کونسا وہاں پہنچ کر لوگ تحصیلدار لگا لیں گے۔“

”پھر بھی۔“

رشید نے بڑے جوش سے کہا: ”چھیاں میرا جی کہتا ہے کہ بابا خیر و سونا بنانے کی ترکیب جانتا ہے۔ میں جانتا ہوں وہ اصلی بات بتاتا ہوا کتنی کھڑا ہے لیکن تابہ کے ؟ ارے بھلیے چھ ماہ کی محنت کیا پونہی اکارت جائے گی تو مجھے بس مینہ بھر کی اور مہلت دیدے۔ پھر دیکھ کیا ہوتا ہے۔“

چھیاں نے کندھے پر برقعہ اٹھا یا اور بولی: ”میری طرف سے مہلت ہی مہلت ہے۔ لیکن اب ہمارے پلے کیا رہ گیا ہے جس پر بابا خیر وہ سمجھے گا ؟۔ میں زینب کی طرف چلی ہوں وہاں آج گیا ہوئی کا ختم ہے شام کو آجاؤں گی۔“

جانے سے پہلے چھیاں نے ایک نظر اپنے پھولوں والے کبس پر ڈالی اور پھر چور نظروں

سے رشید کو دیکھتی ہوئی چل دی۔

جس وقت رشید ممدو کی دکان پر پہنچا شام تونہ ہوئی تھی لیکن دوپہر ڈھل چکی تھی۔ بد قسمتی سے ممدو کی دکان پر بڑا سا تالا پڑا تھا۔ رشید کا دل جھج گیا اور اسے واسکٹ کی اندرونی جیب بھاری لگنے لگی۔

اپنی دکان کے سامنے وہ کئی کترا کر نکل گیا۔ شیخ جی بازار کی جانب پیٹھ کے کسی کتابت کو تنکبے میں کس رہے تھے۔ بانار سے نکلتے ہی اس کی رفتار تیز ہو گئی۔ اب اس کے جی میں یہ محسوس ہوا تھا کہ جلد از جلد بابا خیر و کے ڈیرے پر پہنچ جائے۔ راہ میں جہاں کھجوروں کا جھنڈا اور اینٹوں کا جھنڈا تھا اور جہاں پہلے پہل وہ بابا خیر و کا مرید ہوا تھا وہاں پہنچ کر اس نے اپنی اندرونی جیب ٹوٹی اور پھر ریلوے لائن کی طرف بھاگنے لگا۔

بابا خیر و کی بھونپڑی تک پہنچتے پہنچتے شام ہو چکی تھی۔ کیکر کے درخت اب سیاہ دھبے سے لگتے تھے اور لائن کا پچاٹک دھاریاں سی نظر آتا تھا۔ بابا خیر و کی بھونپڑی میں اندھیرا تھا۔ رشید نے نظر دوڑائی تو کچھ فاصلے پر بابا خیر و کو پتنگ اڑانے دیکھا وہ بھاگ بھاگ میدان میں پہنچا۔

”آگیا۔ شیخ بچے!“

”جی۔ اتنے دن انتظام نہ ہو سکا اس لئے نہ آسکا۔“

”تیرے بعد۔ میں نے تیل بنالیا۔“ اس نے پوچھا تو سونا بن گیا۔ وہی رنگت وہی وزن۔“

رشید کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ آہستہ سے بولا: ”اندھ چلے بابا جی میں کچھ لایا ہوں۔“

”تو چل میں آیا۔ اس وقت ٹھکی نہ دی تو پتنگ آگرے گی۔ بڑی مشکل سے آج چڑھایا ہے اسے۔۔۔۔۔ ہوا بالکل بند ہے۔“

”بند کریں اس مشغلے کو۔ میں بڑا سامان لایا ہوں بابا خیرود۔“
پتنگ اور گولا سنبھال کر جب دونوں بھونپڑی کے اندر پہنچے اور بابا خیرود نے دیا سنگایا تو رشید نے کہا: ”تو پھر بن گیا سونا بابا خیرود۔“
”ہاں بن تو گیا ہے لیکن ہے بھر بھرا جیسے ریت ہوتی ہے لیکن خیر دیکھوں گا۔ اور پٹھے۔“
”تو کون سا سامان لایا ہے آج؟“

رشید نے بابا خیرود کی بات سنی تو اس کا دل مجھ گیا۔ مجھ پر پہلے اس کا دل کھل گیا تھا۔ آج کیسی امید بندھ گئی تھی کہ وہ واپسی پر وہ پھیمان کو یہ مزدہ سنا کر اپنا گناہ بخشالے گا۔ اب اُسے بددلی سے اندرونی جیب ٹٹولی اور کنگن کی بوڑی ہتھیلی پر رکھ کر بابا خیرود کی طرف بڑھا دی۔
بابا خیرود کچھ دیر کنگن دیکھتا رہا پھر ہولے ہولے اس کی دائیں آنکھ رشید کے چہرے پر جم گئی۔ وہ آہستہ سے بولا:

”یہ کنگن کس کے ہیں رشید۔“

”جی۔ چھیاں کے ہیں۔“ وہ ہنسنا شروع ہوا۔

خیرود کے جڑے تن گئے۔ اس کی دائیں آنکھ میری بوڑی کی طرح سرخ ہو گئی۔ ”اب تک تو نے کیا کیا بیچ کھایا ہے رشید۔ سچ بول ورنہ ابھی مار ڈالوں گا۔“

رشید نے تعجب سے بابا خیرود کو دیکھا اور کہا: ”بس یہ کنگن باقی ہیں سولے آیا ہوں۔“
خیرود غصے سے قہر قہر کانپنے لگا اور گرجا کر بولا: ”یہ دیگ دیکھتا ہے؟ دیکھتا ہے یہ دیگ۔ اس میں میری روشناں کا زیور آیا تھا میں نے سب بیچ کھایا۔۔۔۔۔ ایک ایک چیر گنوا دی اور روشناں بھی گنوا دی لیکن یہ دیگ یہیں ہے۔ اور یہیں رہے گی میں صبح شام اسے دیکھ کر کہتا ہوں تو روشناں کی آخری نشانی ہے تجھے بیچ کھاؤں تو منور کھاؤں، کھاؤں

..... جا بھاگ جا۔ یہ کنگن لے جا ورنہ روشناں کی طرح وہ بھی چلی جائے گی۔ جا ابھی بھاگ جا۔۔۔۔۔ جا کھڑا میرا منہ کیا کھتا ہے۔۔۔۔۔ جا۔۔۔۔۔ روشناں کا باپ سونا بنا لیتا تھا لیکن میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ جا بھاگ جا۔ ابھی وقت ہے۔ ورنہ سونا تو کیا بنے گا۔ مٹی کے ساتھ مٹی ہو جائے گا۔۔۔۔۔ جا۔۔۔۔۔“

رشید گھر پہنچا تو رات اس بچی تھی۔

ڈیوڑھی میں اندھیرا تھا اور اس کے اودھ کھلے پٹ میں کوئی کھڑا سجانک رہا تھا۔ رشید دھڑکے دل سے اندر داخل ہوا تو شیخ جی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا:

”بیٹا۔ تم سے چھیاں لڑی تھی کیا؟“

رشید کی زبان نے کتنی ہی دیر تک تھمنا دیا۔ پھر وہ آہستہ سے بولا:

”نہیں توجی!“

”پھر پتہ نہیں کیا بات ہے۔ شام کو اتنی تو بڑی دیر تک ٹرنک بستر جھاڑتی رہی پھر اپنا سامان باندھ کر چلتی بنی۔ کہنے لگی۔۔۔۔۔“ چاچا جی کہا سنا معاف کر دینا۔“

رشید کا ایک ایک پیر من من کا ہو گیا۔

”بھاگ کر سٹیشن تک تو دیکھ آؤ۔ شاید ابھی گاڑی نہ گئی ہو۔۔۔۔۔ شاباش بیٹا شاباش۔۔۔۔۔“

رشید سٹیشن پر نہ گیا بلکہ اسی چھانک پر جا پہنچا جہاں بچپن میں وہ اور فقیرا دیل دیکھنے جایا کرتے تھے۔ چھانک بند تھا۔ اس کا جی چاہا کہ کنگن اٹھا کر دیل کی پٹری پر رکھ دے۔ اور جب دیل کے پیسے اسے پیس کر نکل جائیں تو آرام سے گھر چلا جائے۔ پھر دُور سے انجن سیٹی بجاتا ہوا دھواں اڑاتا ہوا نکلا۔ اس کے پیروں تلے زمین کانپنے لگی۔ دُلوں میں

کھتے ہوئے آدمیوں کے عکس اور روشنی کے تختے زمین پر بھاگتے چلے گئے۔ رشید غور سے گاڑی دیکھتا رہا۔

دور جگنوؤں کی قطاری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ صرف فضا میں گاڑی کے پہیوں کا شور رہ گیا۔ جیسے اب بھی وہ لائق نظر کا ورد کرتی چلی جا رہی ہو۔
پھر کنگن ہاتھ میں گھسے ہوئے پیسے کی طرح سنبھالے وہ بابا فیرو کی جھونپڑی کی طرف پلٹ گیا۔

جھکورا



شہر کی طرف آتے ہوئے شیر پاؤ پل سے کچھ آگے جہاں گلبرگ کی جانب مڑنے والی سڑک ہے۔ اس موڑ سے قریباً دس پندرہ فٹ پہلے وہ مجھے ملا۔ میرا خیال ہے کہ چند لمحے پہلے سڑک پر کوئی آدمی نہیں تھا۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ اسی طرح پہلے سے موجود ہاتھ ہلا کر کار روک رہا ہو اور میں اپنی خود نگری کی وجہ سے اسے دیکھنے سے معذور رہا ہوں۔

سردی تھی — بہت سردی تھی۔ خزاں دیدہ پتے گلبرگی درختوں سے اتر کر سڑک پر ہر جانب ہو لے ہو لے پانی کی لہروں جیسے آگے بڑھ رہے تھے۔ کچھ فاصلے پہنچ کر پمپ کی کھڑکیوں کے تمام شیشے دھند آلود تھے۔ موسم پر سال سے بچھڑنے کا غم طاری تھا۔

میرا خیال ہے اس وقت اس نے دھاری دار پیٹ اور اونچے کالر کا سیاہ سویٹر پہن رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر نہ تو ڈاڑھی اور نہ ہی مونچھیں تھیں۔ لیکن جس وقت میں نے ڈرائیور کی ساتھ والی سیٹ کا دروازہ کھولا اور اس نے چھوٹے ایئر بول بیگ کو گود میں رکھ کر دروازہ بند کیا۔ اس وقت وہ سفید قمیض شلوار اور سیاہ کوٹ

پہنہ ہوئے تھا۔ اس کی گھنٹی ڈانڈی ہی نہیں بچھیں ملی ہوئی تھیں۔ شاید اس سے پہلے میں سبز بتی میں بنا ہوا تیر کا نشان غور سے دیکھ رہا تھا۔ جب اچانک خالی سڑک پر اپنی جی کا نشان مل جائے تو بڑی کوفت ہوتی ہے۔ کیونکہ خالی سڑک پر تو جیسے بھی اپنا حق ہوتا ہے۔ ہری جی کی چترائی اس وقت لہجی نہیں لگتی۔

”میں آپ کی کار کبھی نہ روکتا۔ لیکن مجھے گیارہ بجے والی فلائیٹ سے کراچی جانا ہے اور اس وقت کوئی سواری نہیں مل رہی اتفاق سے“

میں ابھی کچھ دیر پہلے اسلام آباد روانگی کے لئے اپنی والدہ کو انٹرپورٹ پر چھوڑ کر آ رہا تھا۔ انٹرپورٹ کی طرف واپس لوٹنا مجھے ناگوار گزرا لیکن میں نے ایسی شائستگی سے جس کے تلے ناگواری چھپی تھی کار موڑ لی۔ راستہ سمنان تھا۔ اس کے بیگ کی شکل سے شبہ ہوتا تھا۔ جیسے وہ اس میں خشیش، یا ہیروئن لے کر جا رہا ہو۔ اس نے براؤن بیگ کو بڑی سختی سے اپنے ہاتھوں میں پکڑ رکھا تھا۔

”ایک بار اسی طرح میں لینن گراڈ میں بھی پھنس گیا تھا۔ لیکن اللہ نے آپ جیسا اہتمام وہاں بھی کر دیا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا خدا ایسے دنیاوی انتظامات میں دلچسپی لیتا ہے؟“

میں نے نئی مازدا کی اندرونی نیلی جی میں ایک نظر اس پر ڈالی۔ وہ مجھے لات مانات کی شکل کا فرشتہ نظر آیا۔ اس کا چہرہ ساخت کے اعتبار سے یہودی تھا۔ رنگت اس کی قبائلی پٹھانوں کی طرح ارڈی ارڈی شگر فی سفید تھی میں اس کے ساتھ خدا اور اس کے انتظامات کو زیر بحث لانا نہیں چاہتا تھا۔

”کبھی آپ کو ایسا اتفاق ہوا ہے؟“

”جی نہیں۔“

”شروع زندگی سے میں ایسے ہی واقعات سے دوچار رہا ہوں۔ مجھے جیسے کوئی

اندرونی طاقت آنے والے واقعات کے لئے بہت پہلے تیار کر دیتی ہے۔“ وہ چہرے سے بہت خاموش نظر آ رہا تھا۔ یوں نہیں تھا کہ وہ کسی اجنبی کے ساتھ پہلی ایمر جنسی ملاقات میں ایسی باتیں کرنے پر رضامند ہو سکے۔

شیر پاؤں کچھ ایسا لمبا نہیں ہے لیکن اب مجھے محسوس ہونے لگا کہ اس سڑک پر لگی ہوئی چھوٹی چھوٹی بتیاں دونوں جانب بنی ہوئی دیوار لامتناہی تھی۔ یہ پل جس قدر پیچھے کی طرف طے ہو جاتا اسی قدر آگے کی طرف بڑھتا۔ شاید پلوں میں یہ خاصیت ہوتی ہے کہ دن کے وقت یہ جلدی طے ہو جاتے ہیں۔ اور رات کو؟

”جب میں چھوٹا تھا۔ تو مجھے خواب میں پتہ چل جاتا تھا کہ کون بیمار ہونے والا ہے پھر۔ جب بھائی یا ماں بیمار پڑ جاتی تو مجھے زیادہ حیرت یا دکھ نہ ہوتا۔ آپ کے ساتھ کبھی ایسے ہوا ہے؟“

”جی نہیں۔“

ابھی تک ہم شیر پاؤں کو کراس نہیں کر سکے تھے۔

”ہاں کچھ لوگوں پر صدمہ یا حادثہ اس لئے بھی شدید ہوتا ہے کہ وہ اس لئے تیار نہیں ہوتے۔ پچھلے سال میرا موٹر سائیکل ایک ٹرک سے ٹکرا گیا۔ موٹر سائیکل پاش پاش ہو گیا۔ لیکن سوائے میرے ماتھے کے اور کوئی خراش نہیں آئی۔ بس یہ دیکھئے یہاں ایک انچ بھر نشان ہے۔“

میں نے اس کی طرف نگاہ ڈالی اس کے ماتھے پر ایک انچ لمبا زخم کا نشان تھا۔

”یہ بھی کوئی حادثے کی وجہ سے نہیں پڑا۔ حادثے سے بہت پہلے۔“

میں جانتا تھا کہ۔ ایک ٹرک جس کا نمبر ۱۳۷۲ ہو گا اور جس کے پیچھے پیو یا رنگ

نہ کر لکھا ہو گا اس سے میرا موٹر سائیکل ٹکرائے گا۔ میں حادثے سے بہت پہلے

اس کے لئے تیار تھا۔ جس وقت میں ٹرک کی زد میں آیا۔ میں نے چھلانگ لگا دی

سائیکل سے، افسوس جہاں میں کودا ہوں وہاں کوئی ہوئی روڑی پڑی تھی۔ ایک پتھر اڑ کر میرے ماتھے کو زخمی کر گیا۔“

”جی۔۔۔“

چھاؤنی کا علاقہ سردی کی رات میں بڑی ترتیب اور خاموشی سے سویا ہوا تھا۔ اس کی دوکانوں کے دروازے بند، کوٹھڑیوں کے پھاٹک مقفل اور راستوں کی چوکیاں خالی تھیں۔ فٹ پاتھوں پر پتے دسمبر کی پہلی بارش میں بھیگ کر چمکنے لگے تھے۔ میری کار کا دائر چلنے لگا اور بارش کے پہلے قطروں سے بانٹ بھیگ کر سیٹیل کی طرح روشن ہو گیا۔

”سنئے تھے کہ اگر کسی کو حادثہ پیش آنا ہو تو گھر سے ہی موت اس کے ہمراہ ہو جاتی ہے۔“

اس وقت میرا ارادہ ہوا کہ اسے دھکا دے کر کار سے باہر نکال دوں۔

”لیکن یہ بھی سنا ہے کہ اگر راستے میں وہ موت کے ساتھ اچھا سلوک کرتے تو کئی بار موت اسے ساتھ نہیں لے جاتی؟ آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا موت انسان کی مہربانیوں سے اپنے فیصلے بدل سکتی ہے؟“

بد قسمی سے کاریں ہیٹر نہیں تھا اور مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی پر ٹھنڈے پانی کی پتلی سی دھار پڑتی محسوس ہو رہی تھی۔

”میری موت سے ملاقات نہیں ہے۔“

”ہاں کچھ لوگ صرف ایک بار موت سے ملتے ہیں اور پھر واپس آکر کسی کو کچھ بتا نہیں سکتے۔ لیکن میں موت سے کئی بار ملا ہوں۔“

اب مجھے اس سے باضابطہ طور پر خوف آنے لگا تھا۔ اگر کار کے سکڈ کرنے کا ایسا خدشہ نہ ہوتا تو میں سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتا۔

”وہ اپنی خوشبو سے پہچانی جاتی ہے۔ جہاں کہیں سے بھی گزرتی ہے اس کی خوشبو سے تھوڑی دیر کے لئے ہر درخت پتا جاندار ساکت ہو جاتا ہے۔ جیسے کلوروفارم کے اثر تلے آگیا ہو۔“

ایئر پورٹ اچانک بہت دور چلا گیا تھا۔ ریگستان میں کھویا ہوا نخلستان ارد گرد کی آبادی سو رہی تھی اور میں اس خوبصورت مرد کے ساتھ بالکل تنہا تھا۔

”موت کی خوشبو بہت لمبی ہوتی ہے۔ ایک تانے کے ہزاروں حصے میں آتی ہے۔ لیکن یہ خوشبو کسی اور خوشبو سے نہیں ملتی۔ آپ کو سمجھاؤں کیسے بڑا مشکل کام ہے۔ اگر بھیگے ہوئے نارنگی کے باسی چھلکوں میں تھوڑا سا مشک نافہ اور تھوڑے سے لونگ ملا کر بھاپ تیار کی جائے جس کو (CONDENSE) کر کے ایتھر کی شکل دی جائے تو۔۔۔“

”دیکھئے یہ کار میرے چچا کی ہے۔ میرے پاس ابھی صرف (LEARNERS) کا لائسنس ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کے لئے بھی بہتر ہے اگر آپ۔۔۔“

”آپ پڑھتے ہیں؟“

”جی میں انجینئرنگ کے فائینل میں ہوں۔“

”لیکن اب تو یہ پروفیشنل لڑکیوں میں مقبول نہیں رہا۔ پھر آپ نے یہ پیشہ کیوں چنا۔۔۔“

”لڑکیاں اب بھی انجینئروں سے محبت کرتی ہیں۔“

”جی میرا خیال ہے کہ یہ ڈاکٹروں کا عہد ہے۔ ڈاکٹر جیسی سیکورٹی کوئی مرد آفر نہیں کر سکتا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟“

وہ پہلے ایک بات سختی اور وثوق سے کرنے کے بعد یک دم ڈھیلا پڑ کر سوالیہ بات کر بیٹھا تھا۔ کار بڑی تیزی سے آگے جا رہی تھی۔ لیکن راستے کے تمام درخت پیچھے کی طرف بھاگنے کے بجائے آگے کو سرٹ دوڑے ہوئے تھے۔ یہ (PHENOMENON)

میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔

”مٹری کے جوان بھی کافی آؤٹ آف ڈیٹ ہو گئے ہیں۔ شادی کی ELEGIBILITY کے اعتبار سے۔“

میری ونڈ سکریں پر بارش کے باوجود صوبی بلی کی طرح چادریں لپٹی لپٹائی بیٹھی

ہوئی مسکرا رہی تھی۔ اچانک اسے ساتھ پا کر میری ہمت بڑھنے لگی اور میں نے کار کی رفتار آہستہ کر دی۔

”لیکن لڑکیوں کے معاملے میں ہمیشہ محتاط رہنا چاہیے یہ بلاوجہ کسی وقت

بھی اپنی رائے بدل سکتی ہیں۔“

”خیر بلاوجہ تو کوئی لڑکی اپنی رائے نہیں بدلتی۔“

”آپ کو عورتوں پر بہت اعتماد ہے؟“

”عورتوں پر نہیں مجھے اپنی کمزن صوبی پر بہت اندھا بھروسہ ہے۔“

پتہ نہیں میں کیوں اس سے باتیں کرنے پر مجبور تھا۔ حالانکہ مجھے اس کے

بیٹھے کا طریقہ اور بہادری پوری تھی اس وقت بہت بُری لگ رہی تھی۔

”عورتیں نہ بدلیں تو صدیوں نہیں بدلتیں۔ لیکن جب ان کا دل بدلتا ہے تو

ایک پل بھی نہیں لگتا۔ نہ صرف وہ نظریے رائے یا سوچ بدل لیتی ہیں۔ بلکہ ان کا سارا

رویہ ان کے تمام MOLECULE بدل جاتے ہیں جسم کے“

”یہ بات مرد کے متعلق بھی کہی جاسکتی ہے؟“ میں نے چڑ کر کہا۔

”بلکہ یہ بات چونکہ ہمیشہ مرد کے متعلق کہی گئی ہے۔ اس لئے یہ بات

(SHOCKING) نہیں رہی، عورتوں کے متعلق تعجب ہوتا ہے۔ اس نے منہ

میں سگریٹ لی۔ بائیں ہاتھ کا پیالہ بنا کر جلتی باتیں سے سگریٹ جلایا، اس وقت

مجھے لگا۔ اس کی ہتھیلی میں دل کی شکل جیسی روشنی ابھری اور پوری قوت کے

ساتھ پیپ کرنے لگی۔ مجھے لگا۔۔۔۔۔ اس کا دل سینے کے بجائے ہاتھ کی ہتھیلی

میں تھا اور سگریٹ کی روشنی کے باعث میں نے اسے برہنہ دیکھ لیا تھا۔

بکرے کے دل کے سوائے میں نے آج تک کسی جاندار دل کو نہیں دیکھا۔

میں اپنے ہمسفر سے خوفزدہ تھا۔ لیکن اپنے خوف کے اظہار کے لئے مجھے کوئی مناسب

الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ میں باتوں کا رخ بڑی دنیاوی معمولی حقیقتوں کی طرف

موڑا۔

”آپ کراچی میں کیا کام کرتے ہیں؟“

”مختلف وقت پر مختلف کام۔“

”کیا مطلب؟“

”پہلے میں انٹر ٹریول ایجنسی میں ملازم تھا۔ پھر کچھ دن میں نے بوری بازار

میں کاروبار بھی کیا۔ ایک ویلکی میں بھی رہا ہوں کچھ عرصہ۔ دراصل کراچی میں

ملازمت اہم نہیں ہوتی۔ کراچی شہر اہم ہوتا ہے۔“

میں اب کچھ کچھ محفوظ ہو رہا تھا۔

”ہر بڑا شہر اہم ہو رہا ہے وہاں کے لوگ اہم نہیں ہوتے۔ کراچی بڑا ہے

— اہم ہے وہاں کے لوگ اپنی اہمیت بنانے کی خاطر بہت کچھ کرتے رہتے ہیں۔

جہاں آگ لگی ہو وہاں صرف آگ نظر آتی ہے۔ جلنے والی چیزوں کا وجود نہیں رہتا

۔ بڑے شہر بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔“

”آج کل آپ کیا کرتے ہیں۔“

وہ بڑی دیر تک اپنے بیگ کو سخت ہاتھوں کی گرفت میں پھولتا رہا۔

”آج کل۔“

”جی آج کل۔“

”اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ شاید اس کے بیگ میں سمگل کی ہوئی گھڑیاں ہیرے یا پتھر تھیں۔“

”کچھ دیر میں ایک ایسے گروہ کے ساتھ بھی رہا ہوں۔ جو سیل بوٹز میں سمگلنگ کرتے ہیں۔ میرے ساتھ تین مکرانی اور ایک پٹھان لڑکا تھا۔ ہم بظاہر مچھلیاں پکڑنے کے لئے کئی کئی میل اندر جایا کرتے تھے۔ لیکن ہمارا کاروبار بہت مختلف تھا۔“

”مجھے پھر اس کی قزاقی ڈاڑھی سے خوف آنے لگا۔“

”کبھی آپ پکڑے نہیں گئے۔“

اس نے میری طرف ایک بخرسی نگاہ ڈالی اور ہولے سے بولا۔ ”اتفاق سے میں کبھی پکڑا نہیں گیا۔“

”آج کل کیا کرتے ہیں آپ کراچی میں۔“

مجھے لگا۔۔۔۔۔ شیر یاؤ کا پل ایک جست میں ختم ہو گیا اور ہم لاہور ایئر پورٹ میں داخل ہو گئے۔ جس وقت وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا کراچی فلائٹ کی ٹائممنٹ ہو رہی تھی۔ اس نے مجھے رسماً سلام کیا اور بغیر شکریہ ادا کئے۔ اندر کی طرف بھاگ گیا۔ میں نے کار موڑی اور سگریٹ سلگانے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میرا بٹوہ غائب تھا۔ بریک لگا کر میں نے بار بار تمام جیبیں دیکھیں سامنے سیدٹ کے ادھر ادھر پھیلی سیدٹ پر ہر جگہ تلاش کیا۔ لیکن بٹوہ غائب تھا اور اس میں میری فیس کے علاوہ پانچ سو روپیہ نہ اُٹھتا۔

سرخ ڈاڑھی والے کی چابکدستی سے معجوب ہو کر میں نے گھر کا راستہ لیا، شیر یاؤ پل کے عین وسط میں جہاں سے سامنے کانٹیب واضح ہونے لگتا ہے۔ وہاں یکدم وہ دروازہ کھل گیا۔ جس طرف سے وہ جیب کترا اندر داخل ہوا تھا۔ میں چونکہ کا رتیز چلا رہا تھا۔ اس لئے میں نے جلدی سے دروازہ بند کرنے کی کوشش

کی۔ اس کوشش میں کار ڈول گئی اور پچھلی طرف سے زن کرتی ایک سفید کار ایک ثانیہ بعد میری گاڑی کو کراس کر کے آگے نکل گئی۔ اگر کار کا دروازہ چند لمحوں بند نہ ہو جاتا تو دونوں تیز رفتار کاروں کا حادثہ ہو جاتا۔

جس وقت میں اپنے بچاکے گھر داخل ہوا ساری سڑک خاموش تھی صرف گھروں کی بیرونی روشنیاں جل رہی تھیں۔ گھر میں کسی قسم کی پہل پہل نہ تھی۔ صرف ایک سفید کار پورچ میں کھڑی تھی۔ میں نے گھنٹی بجائی۔ میرے لئے صوبی نے دروازہ کھولا۔ وہ کالی چادر اوڑھے سر سے پاؤں تک پوشیدہ تھی۔

اتنی دیر کیوں لگادی۔“

میں نے اسے اجنبی مبصر کے متعلق بتانا چاہا لیکن آج صوبی کے رویے میں کچھ ایسی بات تھی کہ میں اسے کچھ نہ کہہ سکا۔

”چابیاں لے لو۔“

میں نے چچا کی نئی مزدی کی چابیاں اسے دیدیں۔ اس چابیوں کے گچھے میں کوٹے کے پتھر کا گھڑا ہوا دل بھی شک رہا تھا۔

میں نے صوبی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے پاس لانے کی کوشش کی۔ آج اس کے ہجیم میں وہ الٹا شک کیفیت نہیں تھی۔ اس سے پہلے اگر کبھی اندھیرے صوبے ہم دونوں ٹکٹے ہیں مل جاتے تو وہ ہول کے رخ پر اڑنے والے پکڑے کی طرح میری طرف بڑھتی آتی۔

”کیا بات ہے؟“

”کچھ نہیں۔“

اس کا لہجہ شک سمجھنے کی طرح بے رس تھا۔

”کچھ ہوا ہے۔“

”کچھ نہیں۔“

”پھر ایسے کیوں بول رہی ہو۔“

”اور کیسے بولوں؟۔“

”جیسے ہمیشہ بولتی رہی ہو۔ قریباً چار سال سے۔“

وہ چپ چاپ اندر کی طرف چلی گئی۔ اس کی چال میں۔۔۔۔ خاص قسم کی پیزی تھی۔ جیسے اس کا معدہ خراب ہو یا بخار کی آمد آمد ہو۔ میں دیر تک سونے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن واقعات کے اٹ پھیر کی نگہ مجھے نہ آ رہی تھی۔ پھر صوبی کے بدلے ہوئے موڈ نے تو رہی سہی کسر پوری کر دی تھی۔ بالآخر میں نے ڈرینگ گاڈن پہنا اور صوبی کے کمرے پر جا کر دستک دی۔ اندر سے اتنی رات گئے بھی آوازیں آ رہی تھیں۔

صوبی نے دروازہ کھولا۔ وہ ابھی تک کالی چادر میں سر سے پاؤں تک ڈھکی ہوئی تھی۔

”جی سر۔“

”میں اندر آ جاؤں۔“

”آ جاؤ۔ کیوں کیا بات ہے۔“

صوبی کے پنگ کے پاس چھوٹے سے سونے پر ایک اجنبی بیٹھا تھا۔ اس نے دھاری دار تپلون اور اپنے کار کا سیاہ سویٹر پہن رکھا تھا۔ وہ خطرناک حد تک کلین شیڈ تھا۔

میں کچھ کچھ OUT SIDER کی طرح ان دونوں کی ملاوٹ کا اندازہ لگانے

لگا۔

”یہ منصور ہیں۔“ ابھی ابھی آئے ہیں کراچی سے، تم سے کوئی دس

منٹ پہلے۔“

”منصور۔؟“

”جی پچھلے سال میں صوبی سے ملا تھا کراچی میں۔۔۔۔۔“

پچھلے سال جب وہ کراچی گئی تھی؟ لیکن آج تک اس نے کبھی مجھ سے ذکر نہ کیا تھا کہ وہ کسی منصور کو بھی جانتی ہے۔

”میں ڈاکٹر ہوں کراچی میں۔ ڈیفنس میں میرا کلینک ہے۔“

میں نے صوبی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ چچا کا گھرانہ اتنا ماڈرن تو تھا کہ اس میں کوئی منصور کسی وقت داخل ہو سکتا تھا لیکن اس قدر گھٹیا نہیں تھا کہ جیسے بات توڑے بغیر صوبی کسی منصور کو اپنے بیڈ روم میں آنے دیتی۔

”ہم نے فیصلہ کیا ہے۔ ہم شادی کر رہے ہیں۔“

میرے اندر باہر گنت جاری ہو گئی۔

”دراصل یہ فیصلہ میں نے ابھی کیا ہے۔ ابھی پانچ منٹ پہلے۔“

صوبی نے غصے کی طرف مڑتے ہوئے کہا:

”اگر منصور کراچی سے آج نہ آتے تو شاید میں یہ فیصلہ نہ کرتی۔“

صوبی غصے کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ میں بند دروازے کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

”بیٹھے۔ بیٹھے ناں۔“

میں کھڑا رہا۔

”ابھی میرے ساتھ ایک عجیب واقعہ ہوا۔“

میں نے ڈر کر اس کی طرف بھرپور نگاہ ڈالی۔ منصور کے متھے پر اچھتی سی چوٹ کا ایک اپن نشان تھا۔

”میرا خیال ہے کہ — لیکن میرا کچھ خیال نہیں — شاید میں ہمت زیادہ تو
ہوں اس لئے باتوں کو صحیح CONTEXT میں نہیں سمجھ سکتا۔“

صوبی غسنلے کے اندر تھی۔ وہ فیصلہ بدل چکی تھی چار سال کی مسلسل محبت
کو پانچ منٹ میں اوداع کہہ کر نیا غسنلے کے اندر وہ منہ پر کریم ل رہی تھی۔ شاید
اس کا رویہ بھی مکمل طور پر بدل چکا تھا۔
منصور نے مجھے سگریٹ پیش کئے۔

”جی ابھی ابھی میں نے سگریٹ بھجایا ہے۔ شکریہ۔“

منصور نے سگریٹ منہ میں لیا۔ ماچس جلائی پھر بائیں ہاتھ کا پیالہ ہانک کر ماچس کیلئے
اٹ بٹائی۔ مجھے لگا۔۔۔۔۔ ایک سرخ دل اس کی ہتھیلی میں روشن ہو گیا اور قلب
کی حرکت مجھے صاف صاف دکھائی دینے لگی۔ میں نے اس کے چہرے کو دیکھا۔ اس پر
ایک اچھلکا نہم کا نشان تھا۔

”میں صوبی کی زندگی میں داخل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ میں — پتہ نہیں آپ کچھ کیسے
سمجھاؤں کہ ابھی دس منٹ پہلے جب میں لاہور میں داخل ہوا۔ میرا رادہ صوبی سے ملنے کا
بھی نہ تھا — پھر اسٹریٹ سے ادھر شہر کو آنے کے لئے میں نے اپنے دوست
کی کار سٹغاری۔ جہاں تیر پاد پل ہے وہاں ... ایک آدمی نے مجھ سے لفٹ
مانگی ... اور ... میں اور وہ باتیں کرنے لگے۔ آپ کا کیا خیال ہے تیر پاد
پل کتنا لمبا ہے؟“

”کچھ زیادہ نہیں۔“

”کراچی سے آئیں تو پہلے پہل فاصلوں کا اندازہ نہیں ہوتا۔ میرا خیال تھا کہ یہ پل
پانچ سات میل سے کم نہ ہوگا۔
میں نے اس کی طرف سر سے دیکھا۔

”میں حیران ہوں کہ وہ اجنبی میرے اندر کے حالات سے کیسے واقف تھا
صوبی کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ اس ہی کی وجہ سے ہوا۔۔۔۔۔“
اس کے بعد وہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی رہپ پاکٹ سے میرا پرس نکالا
اور بولا:

”حیرانی کی بات ہے کہ اس کا پرس میری کار میں گم گیا — میں تو اس شہر میں
قریباً اجنبی ہوں۔ لیکن اگر آپ اخبار وغیرہ میں اشتہار دے کر یہ پرس اُسے دوا
سکیں تو مر بانی ہوگی۔“

میں نے پرس اس سے لیا۔ اپنی جیب میں رکھا اور کمرے سے نکل آیا۔ مجھے ہکا
ساشہ تھا کہ وہ مجھ پر ہنس رہا ہے۔



روس سے معذرت کے ساتھ

کسی ملک، شہر، کسی موسم کو جاننے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس پر کسی واقعے یا انسان کی ہر گرجا جائے ورنہ جگہوں کو دیکھ لینے سے کبھی وہاں کا کچھ یاد نہیں رہتا۔ شہر، ملک اور موسم مہٹری یا جغرافیہ میں محسوس نہیں رہ سکتے۔ لمحوں میں زندہ رہ جاتے ہیں۔ جب میں نیا نیا روس گیا تو میرا خیال تھا کہ موسکاؤ کو جاننے کیلئے مجھے وہاں کی تاریخی عمارتیں، ان کا لٹریچر، ان کے اخبار، رہن سہن کا طریقہ اچھی طرح نوٹ کرنا چاہیئے۔ یہ وہ وقت تھا جب میں موسکاؤ یونیورسٹی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے حصول کے لئے داخل ہوا تھا۔ اسی لئے میں نے نہ صرف تیزی سے زبان سیکھنی شروع کی بلکہ وہاں کی عمارتیں اور میوزیم بھی کھنگالنے شروع کر دیئے۔

ہیراسارادن گردن اٹھائے گزرتا۔ خوبصورت بالشتویک تھپڑ جیسی عمارتیں دیکھ دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ روس میں بھی آرکیٹیکٹ کے مختلف اثرات کہیں نہ کہیں سے آتے رہے ہیں جیسے بہتے پانیوں میں جنس و خاشاک اکٹھا ہوتا رہتا ہے۔ بولہاں سے اٹھارویں صدی تک بائی زن ٹائمن اثرات غالب تھے۔ کیف، موسکاؤ، لینن گراڈ ان ہی تین شہروں کو عرصے سے کلچرل برتری حاصل رہی ہے۔ کیونکہ عرصے سے روسی زندگی پر جنگلات حاوی رہے ہیں اس لئے ان کی عمارتوں پر بھی عمارتی لکڑی کا

چو کھٹا سباج ہے۔ یوں سمجھئے روسی آرکیٹکٹ میں عودی تسلسل ہے۔ وہ دوسرے ممالک سے جو کچھ بھی مستعار لیتے ہیں کچھ اسے ایسے مشرف بہ روس کہتے ہیں کہ وہ چیز وہ سٹائل ساختہ روس بن جاتا ہے۔ کیف میں سینٹ صوفیہ کا گرجا جو ام گرجا بت ہے بائی دن ٹائین اثرات کا حامل ہے۔ کرملین کے دو اہم گرجے لاطینی سٹائل کی نشان دہی کرتے ہیں۔ پیٹرز برگ کا تمام عمارتی سرمایہ جرمن، فرانسیسی، اطالوی اثرات سے پُرکشش بنائے۔ نیوا اسکوسٹیٹ یونیورسٹی جس کا میں طالب علم رہا ہوں سکائی بیکر پڑ کے انداز پر بنی ہے اور اس میں تینس منزلیں ہیں۔ کرملین کے خوبصورت موٹلف انگریزوں کی احیا کی خوشبو میں بسے ہیں لیکن روسی لوگ ہاگ ان اثرات کو نہیں مانتے۔ ان کا خیال ہے کہ روس کا سب کچھ ان کا اپنا خود ساختہ ہے۔ اور وہ آرٹ سے لے کر سائنس تک کسی کے مرہونِ منت نہیں رہے حالانکہ انکی سائنسی ترقی میں بھی دوسروں کا ہاتھ رہا ہے۔

جس روز پہلی بار میں ایئر پورٹ سے اتر کر موسکاؤ کی طرف روانہ ہوا تو راستے کی ہمواری، کبھی کبھار خوبصورت دیہاتی، ہنگے جنہیں روسی داپو کہتے ہیں نظر آنے لگے۔ میں نے اپنے ساتھی سے انگریزی میں کہا:

”یہ علاقہ اسلام آباد کی طرح خوبصورت ہے۔ کیا آپ کبھی اسلام آباد گئے ہیں؟“

میرے روسی ساتھی کا رنگ گلابی ہو گیا۔

”اسلام آباد؟ لیکن یہ تمام برج کے درخت ہیں اور موسکاؤ کی آب و ہوا اسلام آباد سے بہت مختلف ہے۔ یہ تمہیں کیسے خیال آ گیا کہ یہ جگہ اسلام آباد لگتی ہے۔“

ایسی ہی ایک غلطی ایک بار ماں نے بھی کی تھی۔ میں تب تین سال کا تھا۔ ہر ماں کی طرح میری ماں کا یہ خیال تھا کہ میں بہت خوبصورت ہوں۔ اسی غلط فہمی کی بنیاد پر

ایک مرتبہ اس نے اپنی جیٹھانی سے کہہ دیا:

”دیکھو تو قیوم تمہارے بیٹے سے کتنا ملتا ہے۔“

میری ماں امان کو ماں کی یہ بات اس قدر بُری لگی تھی کہ اس دن کے بعد انہوں نے ہمارے گھر آنے کی قسم کھالی۔

میں نے بھی اس روز یہ فیصلہ کر لیا کہ روس کی کوئی بات پاکستان سے نہیں ملتی۔ ہاں پاکستان کی تمام باتیں امریکہ اور روس سے ملتی جلتی ہیں۔

ہر نئے سیاح کی طرح اسکاؤ میں نیا نیا پہنچ کر میں بھی وہاں کی تاریخی عمارتوں کو ہی روس سمجھتا رہا۔ کرملین یوٹسکو تھیٹر گرجے گھر، گنٹام سپاہی کی قبر پر جانا میرا معمول تھا۔ اس کے سوا مجھے وہاں کی ہسٹری کا ضبط ہو گیا تھا۔ اپنے ہم وطنوں کو روس کے متعلق معلومات بہم پہنچانا، خطوں میں روس اور پاکستان کا مقابلہ کرنا میرا محبوب مشغلہ تھا۔ رفتہ رفتہ مجھے پتہ چلا کہ جس طرح شاہی مسجد لاہور میں، جہانگیر کا مقبرہ پاکستان میں، ایسے ہی؟ پتھر تلے عمارتیں روس میں ہیں۔ یہاں کے لوگ بھی ان عمارتوں کو اتنی ہی اہمیت دیتے تھے جتنی پانی کو دیتی ہے۔

عمارتوں کے چکر سے نکل کر میں نے میوزیم کھنگالنے شروع کر دیئے۔ آرٹ کا جس قدر ذخیرہ ان موسکاؤ اور لینن گراڈ میں ہے اسے ہی دیکھنے کے لئے ایک عمر کافی نہیں۔ پشکن کے عجائبات آرٹ تھرڈ ورلڈ کے مسافر کو ہمیشہ کے لئے تھکا دیتے

کو کافی ہیں۔ روس کا آرٹ دراصل آرٹ تھرڈ اکس عیسائیت سے بہت شدید طور پر وابستہ ہے۔ اس کا آرٹ IRON PAINTING سے نکلا ہے۔ پہلے پہل وہاں

کے آرٹسٹ حضرت مریم، حضرت عیسیٰ اور مذہبی روایات کو محفوظ اور قابل احترام بنانے کے لئے تصویریں اور بت بنایا کرتے تھے۔ پھر جب منگول حملے شروع ہوئے اور ایشیائی لوگ یہاں رہنے بسنے لگے تو ان کے ساتھ ہی یونانی آرٹسٹ بھی آ پہنچا۔ بلکہ

ہاں ہم یککھ سگ کے اس رستوران میں ملے تھے جہاں ٹالسٹائی نے اپنی
ہیروئن کا ہیولا بنایا تھا اور جہاں تم اپنی ایک سیٹی کے ساتھ سارا وقت پاسٹرناک
اور سولزی ٹسن پر لگ برساتی رہی تھیں

”میرے سامنے ان کا نام نہ لو۔۔۔ انہوں نے گریٹ اشیا کا استحصال کیا
ہے۔ فرد کی عزت بنانے کا یہ بڑا چپ طریقہ ہے۔“

میں چپ رہنا چاہتا تھا لیکن پھر رہ نہ سکا۔
”ان کے ناول ساری دنیا میں مشہور ہیں اور حقیقت کے قریب ہیں۔“
”یہ دونوں مردہ پرست ہیں۔ ماضی کے پجاری ہیں۔ یہ تم مشرق کے لوگوں کو ماضی
سے اتنا پیار کیوں ہوتا ہے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اس طرح حال تباہ ہو جاتا ہے۔
بہتر مستقبل کی کوئی گارنٹی باقی نہیں رہتی۔“

”کیا تمہیں اپنے بچپن سے، اپنے سکول سے، اپنے آبائی گھر سے پیار نہیں۔“
”ہے۔۔۔ پیار ہے لیکن بیماری کی حد تک ہم NOSTALGIA میں
مبتلا نہیں ہوتے۔“

میں نے سڑک کو آہستہ آہستہ پلٹا دیا اور سڑک کے کنارے بنی ہوئی ریلنگ تک
جا پہنچا۔ وہ مجھ سے چند منٹ بعد یہاں پہنچی۔ موسکا ڈوریا میں سورج کے تمام رنگ دفن
ہو رہے تھے۔ دور دور تک موسکا ڈاکشاہ ایک سوئی ہوئی پینٹنگ کی طرح آویزاں تھا۔

”بھلا خوبصورت لمحات کے جادو سے آزاد ہونے کا کیا طریقہ ہے سونیا؟۔۔۔
میں تو ماسکو یونیورسٹی کے سامنے گزارے ہوئے اس آدھ گھنٹے کو اپنے دل سے لے جا کر
ایسے صیقل کرتا رہوں گا کہ بالآخر یہ وقت آئینہ بن جائے گا۔ ہم لوگ کتنا بے گھر ہوتے
ہیں سونیا۔ سیٹی کے اندر ایک خوبصورت لمحے کے آرزو مند۔ ایک قطرے پر
زندگی گزارنے والے۔“

وہ ہنس دی۔

”تم مشرقی لوگوں کو اپنے جذبات پر بڑا اعتماد ہوتا ہے حالانکہ ایسا ہونا نہیں چاہیے
وقت سب کچھ بدل دیتا ہے۔“

وہ دیر تک ہنستی رہی۔ اس کی ہنسی میں کچھ ندامت، کچھ زہر خند اور تھوڑا سا
تصنع شامل تھا۔

روسی لڑکی سولہ سے اکیس سال تک پدنی، کامنی، شائستہ و جمال جلال سب
ہوتی ہے۔ اس وقت میں اسے کوہ قاف کی پری سمجھنا آسان ہے۔ اس کے بعد چاٹی
کی سفید دہی میں خیر لگنے لگتا ہے۔ یہ چیز کی طرح پختہ ہو کر پھیلنے لگتی ہے۔ اس میں
روڑی کوٹنے والے انجن کی طرح مضبوطی آجاتی ہے۔ وہ پھیلتی جاتی ہے۔
مضبوطی کے لئے۔ جگہ کے لئے۔ کپڑوں کے اندر، صوفوں کے اوپر۔ ادھر ادھر
ہر جگہ۔

لیکن جوانی کے شروع میں یہ کسم کے پھولوں کی طرح زردی مائل سفید ہوتی ہے
۔۔۔ زرد خوشبودار اور بے حد نازک۔ شاید اسی لئے اس عمر میں ہر روسی
لڑکی گھر بسانے کی آرزو مند ہوتی ہے کیونکہ اس کے بعد وقت تیزی سے ڈھلنے لگتا
ہے۔۔۔ روسی لڑکی پر دوپہر کے بعد سہ پہر، شام، پہلی رات نہیں آتی بلکہ دوپہر
کے بعد رات کا آخری پہرہ آجاتا ہے۔

میں نے غور سے سونیا کی طرف دیکھا۔۔۔ روس میں شاید مرد اور عورت کے
حقوق برابر ہوں۔ ہو سکتا ہے وہاں ڈاکٹر انجینئر استادوں کا جب شمار کیا جائے تو
عورتیں مردوں سے زیادہ ہوں۔ لیکن مجھے نکیتا خروشیف کا قول کبھی نہیں بھولنا
۔۔۔ اس نے کبھی کہا تھا:

”روس میں مردوں کے ذمہ انتظام ہے لیکن سارا کام قریباً عورتیں کرتی ہیں۔“

صبح سویرے جب میں ایردفلوٹ سے اتر کر پہلی مرتبہ روس کی دھرتی پر اتر تھا تو ہر طرف ہیرل نما سفید موٹی روئی عورتیں بڑے بڑے جھاڑو، بالٹیوں میں گھلا ہوا صابن، ٹاکیاں برش لئے پھر رہی تھیں۔ ان کی عمریں میری دادی کی عمر کے قریب تھیں ان کے جسم تھری ٹنڈرٹک کی طرح بھاری تھے۔ یہ وقت ہمارے دیس میں چار پائی توڑنے، عبادت کرنے، پوتے نواسے کھلانے اور ہونیٹیوں پر رعب جھانے میں گزرتا ہے۔ موٹی دادی دیگ کی دیگ کی گھر کی لاڈلی ہوتی ہے لیکن یہاں سڑکوں پر بھاری عمر عورتیں سڑوں پر سفید رومال باندھے ٹرک چلا رہی تھیں۔ سڑکیں دھو رہی تھیں۔ سارا سارا دن میوزیم کے سامان کی نگہانی میں ایک کھڑی کرسی پر بیٹھ کر اکر جاتی تھیں۔ میری ماں بھی صبح سے شام تک کام کرتی ہے لیکن صرف بچوں کے لئے — شوہر کے لئے، گھر کے لئے۔ وہ اپنا پیٹ پالنے کے لئے کچھ نہیں کرتی۔ روزی اس کی انا کا مسئلہ نہیں ہے۔

میں نے پھر سونیائی طرف دیکھا۔ شاید آج سے تیس برس بعد جب میں واپس موسکاؤ آؤں تو سونیائی تین من کی ہو چکی ہو۔ اس نے سر پر قائم کی ٹوپی پہن رکھی ہو اور وہ نیچے کے ساتھ میں سڑک سے برف اٹھانے میں مصروف ہو۔ پتہ نہیں وقت آگے کی طرف بھاگ رہا تھا کہ پیچھے کی طرف — پتہ نہیں ہر لمحے کے سنگ لوح پر اپنی موت کی عبارت تھی کہ نئے نئے لمحے کا استقبال۔

”یہ مت سمجھو سمرود کہ صرف تم مشرقی ہو۔ مجھ میں بھی مشرقی لہو ہے۔ میری نانی کا خاندان ازبکستان سے آیا تھا۔ آدھا روس ایشیا میں ہے۔“

”لیکن طاقت ور اور امیر وہی روس ہے جو سفید ہے اور یورپ سے ملتا ہے جس کا رہن سہن رسم و رواج سب مغربی ہیں۔“

سونیا دل برداشتہ ہو گئی۔ وہ روس پر کوئی بات برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

”ہر ملک کا جنوب ہمیشہ گرم بھی ہوتا ہے اور غریب بھی۔ بھلا اس میں طعنے کی کیا بات ہے؟“ سونیانے زچ ہو کر کہا۔

”ہمارے کراچی میں آکر دیکھو تو حیران رہ جاؤ — سارے پاکستان کی دولت وہاں جمع ہے۔“

”تمہاری کیا بات ہے۔ تمہاری نظریاتی ریاست جو ہوئی — وہاں تو ہر بات الٹی ہو گئی ہے۔“

سونیا مجھ پر جیسے ایک گول کر گئی۔

ہم دونوں جب بھی ملتے تھے اس بات کے دپے مہتے تھے کہ ایک دوسرے کو زچ کریں۔ ہم ایک دوسرے کو نظریاتی شکست دینے کے اس قدر درپے رہتے تھے کہ ہمیں بھول جاتا تھا کہ ہم دونوں کو قدرت نے آپس میں محبت کرنے کیلئے بنایا ہے۔

مرد اور عورت کی محبت میں ازل سے رکاوٹیں آتی رہی ہیں۔ یہ رکاوٹیں دراصل وہ پتھر ہوتی ہیں جو پہاڑی نالوں کی رفتار بڑھا دیتی ہیں۔ کبھی ماں باپ کبھی سماج، کبھی مذہب کبھی رسم و رواج، قبیلے کی روک تھام ان کے راستے میں چپک چپک پوسٹ بن جاتا ہے۔ لیکن جب مرد و عورت ایک دوسرے کی محبت میں مبتلا ہوتے ہیں تو اصل میں ان کا

مذہب سماج قبیلہ رسم و رواج ایک ہو جاتے ہیں جیسے سیٹھ تھیوری کے مطابق ایک شامیلانے تلے لگا ہوا سارا سامان ایک ہی بریکٹوں میں بند ہو جائے۔ لیکن

بیسویں صدی میں ایک ایسی چیز ایجاد ہو چکی ہے جو مرد اور عورت کی باہمی کشش کے باوجود ایک نہیں ہوتی۔ یہ نظریات ہیں۔ مرد اور عورت ایک دوسرے میں مکمل

طور پر ضم ہونے کے باوجود اپنے اپنے نظریات سے محبت کئے جاتے ہیں۔ اور انہی نظریات کی وجہ سے ایک دوسرے کو مکمل طور پر قبول نہیں کرتے۔

جب بھی میں سونیانے ملاواریتگی سے ملا۔ لیکن پھر اچانک بریکیں لگ گئیں

خود بخود

اگر ہم دونوں کو اپنے اپنے ملک سے ذرا کم محبت ہوتی۔ اگر وہ روس کی کمیونٹ پارٹی کے آدرش کی بجا رن نہ ہوتی اور میں دنیا کے نقشے پر ابھرنے والی ایک نئی ریاست کا عاشق نہ ہوتا تو شاید ہم ایک دوسرے کو جٹ جیھا ڈال لینے اور اظہارِ محبت کو اس قدر گھولے میں نہ ڈالتے لیکن بد قسمتی سے جب بھی کسی سے محبت کرنی ہو باقی تمام محبتیں دل سے نکالنا پڑتی ہیں اور فی الحال ہم دونوں وطن پرست تھے۔

اس شام پتہ نہیں کیوں ہم موسکاؤ یونیورسٹی کے سامنے ایک بار پھر اجنبی بن گئے۔
”مجھے تمہارا نام بھول گیا ہے۔“ سونیل نے مجھ سے قصاص لینے کے انداز میں کہا۔

”عثمان سمر و۔“ پاکستان میں ایک صوبہ سندھ ہے۔ اس میں نهران دریا بہتا ہے جیسے نمندے دیس میں وانگانیو اسکاؤ میں بہتا ہے۔ یہیں حیدر آباد شہر آباد ہے اور اس میں ہمارا خاندان رہتا ہے۔ بہت پرانا کٹی صدیوں تک۔ ہمارے خاندان کے ہاتھ میں سندھ کا اقتدار رہا ہے۔“

”سمر و آسان ہے۔“ سونیل نے آہستہ سے کہا۔
”پچھلی مرتبہ جب تم مجھے ملی تھیں تب تم نے کہا تھا کہ عثمان یاد رکھنا آسان ہے۔“
”پتہ نہیں فارن نام مجھے یاد نہیں رہتے۔“

”میرا خیال ہے انہیں یاد رکھنے کی کوئی ایسی خاص وجہ بھی نہیں ہے۔“
ہم دونوں غالباً دنیا کی خوبصورت ترین یونیورسٹی کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ میر اس قدر قریب تھی کہ میں اسے بیکل میں چھپا کر راون کی طرح کسی جزیرے کی طرف روانہ ہو سکتا تھا۔ میں اعتراف کرنا چاہتا تھا کہ سورج کی ترجمانی کرنے میں اس کی براؤن آنکھوں میں آگ سی لگا ہی تھیں۔ میرا قد سونیل سے فٹ بھر اونچا تھا لیکن پتہ نہیں اس محبت کے

اعتراف میں مجھے اپنے ملک کی ذلت نظر آئی۔ مجھے لگا۔ وہ دل میں کہے گی۔ دیکھا! یہ ہوتی ہیں سپر پاورز۔ یہ ہوتے ہیں سفید فام لوگ۔ تم تیسری دنیا کے لوگ ایڈ کے بغیر زندہ وہ ہی نہیں سکتے۔ چاہے یہ دان دکشا معاشی ہو یا جذباتی، تم لوگ ہمارے بغیر لحظہ بھر کو کھڑے ہو ہی نہیں سکتے، تمہیں جتنی غف گنتی ہے ہمارے وجود سے لگتی ہے۔

موسکاؤ دریا کا رنگ اب مٹیالا ہو گیا تھا۔ یونیورسٹی کی عمارت کی بتیاں جلنے لگی تھیں اور اچانک سیس سیس کرتی ٹھنڈی ہوا دریا کی طرف سے اوپر کو آئے لگی تھی۔
”پچھلی چھٹیوں میں تم کہاں گئے تھے؟“

”یورپ۔“
”اور اس سے پچھلی چھٹیوں میں۔“
”حیدر آباد۔ میری ماں بیمار تھی۔“
”اور واپس کب چلے جاؤ گے؟“
”اس ماہ کے بعد۔“
”اور روس کب دیکھو گے؟“

”شاید ہم طالب علم کبھی بھی روس نہیں دیکھ سکتے۔“ ہمیں صرف پراد اپڑھنے کو ملتا ہے۔ تمہاری سوویت زندگی پر IDEOLOGY۔ چھائی ہوئی ہے۔ ہماری طرح تم لوگ GLORY TO LABOUR۔ کمیونسٹ پارٹی زندہ باد کے نعروے لگانے کے بعد بھی نازل زندگیاں بسر کرتے ہو لیکن ہم اس فلٹر کے پیچھے نہیں دیکھ سکتے۔ ہم ریڈ یو، ٹیلی ویژن، سرکس میں بھی اگر روس کو دیکھنا چاہیں تو بھی ہم خبر سے زیادہ کچھ نہیں جان سکتے اور روس خبروں کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔“
”میں تمہیں روس دکھاؤں گی۔“ میں ٹورسٹ گائیڈ رہی ہوں کافی دیر۔

”روس دیکھ کر کیا کریں گے سوئیا۔ جیسا ایک دیس ویسا دوسرا دیس —
اب تمہارے اتنے بڑے ملک میں تین سال رہنے کے بعد میں ایک نتیجے پر پہنچ گیا ہوں۔
یعنی؟ —“

”ابھی انسان نے انسان کے ساتھ رہنا نہیں سیکھا — ابھی انسان کو وہ
چاہی نہیں لی جو خوشی کے تلے میں اپنی مرضی سے فٹ ہوتی ہے — اور ابھی
— انسان کا کسی ایسی طاقت کے بغیر گزارہ نہیں ہوتا جو اس کی تمام مشکلات
کے وقت اس کے دل پر بچھا ہار سکے — دولت بانٹ لو، تمام ذرائع سانجھے
کر لو، کچھ فرق نہیں پڑتا۔“

”نہیں سمرو۔ روس اور باقی ملک ایک سے نہیں ہیں — یہ ملک عام آدمی کا
ملک ہے۔ نادار مفلس آدمی کا ملک — باقی ملک امیر آدمیوں کے ملک ہوتے
ہیں۔“

”پھر تباہ سوئیا کیا یہاں عام آدمی خوش ہے — کیا کمیونزم انسانی دکھوں کا
علاج ہے — واحد علاج؟“

اس نے پچلے ہونٹ کو دانتوں سے دبایا اور پھر آہستہ سے بولی:

”ہاں۔“

”کیسے کیسے کیسے؟ —“ میں نے گرج کر کہا — ”ابھی برسوں میں سینٹ
نکولس کے گر جا گھر گیا تھا — شام کا وقت تھا۔ گرجے کے اندر ایک جنازہ پڑا
تھا اور ایک بوڑھی عورت ہاتھ میں موم بتی لئے اپنے کفنٹے ہوئے بیٹے کے لئے رو
رہی تھی — وہ اسی طرح غم کے آگے نہتی تھی جیسے ہم تھرڈ ورلڈ کے آدمی ہوتے ہیں
اس کے آنسوؤں میں دہی دکھ تھا جو کسی سرمایہ دار ملک کی عورت کے آنسوؤں میں ہوتا
ہے۔ تباہ یہ خوشی ہے — یہ علاج ہے انسانی دکھوں کا؟ —“

سوئیا نے اپنے غصے کو دہاتے ہوئے کہا:

”تم سیاح لوگ روس محض یہ دیکھنے آتے ہو — کہ ہم لوگ کس حد تک ناکام
ہوئے ہیں۔ تم لوگ مسجدوں میں، گرجوں میں — صرف یہ دیکھنے جلتے ہو کہ روس
ابھی تک کتنا غبور ہے اور غجوری کے وقت کسے پکارتا ہے — تم لوگ یہ دیکھنے
نہیں آتے کہ روس نے کس قدر فاصلہ طے کر لیا ہے انسانی حرام نصیبی کا — جو قوف
آدمی — جنگی شخص؛ ہم انسان کے ظلم، انسان کی درندگی کے خلاف لڑ رہے ہیں۔
خدا کے دیئے ہوئے غموں کے خلاف بغاوت نہیں کر رہے — ہماری کوشش ہے کہ
انسان انسان کو دکھ نہ دے — سب برابر ٹھہریں۔“

”مساوات ہمارے مذہب کی بھی اساس ہے۔“

”ہاں ہے — لیکن اعتراف تک — ہم لوگ اسے پرکھیں کرتے ہیں۔ ہم
لوگ اسے نعرے کے طور پر استعمال کرتے ہو — بس اتنا فرق ہے۔“

میں پسپائی ٹکے میں تھا اور میری مردانگی اس پسپائی کو قبول نہ کر رہی تھی اسلئے
میں نے جو بھی اعتراضات مجھے کمیونزم پر معلوم تھے ایک ہی سانس میں کر ڈالے۔
سوئیا پہلے مجھے تعجب سے دیکھتی رہی پھر یکدم ہنس دی:

”تم — تم سمرو روگو زن ہو — روگو زن۔“

اس وقت تک میں نے دستوفسکی کی ایڈیٹ نہیں پڑھی تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا
کہ روگو زن کیسا طوفانی کردار تھا جو اپنی شکست کو آسانی سے قبول نہیں کرتا —
اس وقت وہ مجھے روگو زن پکار کر جانے کیا کچھ کہہ رہی تھی۔ میں قزاق، الٹیرا، پاگل
..... جانے کیا کچھ تھا۔

”تم تھرڈ ورلڈ کے آدمیوں کو تو ہم سے ہمدردی ہونی چاہیئے۔ تم لوگ اٹا ہم ہی سے
لڑتے ہو — بابا ہم ان مصیبتوں سے نہیں لڑتے جو خدا ہم پر نازل کرتا ہے — موت

اپنے گرد لگی ہوئی سرکٹوں کی باڑ ٹھیک کرتے رہے اور ایک لمحے کے لئے بھی نہیں خیال نہ آیا کہ اس باڑ کے باوجود ہم اوپر سے ہاتھ تو ملا سکتے ہیں۔ یہ مصنوعی فاصلے اس طرح تو پاٹ سکتے ہیں۔

”میں چلتی ہوں سمر۔“

”تھوڑی دیر اور پھر جاؤ۔“

”نہیں سمر۔ آج مجھے ناشیا کو فلم دکھانے لے جانا ہے۔“

”کوئی فلم؟“

”محبت کے غلام۔“ مینا کوٹن نے اسے بتایا ہے۔

”روس میں ایسے نام کی فلم پر تعجب ہوتا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تمہارے دیس میں یہ دیوانگی نہیں ہوتی۔“

”کیوں۔ ہم انسان نہیں۔ ہماری جبلتیں نہیں۔ ہم محبتیں نہیں کر سکتے۔“ اس نے غصے سے کہا۔

”ہیں بابا ہمیں جبلتیں۔ تم سب سپر مین ہو۔ دنیا بھی چلا لیتے ہو اور خوش بھی رہ لیتے ہو۔ اس کی کہانی کیا ہے محبت کے غلام کی۔“

”ایک چھوٹا سا معصوم گروپ کوشش کرتا ہے کہ وہ انقلاب میں نہ بھنس جائے۔“

”بس بس میں تو سمجھا تھا کہ کوئی واقعی محبت کی کہانی ہوگی۔“

”ہمارے لڑیچہ کو تم ات نہیں کر سکتے سمر۔ تم کو ایسا ہی محبت کی کہانیوں کا شوق ہے تو اپنا کرینا پڑھو۔“ دارائنڈ میس پڑھو۔“

”ہم دونوں شہر کی جانب جانے والی ٹرک پر چلنے لگے۔ پتہ نہیں کیوں میں نے آہستہ سے کہا:

”میرے وطن چلو سوینا۔ وہاں عورتیں سڑکیں نہیں دھوئیں۔“ حیدر آباد

حادثات۔ بد صورتی۔ پیدائشی جسمانی محرومی۔ بلکہ کمیونزم ان لعنتوں سے چھٹکارا دلاتا ہے جو انسان انسان پر ٹھونکتا ہے مثلاً غربی۔ بے روزگار۔ مواقع کی کمیابی۔ کمیونزم نے خوشی کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا دو گون۔ بلکہ انسان کو یہ احساس دلایا ہے کہ سب گوشت پوست کے بنے ہوئے ہیں جب کسی کو کھانے کو نہ ملے تو وہ بھلاتا ہے۔ منہ پر تھو کو تو اسے ذلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔“ اخوت کا سبق چودہ سو سال پرانا ہے۔ کچھ نیا نہیں ہے۔ احمق لڑکی۔ وہ اب بالکل چڑھ گئی۔

”بتاؤ بتاؤ تمہارا چودہ سو سال پرانا سبق کہاں لاگو ہوا ہے۔ کس ملک میں؟ ایران۔ افغانستان۔ سعودی عرب۔ پاکستان۔؟۔ بتاؤ۔“

اب ہم دونوں ایک دوسرے کو ایسے دیکھ رہے تھے جیسے دونگی تلواریں آپر ہیں آدھی تہی ہوں۔ میں آپکو بتا چکا ہوں کہ اگر مجھے اپنے وطن اپنے مذہب سے کچھ کم محبت ہوتی یا سو نہاتا مٹرا اپنے دیس اپنے ملک کی دیوانی نہ ہوتی تو ہمیں ایک دوسرے کا وجود نظر آ جاتا۔ کبھی کبھی کوئی مشن کوئی آدرش کوئی تخلیقی اُپج انسان کو انسان کے قریب آنے سے معذور رکھتی ہے۔ مذہبی حد بندی، نسلی حدود، زبان کا اختلاف

دیس کی سرحدیں کئی ناگزیر حالات محبت کے راستے کا اندھا شیشہ ہیں۔ یہ حالات، فرق، اوپنچ پنچ ہمیشہ سے مختلف روپ دھارتی رہی ہے لیکن پہلے انسان جس حد تک دوسروں کی محبت کا محتاج تھا اب نہیں رہا۔ اب وہ انسان کی جگہ اشیاء اور نظریوں کا زیادہ محتاج ہو گیا ہے۔ پچھلے رکاوٹیں بیرونی ہوا کرتی تھیں۔ اب خدقیں، فیصلیں، حصہ خود ساختہ ہوتے ہیں۔ اسی لئے زیادہ ناقابلِ فہم اور دقیق ہوتے ہیں اور آدمی کتے کی طرح اپنی ہی دم کے تعاقب میں چکر کاٹتا رہتا ہے اور کبھی سر سے تک نہیں پہنچتا۔ میں او سوینا بھی ایک دوسرے کی ہمدردی، محبت، دوستی کے حاجتی تھے لیکن ہم دونوں اپنے

میں ہماری کوٹھی میں ان گنت ملازم ہیں۔ ایک خانساں۔ دو نوکرانیاں — مالی
— جھڈا — تمہیں آرام ہی آرام ملے گا۔
وہ رک گئی اور چہرہ پھرا کر بولی:

”میں سہزی نہیں ہوں جو میری نلائی کے لئے، پانی دینے کے لئے دوسرے مقرر
ہوں تم ساؤتھ ایسٹ ایشیا کے لوگوں کو آرام سے اتنی محبت کیوں ہے — کیا
تمہیں یہ انسان کی ذلت نہیں لگتی کہ ایک آدمی کے آرام کے لئے دوسرے آدمی اس کے
خدمت گزار بن جائیں۔ میں تو ایسے آرام میں ایک گھنٹہ بھی خوش نہیں رہ سکتی۔“

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا — ”اگر تمہیں سڑکیں دھونی پڑیں
ہوٹلوں کے فرش چمکانے پڑے۔ ٹرک چلانے پڑے تو — تو سونیا؟ —“
”تو کیا۔ میں روس کی سڑکیں صاف کر دوں گی۔ اپنے روس کی — یہ کچھ کم
اعزاز نہیں میرے لئے۔“

”تم جیسی شکل و صورت کی لڑکی تو ہمارا فی بن کر رہ سکتی ہے اپنے سندھ میں —
پھر میں نے ذائق کے ساتھ کہا — ”میرے ساتھ چلو۔ جب تک میں کام کروں گا تمہیں
کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔ تمہاری جگہ کھانا بھی میں پکا لیا کروں گا۔“
وہ بہت سنجیدہ ہو گئی تھی:

”کیوں؟ کیا میں لولی نگر ٹری ہوں۔ اپنا ج ہوں — میں کسی کی دی ہوئی روٹی
کیوں کھاؤں؟ — میں عورت ہوں ہاتھ پاؤں والی —“
”تمہاری مرضی — آفر اچھی تھی —“
”شکر یہ۔ ٹرمز اچھی نہیں تھیں —“

ہم دونوں ہنس دیئے۔ محبت کرنے کا وقت آیا اور چلا گیا۔ وہ بس پر سوار ہو
گئی اور میں یونیورسٹی کی طرف لوٹ گیا۔

سونیا سے میری کئی ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ کئی بار باہمی دوستوں نے ہمارا تعارف
کر دیا تھا لیکن سب سے پہلی بار وہ مجھے پینورا ما میں ملی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد
ہے مجھے روس آئے زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا۔ میں کسی دوست کی شدید آرزو رکھتا تھا۔ زبا
کی اڑچنیس گونگے پن کا احساس دلاتی تھیں۔ اس وقت میں ریڈ سکوائر، لینن کی قبر،
پشکن میوزیم، ٹیلی وژن ٹاور، بولشویک تھیٹر اور دوسری تاریخی عمارتیں دیکھنے میں مشغول
تھا۔ روس کا فوٹو سٹیٹ ذہن میں تیار کرنا میرے لئے بڑا مشکل کام تھا۔ روسی مزاج،
رسم و رواج، بدحواسیاں، تضادات، رہن سہن کی اڑچنیس، آپس کی مشکلات کا تجربہ
علم نہ تھا۔ ابھی تو میں ایک گریٹ ملک، گریٹ قوم، ایک گریٹ آدرش کے سامنے کھڑا
تھا۔ جیسے کوئی بوناٹیلی وژن کے ٹاور کو دیکھ رہا ہو۔

اس روز میں اپنی پاکٹ بک میں لکھی ہوئی روسی اور اسکو کے نقشے کے سہارے
پینورا ما پہنچا جو ٹرائف گیٹ کے قریب ہے اور اس تاریخی واقعے کی خوشی میں تعمیر
کیا گیا ہے کہ روس نے پولین کو پسپا کر کے بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔

شاید یہ میلاد ہم بویا انداز سے کی کمی ہو لیکن روسی خاص کر سفید روسی اپنے لئے
پولین کی شکست کو اپنی تاریخ کا ایک بہت بڑا سنگ میل سمجھتے ہیں۔ وہ پولین کی
شکست کو اپنی قومی ٹوپی میں سرخ پیر کی طرح سجائے رکھتے ہیں لیکن پتہ نہیں وہ کون سا
غل ہے — وہ کونسا طریق کار ہے جس کے زیر اثر ہمیشہ سے فاتح مفتوح کو پیروں
میں روندنے کے بعد اسی مفتوح کا امیر ہو جاتا ہے — اکبر اعظم کے محل میں
جو دھابائی — محمود غزنوی کے دربار میں ہندی کاریگر — سکندر کے ہمراہ
ہندوستان کے ستارہ شناس طبیب — مسلمانوں میں ذات پات کی تمیز اسی غل
سے وجود میں آئی۔

مجھے محسوس ہوا — روسی فرانس سے بیک وقت نفرت اور محبت کے رشتے میں

مبتلا ہیں۔ ان کی آرٹ گیلریوں میں عموماً وہی تصویریں قابل ذکر ہیں جو فرانس سے آئی ہیں یا اُس کے سکولز آف تھٹک کے مطابق بنی ہیں۔ ان کے ہاں آرٹ، جمال، فیشن، لباس کا انداز ہی اندر کہیں وہ پیمانہ چھپا ہے جو فرانس کا ہے جیسے حضرت یوسفؑ نے اپنا پیمانہ بھائیوں کے غلے میں چھپا دیا تھا۔ ایسے ہی نپولین برفوں میں دھنستا شکست خوردہ اور تہی و اماں جلتے ہوئے اپنے فرانس کی میٹر روڈ یہیں کہیں برف میں چھپا گیا تھا۔ اب کلچر کی دنیا میں جو کچھ بھی روسی کرتے ہیں بظاہر روسی ان کے اعتبار سے اس میں خود رائی ہوتی ہے لیکن یوں لگتا ہے جیسے اندر ہی اندر وہ نپولین کے میٹر سے ناپتے ہیں اور اسی کے پیمانے سے تولتے ہیں۔ کسی کو شکست دینے کی اتنی قیمت تو ہمیشہ ادا کرنی ہی پڑتی ہے۔ بالآخر فاتح کو مفتوح کا رنگ ہی اختیار کرنا ہوتا ہے۔

ان دنوں سوویتا مینوراما میں گائیڈ تھی۔ جس وقت میں اوپر پہنچا وہ ہاتھ میں ایک لمبی چھڑی لئے روسی لب و لہجے میں ساری تصویروں کے متعلق انگریزی میں معلومات امریکی سیاحوں کو سن رہی تھی۔ مینوراما دراصل ایک تصویر ہے جو گول بڑی دیوار پر چسپاں ہے۔ اس پر کچھ ایسی چابکدستی ہے روشنی کی گئی ہے کہ مہر کا رام کی طرح اس میں تین تہی پن موجود ہو گیا ہے۔ ہر چیز اپنے پر و سیکٹو میں جیتی جاگتی اور اصلی محسوس ہوتی ہے۔ تمام سیاح اس تصویر کو اتنی توجہ اور تحیر سے دیکھتے ہیں جیسے رو بکاری کیلئے آئے ہوں۔ سوویتا نیلے سکرٹ اور سفید بلاؤز میں لمبوس سر پر سفید رومال باندھے ذرا کسی لگنی آواز میں کہہ رہی تھی:

”یہ تصویر جو اس وقت آپ دیکھ رہے ہیں ۱۸۱۲ء میں نپولین کی شکست کا منظر پیش کرتی ہے۔ تصویر بونو چیف گاؤں کی ہے۔ اس مقدس سرزمین سے جب نپولین کو جھکا یا گیا تو اس کی حالت ایسی تھی کہ وہ گھوڑے پر بھی نہ چڑھ سکتا تھا اور اپنی ٹوپی

چہرے پر یوں کھینچ کر موسکاؤ سے روانہ ہوا تھا کہ اس کی آنکھوں کے آنسو کوئی نہ دیکھ سکے

میں باری باری تصویر اور سونیا کو دیکھتا رہا۔ پتہ نہیں کیوں میری آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔

تصویر میں واقعی غیر معمولی جان تھی۔ جہاں الاؤ روشن تھا وہاں سے سینک آتا محسوس ہوتا تھا۔ گھوڑے کے پسینے سے حدت کا احساس ہوتا تھا۔ گھروں سے جو دھواں اٹھ رہا تھا اس کے ختم ہو جانے کا امکان تھا۔ تصویر زندگی کی طرح ایک لمحے کی گرفت میں آئی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے ساتھ کھڑی ہوئی ایک بڑھیا سے سوال کیا:

”یہ تصویر کس نے بنائی ہے؟“

میرا خیال تھا وہ روسی عورت ہے لیکن اس امریکی عورت نے آنکھ مار کر جواب دیا:

”ایک فرانسیسی نے اور کس نے؟“ — بھلا ایسی پینٹنگ کوئی روسی بنا سکتا ہے؟ —

مجھے جواب دیتے ہی وہ پیٹھ موڑ کر چلی گئی۔

تصویر سے میں نے سونیا کی طرف نگاہ کی۔

لمحہ بھر کے لئے مجھے شبہ ہوا کہ چھڑی کے ساتھ تصویر دکھانے والی بھی کہیں دھوکا

ہی نہ ہو۔ کہیں وہ بھی تصویر ہی کا حصہ نہ ہو اور روسی سائنسدانوں کا کرشمہ نہ ہو۔ وہ بھی تصویر کی طرح بے عیب تھی۔ وہ بھی تصویر کی طرح ایک چھپے ہوئے حزن کا مراغہ دیتی تھی۔ پتہ نہیں کیوں مجھے لگا۔ سوویتا اور تصویر دونوں فرانس کی امپورٹ کی ہوئی ہیں۔

وہ بہت نازک، خوبصورت اور خوشبودار نظر آتی تھی۔ بغیر فنل سٹاپ کا ماڈلے وہ ٹٹا ہوا لکھناں دہرائے جا رہی تھی۔ سامنے قطار میں کھڑے سیاح تمام اس کی طرف تصویر کی جانب ٹٹکی باندھے یوں کھڑے تھے جیسے دار و نہ گھاٹ کے روبرو کھڑے ہوں۔

پھر مجھے لگا۔۔۔۔۔ وہ بھی میری طرح گائیڈ کے فرائض ہی ادا نہیں کر رہی بلکہ اندر ہی اندر اور پڑتے لگا رہی ہے۔ وہ سوچ رہی ہے ابھی میٹھا چیز بھی خریدنا ہے۔ واڈ کا کی بوتل کیلئے پتہ نہیں پیسے بچ بھی سکیں گے کہ نہیں۔ شاید میں کچھ حصہ چل کر جاؤں تو کچھ پیسے بچ جائیں۔ یہ رد بل اتنی جلدی کیوں ختم ہو جاتے ہیں؟ وہ بھی میری طرح اندر ہی اندر اپنی اکونومکس درست کر رہی تھی۔

یہ سونیا سے میری پہلی ملاقات تھی

وہ پیئورا ما میں پرانی گائیڈ تھی اور میں یونیورسٹی میں نیا طالب علم۔ لیکن اس دن کی ملاقات کچھ مسلسل نہ ہو سکی۔ ہم کچھ دیر کے لئے ملے۔ بس سٹاپ تک پہنچے ٹریم میں بیٹھے اور اپنی اپنی منزل کو روانہ ہو گئے۔ میرے لئے پیئورا ما کی تصویر کے سامنے کھڑی ہوئی سونیا اس تصویر کا حصہ بن گئی۔

ملاقاتوں کا بھی عجیب گراف ہے۔ کچھ لوگوں سے روز روز ملاقات ہوتی ہے اور ان کا کچھ اثر طبیعت پر مرتب نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ اتفاقاً ملتے ہیں۔ بجلی کی سی تیزی سے روانہ ہو جاتے ہیں چند نظر میں، کچھ جملے، ایک آدھ لمبے کے کاربن پیپر مل جاتے ہیں جن پر آپ لکھ لکھ کر کئی عبارتیں، کئی تصویریں کئی شکلیں بناتے رہتے ہیں۔ مجھے روس سے متعارف کرانے والی۔ روس کے قریب لانے والی سونیا تھی۔ اس سے پہلے میں حیدر آباد لوٹ جانے کی سوچ رہا تھا۔ سونیا کو دیکھنے کے بعد مجھے روس اپنی ہی خالہ کا گھر نظر آنے لگا۔

دراصل ہر شخص اپنے ملک کا فاسٹ سیکر ٹری ہوتا ہے۔ اس کے وجود کے ساتھ ایک ساری ایسی کام کر رہی ہوتی ہے۔ دوسرے ملک کے لوگ جس تناسب سے اس سے متاثر ہوتے ہیں اسی لحاظ سے وہ اس کے ملک سے رعایت بہتے اور اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ امریکہ وہی ہے جو امریکنوں نے اسے دکھایا۔

انگلستان وہی کچھ ہے جو انگریزوں نے اسے ظاہر کیا۔ میری بھی شدید آرزو تھی کہ سونیا میری وجہ سے پاکستان کو دنیا کا سب سے خوبصورت ملک سمجھنے لگے۔ کچھ دنوں بعد وہ مجھے مانی کو سکی چوک کے قریب کارڈ خریدتے ہوئے مل گئی میرے ہاتھ میں گناہ سپاہی کی قبر کا کارڈ تھا جسے میں اپنے صوبیدار چاچا کے لئے منتخب کر رہا تھا۔ ہم دونوں نے اپنے اپنے کارڈ خریدے۔ سونیا نے میرا حساب لگا کر مجھے رو بزنز بتائے اور ہم دونوں قریبی کھوکھے سے اسکریم کھانے چلے گئے۔ اسکریم کھانے کے بعد اس نے اپنے ساتھ کوپک ادا کئے اور میں نے اپنی اسکریم کی قیمت ادا کی۔ ہم دونوں سڑک کنارے بیچ پر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پھر میں نے اس سے اس کا پتہ پوچھا۔ وہ مسکرا دی۔ آسمان پر بادل چھلے ہوئے تھے لیکن اچانک سورج نکل آیا۔

"کیا کرو گے میرا پتہ پوچھ کر۔"

"کبھی کسی روز تمہارے گھر آؤں گا۔"

"ایسے ہی ٹھیک ہے سمر۔ یہاں دہاں کسی دقت بغیر تعین کے۔"

"کیوں؟"

"تم یہاں اجنبی ہو۔ تم یہاں کے رسم و رواج نہیں جانتے۔ بس ایسے ہی ٹھیک ہے۔ اتنا ہی کافی ہے۔"

وہ مسکراتی ہوئی روانہ ہو گئی۔ ایسی لڑکی کا کوئی کیا کرتا جس کا ٹھکانہ ہی معلوم نہ ہو۔

یونیورسٹی میں مجھے بہت لڑکیاں ملیں۔ بہت سے روسی لڑکے دوست بن گئے

یہ لوگ سادہ دل اور غنٹی تھے۔ انہیں اپنے ملک سے بڑا شدید پیار تھا۔ جیسے کسی نو مسلم کو اپنے مذہب سے ہوتا ہے۔ لیکن روسی کی محبت اپنے ملک اور آدرش

سے اس لئے بھی کچھ زیادہ نظر آتی ہے کہ وہ ہر وقت امریکیوں کے ساتھ مقابلہ کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ ہر کام اس لئے بھی اچھا کرتے ہیں کہ انہیں روسی ہونے پر فخر ہے اور انہیں ہر کام میں اس لئے بھی مرد دھڑکی بازی لگانا ہوتی ہے کہ انہیں امریکیوں پر ثابت کرنا ہے کہ وہ امریکیوں سے بہتر جانتے ہیں۔ اس دوسری کشاکش میں وہ ہر لحظہ پر دوپگینڈہ کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ ہر نگرانی کے سامنے اپنا اور امریکہ کا معاملہ رکھ کر یہ چاہتے ہیں کہ ووٹ ان کے حق میں دیا جائے۔ دہان کے سادہ لوح شہریوں سے مل کر میں اس نیت پر پہنچا کہ امریکہ اور روس نے سپر پاور بن کر اپنے عالم شہریوں پر بہت بڑا ظلم کر رکھا ہے۔ اب ملائیشیا، کمبوڈیا، روڈیشیا، پاکستان — چھوٹے چھوٹے جزیروں میں، انجانی ایئر پورٹوں پر روسی اور امریکن یہ معلوم کرتے پھرتے ہیں کہ یہ پاکستانی — یہ سلونی یہ جاپانی — یہ فرانسیسی کس کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ امریکہ کو کہ روسی کو — گویا حب جاہ کی آرزویں یہ بڑے ملک چھوٹی چھوٹی ریاستوں، چھوٹے چھوٹے ملکوں کے سامنے کا سہ بردار ہیں۔ اتنے بڑے اتنے سپر سپر ہونے کے باوجود ان کو رائے چھوٹے ملکوں سے لینا پڑتی ہے کیونکہ آپس میں تو وہ طے نہیں کر پاتے کہ ان دونوں میں سے کون بڑا ہے؟ نہ ہی وہ یکبارگی اپنے حریف کو ختم کر کے کسی فیصلے پر پہنچ سکتے ہیں۔

یونیورسٹی میں، بازاروں میں، سرکس گھر اور بیٹے ٹھیروں میں جیسے میں کاسٹنگ ووٹ تھا — تما متمر معمولی اور چھوٹے پن کے باوجود وہاں کے شہری یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ میں روس سے کس حد تک اور کتنا کچھ متعارف ہو چکا ہوں — کیا یہ تعارف مثبت ہے کہ منفی؟

لیکن کسی شخص، شہریا ملک کا اصلی تعارف ہمیشہ اچانک ہوتا ہے۔

مجھے روس میں رہتے ہوئے پورا سال ہو چکا تھا لیکن ابھی میں اصلی روس سے

متعارف نہ ہوا تھا۔ انسانوں کی طرح ملکوں کی بھی ایک روح، سائیکی ہوتی ہے۔ اسکا تعارف مشکل سے اور ہمیشہ اچانک ہوتا ہے۔ میں چند دن کے لئے لینن گراڈ کی سیر کے لئے گیا تھا۔

لینن گراڈ بادلوں کا شہر ہے۔ سمندر کنارے کا شہر ہے۔ دریا نیویدا کا شہر ہے۔ اس میں گھر، باغ، مڑکیں، محل، رستوران، سمندر کا ساحل، کشتیاں، لاؤنج، کاریں، جہاز، میوزیم، اتنا سارا کچھ ساتھ ساتھ ہے اور ایک ایک نظر آتا ہے۔ دریا نیویدا کنارے وہ محل ہے جس میں راسپوٹین کو گولیوں سے داغا گیا تھا۔ پیٹر دی گریٹ کا خوبصورت موسم سرما کا محل ہے اور لینن گراڈ سے نکل کر ایک بہت بڑا موسم سرما کا محل ہے جس کے ان گنت کمرے اب بھی بند ہیں اور جس کے سامنے خوب صورت تذاؤم گھوڑے، فرشتے، شہزادے بتوں کی شکل میں ایستادہ ہیں۔ ان بتوں پر جیسے سونے کا پانی چڑھا ہے اور فوایے ان سے چھوٹے ہیں۔ یہ پیٹر دی گریٹ کا شہر ہے جسے اب لینن گراڈ کہتے ہیں۔ یہ بہت خوبصورت ہے اور چونکہ بہت شمال میں واقع ہے اس لئے یہاں رات کو گیارہ بجے ابھی دن ہوتا ہے۔ یہاں بھی رات کو اپنے کمرے کے دبیز پردے بند کر کے رات کر لیتے ہیں اور اپنی رات بنا کر سو جاتے ہیں حالانکہ باہر دن چڑھا ہوتا ہے۔

لینن گراڈ پر عواماً بادل گھرے ہوتے ہیں جیسے کہ فی خوبصورت لڑکی کسی ایسے مرد کے متعلق سوچتی رہتی ہو جو اس کا ہونے سے پہلے ہی مر گیا — غالباً سارے روس میں یہ اکلوتا شہر ایک نیک دل ترقی پسند بادشاہ کا بسایا ہوا لگتا ہے۔ پیٹر دی گریٹ رات کو لباس تبدیل کر کے مارون الرشید کی طرح روند کو نکلتا ہو — اسے خبر ہو وہاں لگی میں ایک بڑھیا رہتی ہے۔ سمندر کنارے وہ ملاح جال بنتا ہے جس کے پاس سمندر میں جانے کے لئے کشتی نہیں — سارا شہر اڑن ہے سال کنارے

کبھی پہنے زرد کمروں والی روسی لڑکیاں گھومتی ہیں۔ موٹر سائیکل پر جینز میں ملبوس بھوری مونچھوں والے نوجوان لگے پھرتے ہیں جن کے پاس کھڑے ہوں تو آپ کو واڈ کا اور پیئر کی خوشبو آتی ہے۔ سارا شہر کمیونسٹ ہے۔ عموماً سیاہیوں کو وہ جیل خانہ دکھایا جاتا ہے جہاں لینن کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے نظر بند کیا جاتا تھا۔ لیکن اس شہر میں پیٹرو دی گریٹ کی روح گھومتی ہے۔ اب بھی یہ اس کا شہر ہے جس خوبصورت گر جاگھر میں اس کی خوبصورت قبر ہے وہاں قبر پر ہمیشہ پھول ہوتے ہیں۔ میں نے کئی لوگوں سے پوچھا کہ:

’اب جبکہ ملک میں شاہ پرستی نہیں ہے اس کی قبر پر کون پھول رکھتا ہے؟‘ ایک بوڑھی عورت نے کہا: — ’پتہ نہیں بیٹے۔ کسی کو پھول رکھتے کبھی دیکھا نہیں۔ پر پھول یہاں ہوتے ہیں بلکہ ہمیشہ یہاں ہوتے ہیں۔ سردیوں میں بھی۔ یہ بادشاہ کہاں تھا مزدور تھا۔ کئی سال تو سمندری جہازوں کے کارخانوں میں مزدور بن کر کھینتا رہا۔‘

ہم برصغیر ہندو پاکستان کے مغلیہ بادشاہوں سے بے پناہ محبت کرتے ہیں ہم نے ان کے انتظام حکومت کی کبھی جانچ پڑتال نہیں کی بلکہ ان کی تاریخی عمارتوں کو دیکھ کر ان کی عظمت کے ساتھ ایک رومان وابستہ کر دیا ہے۔ ان کی شاہی عمارتوں نے ہی ہمیں ہمیشہ کے لئے ان کا گردیدہ کر دیا ہے۔

یہ شہر بھی محلوں کا شہر ہے —

پیٹرو کے محلوں کا شہر —

ایک چھوٹے سے محل میں جہاں پیٹرو دی گریٹ نے خود ایک مشین ایب د کرنے کی کوشش کی تھی اور جس کا باورچی خانہ بالکل سادہ اور غریبانہ تھا میں باہر نکلا۔ باہر درخت ہی درخت تھے۔ بادلوں اور سمندری ہواؤں کی نمی سے پوچھل درخت —

جیسا سبزہ اور درخت لینن گراڈ میں نظر آیا پھر کبھی نہ دیکھا کیونکہ یہاں کی روئیدگی میں ہونٹوں کی سی ملامت تھی۔ باغ خاموش تھا۔ اتفاق سے نہ مقامی لوگ نظر آتے تھے نہ سیاح۔ صرف فاصلے سے کچھ دبی دبی آوازیں آرہی تھیں۔ باتوں کی ہنسی کی آوازیں۔

پرندوں کی سیٹیاں نہیں تھیں لیکن لگتا تھا درخت بے آباد نہیں ہیں۔ بارش نہیں ہو رہی تھی لیکن پتوں سے بلندوں کے پھسلنے کا شبہ ہوتا تھا۔ زیادہ درختوں کی ککڑی سیاہ تھی اور ڈالیاں کو پلوں کی طرح سبز۔ ادھر ادھر پرانے بت پڑے تھے۔ روشیں ٹھنڈی تھیں —

پھر اچانک میری نگاہ ایک بت پر پڑی۔ یہ ایک قد آدم عورت کا مرمی بت تھا۔ بھرے بھرے جسم کی ملائم شکل سی فرشتہ رو عورت — اس کے کندھے پر مرم کا ایک جھوٹا سا کبوتر بیٹھا تھا اور کبوتر کی چونچ میں عورت کے پتھر یلے پستان کا سرا تھا۔

میرا جی چاہا کہ اس کبوتر کو اڑا دوں۔ جس گستاخی کا وہ مرتکب تھا اس کا میں متعل نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن جس آرٹسٹ نے عورت اور کبوتر کو یوں سامری رنگ میں دکھایا تھا وہ دوستو فسکی کے کرداروں سے ٹالسٹائی کی بے چینی، چیخوف کی برداشت، مزدوروں کی جفاکشی، تنہا روس کی برہنہاری سے واقف تھا۔ وہ اس کرب سے بھی آشنا تھا جو انسانی پستان کے حیوانی چونچ میں آجانے سے ہوتا ہے، اور اس آرٹ کی ساحری کو بھی جانتا تھا جو اس کرب سے پیدا ہوتی ہے۔

کاسنی پھولوں میں چہرہ پر سبایا یہ بت بیک وقت مضحکہ خیز بھی تھا اور خیال آرا بھی۔ اس میں لذت کوشی بھی تھی اور ہیزاری بھی۔

اس میں غایت درجے کا وجد و انبساط تھا اور سارے لینن گراڈ کا دکھ بھی۔

مجھے اچانک لگا۔ اس سادھنی اور کبوتر کی وجہ سے میں روس سے متعارف ہوا۔ روس جو سدا اپنے مسک کے کبوتر کو اپنے کندھے پر بٹھائے رکھتا ہے۔ یہ کبوتر مسلسل اس کے پستانوں سے اس کا لمبو پیتا ہے اور کبھی سیر نہیں ہوتا۔ اس در کی سادھنی میں ان دونوں کی بقا ہے ^{جسے} IDEOLOGY کا کبوتر لمبو پیتا رہے گا۔ اور مریں پستان کبھی خالی نہ ہوگا۔ وہ در کی لذت کو سنتا رہے گا اور کبوتر کو پالتا رہے گا۔ اس باغ میں گھومنے پھرنے والے شہریوں کو مقامیوں کو علم نہ ہوگا کہ سب باہ درختوں تلے سبز پتوں میں چھپی ہوئی ہری گھاس پر روس کی روح بیٹھی ہے۔ مجھے لگتا ہے کبھی کبھی آدھی رات کو خندق کی طرف سے دبے قدم پیڑ دی گریٹ قائم اور سمور کا بڑا کوٹ پہننے جس پر کاٹھ کے ٹکے لگے ہوں گے اور آتا ہوگا۔ اس بت کے خالی کندھے پر ہاتھ رکھ کر سوچتا ہوگا۔ کیا میں یہ کبوتر اڑا دوں کہ رہنے دوں؟ کیا ہر بادشاہ کی روح مرنے کے بعد اپنے ملک کو واقعی دارشین کی ملکیت سمجھنے لگتی ہے؟ کیا مغلیہ بادشاہ اب بھی راتوں کو شاہی قلعے کے طواف نہیں لگاتے؟ کیا وہ واقعی اپنی سلطنت کو بھول جاتے ہیں؟

ایسے ہی جب پہلی بار میں سونیا کو پینو رامامی ملا تھا تو بڑی دیر تک سوچتا رہا تھا کہ میں اس روسی لڑکی کو یاد رکھوں کہ بھلا دوں۔ جب اسے بھلانے لگا تو وہ یاد آئے جاتی اور جب یاد کرتا تو اس کا کچھ بھی واضح طور پر یاد نہ آتا۔ اسی طرح کئی مہینے گزر گئے اور پھر اچانک ایک شام وہ مجھے ٹیلی وژن ٹاور کی لفٹ میں مل گئی۔ وہ ہمیشہ کی طرح شفاف آنکھوں سے نہ جانے کہ صردیکھ رہی تھی؟ جب میں لفٹ میں داخل ہوا تو اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ اس کے اور میرے علاوہ ایک بوڑھا روسی دیوار سے کندھا لگائے ناک سے چہرے نکال رہا تھا۔ ایک منٹ میں ہم ۲۵ میٹر اوپر چلے

گئے اور لفٹ رک گئی۔ میں نے لفٹ سے باہر نکلنے کے لئے سونیا کو اشارہ کیا تو اس نے جیرانی سے مجھے دیکھا "سی پاسی با" کہا اور آگے بڑھ گئی۔

ٹیلی وژن ٹاور روسی غز میں شامل ہیں۔ وہ ہر سیاح کو اس کے متعلق بتاتے ہیں اور اس کی پیمائش پر حیران کرتے ہیں۔ ٹیلی وژن ٹاور کے اوپر ایک چھوٹا سا گول روشن ریستوران ہے جس کے سارے طرف شیشہ ہی شیشہ لگا ہے۔ ان کھڑکیوں سے سارا ماسکو نظر آتا ہے۔ دور تک آسمان دکھائی دیتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم کسی منجمد طیارے میں ایک ہی مقام پر ایک ہی جگہ ٹک گئے ہیں۔ ہم دونوں ایک کھڑکی کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئے۔ باہر غائب تیز دھوپ اور گرمی تھی لیکن اندر بہت خوشگوار تھا۔ اگست میں ماسکو پر بہار کا احساس ہوتا ہے۔

"بڑے دنوں بعد دکھائی دی ہو۔"

"ہاں۔ میں یہاں نہیں تھی۔ کیف گئی ہوئی تھی۔"

"میں کئی مرتبہ پینو رامامی گیا۔ کتنے عرصے کیف رہیں؟"

اس نے میری اس بے تکلفی کا جواب نہ دینا چاہا۔

"کیوں ماسکو پسند آیا؟"

"بہت۔۔۔ یہاں کے لوگ سادہ ہیں۔ زندگی عام فہم ہے۔ شام کو جب سڑکوں پر نیون کے اشتہار نظر نہیں آتے تو بڑی راحت کا احساس ہوتا ہے۔ سارا شہر سسترا سسترا لگتا ہے۔"

وہ خوش ہو گئی جیسے میں نے اس کے محبوب کی تعریف کی ہو۔

"تمہارے شہروں میں اشتہار ہوتے ہیں؟۔۔۔ خاص کر نیون کے؟"

اس نے سوال کیا۔

"نم کراچی آؤ تو پتہ چلے آدھی کراچی اشتہاروں سے روشن رہتی ہے۔"

اس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا پھر چپ ہو گئی۔

”کیا بات ہے سونیا —؟“

”کچھ نہیں۔ تم برا مان جاؤ گے —“

”نہیں — اب میں پہلے سے زیادہ روس آشنا ہو گیا ہوں۔“

”تمہارا غریب ملک ہے — اور — تم لوگ اشتہاروں پر اتنا پیسہ ضائع

کرتے ہو — اگر یہ اشتہار نہ پھیں تو انشیا اتنی منگی نہ ہوں جتنی ہو رہی ہیں —

بھلا ایک غریب ملک کی CONSUMPTION اس آسائش کی کہاں متحمل ہو

سکتی ہے؟ —“

اس کی بات درست تھی۔ وعدہ بھی میں نے ہی کیا تھا کہ میں برا نہیں مانوں گا۔

لیکن دشمن کی آمد پر جانوروں کے جھرے بال کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی میں بھی

اسے کوچنے کے لئے تیار ہو گیا۔ ہم پاکستانیوں کا بھی عجیب مزاج ہے۔ ہم اپنے گھر بیٹھ

کر اپنے ہم وطنوں پر، اپنے ملک پر، لیڈر شپ، نظام پر چلے جو کچھ بھی کہیں، پاکستان

سے باہر نکلتے ہی ہمارا تعصب بڑھنے لگتا ہے۔ ہم پاکستان پر سچی جھوٹی کوئی تہمت

برداشت نہیں کر سکتے۔ اسی جذبے اور جوش نے سفید دنیا میں ہمارے خلاف ایک مخالف

سا بنا رکھا ہے۔ لندن میں اس نفرت نے پاکی بیشی کی شکل اختیار کر لی ہے کینیڈا

میں ویسے ہی ”پاکی پاکی“ کہہ کر ذلت کا احساس دلاتے ہیں۔ اور تو اور سعودی عرب میں بھی

پاکستانیوں سے کچھ ایسی تواضع کا برتاؤ نہیں — باقی فیکٹر اپنی جگہ درست ہوں گے لیکن

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ بیرون پاکستان جو کچھ نفرت پاکستانیوں کو پیش آتی ہے اس کی

ایک وجہ وہ محبت بھی ہے جس کے اظہار سے ہم لوگ باز نہیں آتے — پاکستان کو ذرا

کسی نے کچھ کہا اور ہم نے میان سے عموماً نکالی —

”تم ہاں کو یہ بہت فخر کرتی ہو۔“ میں نے گواڑ سے کہا۔

”کیوں نہیں — روس دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے — ہاں اسکا دُنیا کا

خوبصورت ترین شہر ہے۔ ہم دنیا کی عظیم ترین قوم ہیں اور ہاں اسکو روس کا دل ہے

دل — روسیوں کی جان ہے جان —“

مجھے یوں لگا کہ میں نے اسے دیوار سے لگا کر دونوں بازو اس کے کندھے

کے دائیں بائیں رکھ کر اسے چنگل میں بھنسا لیا — میں نے آہستہ آہستہ کہا:

”یوں لگتا ہے سونیا کہ تم کمیونزم کی اعلیٰ سپرٹ نہیں سمجھتی — کمیونزم نے

معاشرتی اوپنچ پیچ اس لئے مٹائی کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو دولت کی وجہ سے شرمندہ

نہ کر سکے۔ اپنے آپکو دوسرے آدمی سے بہتر نہ سمجھ سکے۔ اگر فخر کرنے کے لئے متکبر

ہو نہ کے لئے کچھ اور بھی وجوہات ایجاد ہوتی رہتی ہیں تو پھر دولت پر اعتراض کیوں

یہ اچھی خاصی معقول وجہ ہے انسانی فخر کے لئے — پہلے لوگ اپنی ملکیت پر فخر

کرتے تھے اب قومی ملکیت پر متکبر ہیں — ”مکبر چاہے ذات کا ہو چاہے قومی سطح کا

”مکبر ہی رہے گا —“

”کمال ہے۔ کہاں ذاتی ملکیت۔ کہاں قومی ملکیت؟ — فخر کرنے کیلئے

ہر روسی کے پاس ایک ساروس ہے۔ کسی کے پاس بڑا یا پھوٹا ساروس یا یہ نہیں ہے۔

”ہو سکتا ہے کسی پھوٹے ملک کے باشندے کے پاس اتنا بڑا فخر نہ ہو —

اور اسے احساس کمتری کا شکار ہونا پڑے پھر — کیا بنی نوع انسان پر یہ زیادتی

نہیں — یہ قومی فخر — یہ قومی ملکیت — پہلے ایک روسی دوسرے

روسی سے بہتر تھا — اب ایک روسی دوسری قوموں سے دوسرے لوگوں سے

بہتر ہے۔ بات تو وہی رہی —“

وہ چپ ہو گئی — جھوٹا سا گنگنا تپا پرندہ برف میں دب گیا —

بڑی دیر تک ہم دونوں اپنا اپنا سینڈویچ کھاتے رہے اور ایک دوسرے

سے نظریں چراتے رہے۔ دوستی کے لمحات، محبت کے لمحات میں نظریاتی زہر گھونٹتے رہے۔ پھر کہیں سے ایک بادل کا ٹکڑا سورج کے سامنے آگیا۔ سارے ماسکو پر یکدم سورج کی روشنی بند ہو گئی۔ ٹادری کی روشنی کم ہو گئی۔
میں نے اس سے کہنا چاہا:

”سونیا آئی ایم سوری — میں تو دوستو فنسکی کا عاشق ہوں — میں اسے سارے کلاسیکی ادب کا گرد مانتا ہوں۔ بھلا میں روس کے خلاف زبان کھول سکتا ہوں۔ . . .“

لیکن میرے منہ سے کچھ نہ نکلا۔

”سنابے تمہارا ملک نظریاتی ہے — اس کی کوئی جغرافیائی وجہ نہیں ہے نہ ہی یہ کسی جنگ کے بعد بننا ہے۔“

میں معافی مانگنے کے موڈ میں تھا۔ لیکن اب مجھے پتہ چلا وہ بھی چلے کی پیالی میں طوفان اٹھانے کا ارادہ رکھتی ہے۔
”نہ صرف نظریاتی بلکہ مطالباتی —“

”اس کے پانچ صوبے ہیں اور ہر صوبے کی زبان مختلف ہے۔“

ہے ناں؟

”لیکن ہم سب کا مذہب ایک ہے۔“

”عجیب سی بات ہے۔ تم پاکستانیوں کی شکلیں، زبان — کلچر سب ہندوستانیوں جیسا ہے۔ میں ہندوستانیوں سے ملتی رہتی ہوں — پھر تم لوگوں نے ان سے علیحدہ ہو کر اپنا علیحدہ ملک کیوں بنایا — ہمارے ملک میں بہتر زبانیں بولی جاتی ہیں۔ پھر بھی ہم اکٹھے ہیں۔“

”ہمارے ہاں بھی پانچ زبانیں بولی جاتی ہیں اور ہم اکٹھے ہیں۔“

”لیکن علیحدہ ملک بنانے کی ضرورت کیا تھی۔ آخر تمہارا اور ان کا اتنا کچھ سا بچا ہے۔“
میں واقعی اسے تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا لیکن میں خاموش بھی کیسے رہتا۔ میری پہلی محبت پاکستان تھی۔

”تمہارا کلچر، رہن سہن، شکلیں، رسم و رواج، مذہب، عقیدہ سب کچھ فرانس سے ملتا ہے۔ پھر تم ان کے ساتھ ایک ملک کیوں نہیں بنالیتے —؟“

وہ نرم پڑتے ہوئے بولی — ”چلو ملک بنالیا — اب اتنے چھوٹے وقفے میں دو جنگوں کی کیا ضرورت تھی — خواہ مخواہ — اتنی نفرت کی وجہ کیا ہے؟ — اب بھول بھی جاؤ — اتنا چھوٹا سا ملک ہے اور اتنے بڑے ملک کے ساتھ دشمنی پال رہا ہے۔“

”وہی وجہ سونیا جو تم لوگوں کے دلوں میں فرانس کے خلاف نفرت بن کر بیٹھی ہے — روس اتنا بڑا ملک ہے۔ جب وہ فرانس جیسے چھوٹے ملک سے نفرت کئے جا رہا ہے تو ہم کس گنتی میں ہیں۔ ہمارے لئے تو وہ جنگیں بھونا اور بھی ناممکن ہے۔“
پنولین کی جنگ ۱۸۱۲ء میں ختم ہو گئی سونیا۔ پھر اب تم ٹرامنٹ گیٹ ڈھاکہ کیوں نہیں دیتے۔ بینو رام کی نمائش بند کیوں نہیں کر دیتے؟

”ہم اپنے بچوں کو ہسٹری پڑھانا چاہتے ہیں کہ وہ دوست دشمن میں پہچان کر سکیں۔“

”کیا میں دست بستہ پوچھ سکتا ہوں کہ ہسٹری سے سبق سیکھنا روس کا خصوصی حق ہے کیا؟ اگر آپ لوگ اپنی عبرتوں کو آئندہ نسلوں کے لئے تازہ رکھنا چاہتے ہیں تو کیا یہ خصوصی حق صرف روس کا ہے۔ . . . کہ کیا ہسٹری سے سبق سیکھنے کا بھی کوئی خاص ویزا ملتا ہے۔ کوئی سیکورٹی جمع کرانی پڑتی ہے گا رٹی سے پہلے۔“

اب سونیا کے ماتھے پر تیوری پڑ گئی۔ دوستی کا لمحہ آیا لیکن دلوں کو بند پارک واپس

چلا گیا۔

وہ اٹھی۔ آہستہ سے اس نے تسوے دایا کہا اور چلی گئی۔ مجھے لگا۔۔۔۔۔ وہ مجھے پھر کبھی ملنا نہیں چاہتی۔

اس ملاقات کے بعد میں نے اسے تلاش بھی نہ کیا۔ ٹی وی ٹاور پر ہماری ملاقات کا مرکٹ اچانک بنوڑ ہو گیا تھا۔ میں اپنی بدزبانی کی تلافی کرنا چاہتا تھا۔ معافی مانگنے کے موڈ میں تھا۔ میں نے ایک کمزوری لڑکی کو وطن پرستی کی بہت زیادہ مزادی تھی لیکن مجھے اس کے گھر کا پتہ معلوم نہ تھا۔ پیئوراما میں پسینے کے پتہ چلا کہ سونیا کو کڑی چھوڑ کر جا چکی ہے۔

اس روز گور کی مٹریٹ کے بیلے گھر میں ISMERALDA نامی بیلے کی غائٹ نفی مرٹک سے بالکل احساس نہ ہوتا تھا کہ اندر اس قدر بڑا ہال ہوگا۔ چھوٹے سے پچھلے سے داخل ہو کر میں اندر چلا گیا۔ دو ہزار سیٹوں کا ہال کچھ بھرا تھا لیکن سارے ہال میں اندھیرا اور خاموشی اس درجہ تھی کہ محسوس بھی نہ ہوتا تھا کہ یہاں کوئی موجود ہے۔ میرے چپ چاپ مسخرے بیلے کو دیکھنے لگا۔ انٹرول کے وقت جب میں تازگی حاصل کرنے کیلئے بنگلی رینڈوران میں گیا تو سونیا مجھے ایک کاؤنٹر کے سامنے کھڑی نظر آئی۔ اس تک پہنچنے کی کوشش محال تھی کیونکہ لوگ درمیان میں دیوار کی طرح کھڑے، آلو بخارے کا رس انا کا پانی، بیڑ اور برف کھانے میں مشغول تھا۔ معافیوں مانگتے اور ایکسکیوز می کہتے جب میں اس کاؤنٹر تک پہنچا تو وہ جا چکی تھی اور لوگ دھڑا دھڑھال میں لوٹ رہے تھے۔ اس امید میں کہ وہ ہال سے نکلے گی تو میں اس سے مل لوں گا۔ بیلے ختم ہونے سے پہلے بڑے پچھلے پر آکر رک گیا۔ لیکن پتہ نہیں وہ کہاں سے رخصت ہو گئی یا کیسے پاس سے گزر گئی کہ میں اسے دیکھ نہ سکا۔ کاش اس روز وہ مجھے مل جاتی تو میں اسے بتانا کہ روٹی بیلے نے مجھے کس درجہ متاثر کیا ہے۔ ایک ہی ٹانگ پر لٹو کی طرح گھومنے والے ڈانسر

تئیلوں کی طرح گھسنے جانے، بھونروں کی مانند لڑاں، ان لوگوں نے تو انسانی تہذیب کا ہر حسن اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔ اس سے پہلے روسی مرکس اور کو سک گھڑ سواروں نے مجھے ورطہ حیرت میں ڈال رکھا تھا۔ میں سونیا کو بتانا چاہتا تھا کہ مجھے روس کی تخلیقی قوت نے بے حد متاثر کیا ہے۔ اگر روسی لوگ اسی ترنگ سے کندھے سے کندھا جوڑ اپنی سرحدوں پہنچنے لگیں تو کوئی ٹینک ان کا کالم توڑ نہیں سکتا۔ اگر وہ اپنے گھڑ سواروں کو ہالہ کی چوڑیاں سر کرنے کے لئے بھیج دیں تو سموں سے چنگاریاں اڑاتے یہ گھوڑے خیال سے بھی پہلے وہاں پہنچ جائیں گے۔ لیکن سونیا تو پتہ نہیں کس دروازے سے رخصت ہو گئی؟ اسے کیا بتانا کہ روس کا ملکی جینس ناچ میں ہے۔ زندگی کا رقص۔ موت کا رقص۔ میں سونیا کے پاس بیٹھ کر بلے چوڑے اعتراف کرنا چاہتا تھا لیکن میرے سامنے گور کی مٹریٹ تھی۔ رات کا وقت تھا اور بیلے تھیرے نکلنے والوں کا شور تھا۔ میں سوچتا ہوا چلنے لگا۔

ایک تو ہر ملک کا فرد فردا جینس ہوتا ہے اور ایک اس ملک کا مجموعی خصوصی جینس ہوتا ہے۔ اسی مجموعی جینس سے اس ملک کے آرٹ کا پتہ چلتا ہے کیونکہ آرٹ سوئی کا نام ہے جس سے قوم کا باریک آئی کیو بڑے تو اتر سے گزرتا رہتا ہے۔ انگلستان کا جینس اس کے ڈرامے کی شکل میں سامنے آیا۔ ہم شیکسپیر کو انگلستان کی سائیکی کا مجموعی سراپہ کہتے ہیں۔ اسی طرح امریکہ کا جینس سیاسی ہے۔ چھوٹی چھوٹی سیاسی بصیرتیں مل کر برابر ہم نگوں جیسی دولت میں اکٹھی ہوئی ہیں۔ جاپان کا قومی جینس اس کی ایکٹر ونکس میں بند ہے۔ وہ مرٹکوں پر آتے جلتے کمزور جھک کر خوش آمدید خدا حافظ کہتے، روزمرہ کی پابندی میں چھوٹے سے ایکٹر ون لگتے ہیں۔ انہوں نے ایکٹر ونکس کو چھٹی حس کی طرح ایک ناقابل فہم حقیقت بنا دیا ہے۔ جرمنی سرمنڈل ہے۔ اس کے دیس کی ہوائیں سازوں کو جنم دیتی ہیں۔ اس کا مجموعی شعور موسیقی میں ڈوبا ہے۔ بینٹون باخ، موزاٹ، شوبرٹ،

سب ایسے بادلوں تلے پر دان چڑھے ہیں جن سے سویتی مٹر شرح ہوتی ہے۔

ہر ملک میں، ہر قوم میں وقتاً فوقتاً مہمان پریش پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ یہ جنٹس لوگ اپنے ملک کی سمتیں، کلچر، آدرش، رسم و رواج، سوچ کو بدلنے کے لئے آتے ہیں۔ لیکن یہ مہمان پریش فرد کی حیثیت میں بٹے ہوئے ہیں۔ ان کا تعلق قومی جنٹس، مجموعی ملکی جنٹس سے نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ سوئس لوگ فرداً فرداً اور مجموعی طور پر گھڑی بنانے کا خصوصی ملکہ رکھتے ہیں۔ قومی جنٹس سے میری مراد وہ خاص لگاؤ ہے جو کسی قوم میں اس وقت بھی ملتا ہے جب اس میں مہمان پریش پیدا نہیں ہو رہے ہوتے۔ وہ اپنی خصوصی مجموعی سائنسی کے زیر اثر اپنی فیلڈ میں معرکے مارے چلے جاتے ہیں۔ ان کا دھارا اس میدان میں کبھی ختم نہیں ہوتا۔

روس میں بیلے، امریکہ میں پالیٹکس — سعودیہ میں مہمان نوازی، فرانس میں نئی سوچ — علیٰ ہذا تقیاس ہر ملک اپنی قومی سطح کے جنٹس سے دوسرے ملک کے سامنے اپنا شرف قائم رکھتا ہے۔ برصغیر کا قومی جنٹس سفید آدمی سے مرعوب ہوتا ہے اس میں ہندوستانی پاکستانی دونوں ایک سے خوف زدہ ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پاکستانی مرعوب ہو کر سفید نام آدمی کی نقل اتارتا ہے اور اس کے ہم پلہ ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ ہندوستانی بغا ہر اپنے لباس، زبان، کلچر پر ڈٹا رہے گا لیکن خوف زدہ وہ بھی ہو گا۔ اندر سے اس کا بھی لہو سوکھتا ہے — وہ بھی نما مقرر سا دھی اہنسا اور تیاگ کے باوجود مغرب کے کارناموں پر انگشت بدندان رہتا ہے۔

ہولے ہولے میں تسوے دانا، سی پاسی با، نیت کا استعمال خوب موقع پر کرنے لگا تھا۔ غالباً نیت ایک ایسا لفظ ہے جو روس میں سب سے زیادہ اٹل اور بامعنی ہے۔ ہماری دکانوں پر اگر سامان موجود نہ ہو تو بھی ”با جی جی“ — ”آپا جی“ کے لئے دکاندار ساتھ والی دکانوں سے سامان منگو کر دکھا دیتا ہے۔ خرید وادیتا ہے۔ لیکن روسی دکاندار

ہوٹل کا بیرا، ٹیکسی ڈرائیور کی زبان سے جب ایک بار نیت کا لفظ نکل جائے تو پھر اس پر سیجے کا شبہ کرنا زیادتی ہے۔ جو چیز نہیں ہے نہیں ہے۔ ویسے بھی ابھی روس CONSUMERS GOODS کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ وہ قومی سطح پر ایسے بڑے بڑے حیرت انگیز پروڈیکٹ بنا رہے ہیں کہ ضرورت کے سامان کی طرف ابھی ان کی ویسی توجہ نہیں جیسی امریکہ اور جاپان کی ہوتی ہے۔ وہاں ٹرکیں، ڈیم، ہوائی جہاز، ہسپتال، ہیوی انڈسٹری، بجلی گھروں پر حکومت کا سارا زور لگتا ہے لیکن عام گاہک کے لئے خوبصورت سینٹ، گھڑیاں، پن، لپ سٹک، ریشمی جرابیں، خوبصورت پیرس، ٹکٹیاں، ایسی چیزیں اگر بنتی ہیں تو بی گریڈ ہوتی ہیں۔ ہر حکومت کی طرح روسی حکومت کا بھی خیال ہے کہ ہمارے عوام اپنے ملک سے محبت کرتے ہیں۔ وہ ملکی ضرورت کے سامنے ذاتی ضرورت کو کوئی اہمیت نہ دیں گے۔ ہر حکومت یہاں دھوکا کھاتی ہے اسے شاید معلوم نہیں ہوتا کہ عام شہری اپنی غرض و غایت سے بندھا ہوتا ہے۔ یہی معمولی لوگ جب ان کی ضرورتیں پوری نہ ہوں، پہلے یہ ضرورتیں آسائش کا غیر ضروری سامان ہی کیوں نہ ہو، تو پوری ملکی ODIOLOGY کو SABOLAG کر دیتے ہیں۔ پاکستان میں مال منگل ہونے لگتا ہے۔ فارن سامان کے خفیہ بازار اڑے کھلنے لگتے ہیں اور روس میں امریکی سگریٹ، لپ سٹک، ریشمی جرابیں، فشک فشک کرنے والے سینٹ دیکھ کر ایک نوجوان روسی لڑکی کو کیونز کے تمام اونچے آدرش بھول جاتے ہیں اور وہ سیدھی سادی لڑکی رہ جاتی ہے۔ اسے خوبصورت لگنے اور محبوب کی لگا ہوں میں بچنے کے سوا کچھ نہیں سوجھتا۔ جس طرح قومی سطح پر اس ملک اور قوم کا بہت ڈراوا ہوتا ہے جس کے پاس ملک ہتھیار ہوتے ہیں، ایسے ہی فرد کی سطح پر اس آدمی کا بہت دبدبہ ہوتا ہے جس کے پاس دوسرے آدمی کو مرعوب کرنے کا سامان ہوتا ہے۔ میرے ساتھیوں میں یونیورسٹی کے دور روسی لڑکے دار یا اور میٹل بھی تھے۔ ہمیں

داریا نے اپنی منگنی کی خوشی میں 'روس' ہوٹل میں مدعو کر رکھا تھا۔ ہم تینوں بہت خوش تھے کیونکہ ہم میں سے داریا سب سے زیادہ جنس مخالف سے پہلے پروا تھا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے شادی کو منظمہ خیر شے ثابت کرتا۔ پھر اچانک وہ ناشیا کے ساتھ کبھی دیکھا جانے لگا اور پھر اس سے بھی اچانک پتہ چلا کہ وہ ناشیا سے شادی کرنے والا ہے۔

جس وقت ہم 'روس' میں بیٹھے انارکار کس پی رہے تھے اس وقت ایرو فلوٹ کی بس سامنے رکی۔ روس ہوٹل کی بیرونی دیوار قریب قریب شیشے کی ہے۔ جہاں ہم بیٹھے تھے وہاں سے سڑک کا منظر صاف نظر آرہا تھا۔ بڑے بڑے ہڈل جسموں والی امریکی عورتیں جینز اور بغیر آستینوں کے باؤز پہنے، سروں پر پیلے اور ٹمکنے والے سرخ رومال باندھے بس سے اتر رہی تھیں۔ ان کے بازو، چہرے دھوپ میں کندنی ہو رہے تھے۔ چہرے پر گہری براؤن پتی پڑی تھی۔ امریکی مرد جسموں پر کافی سامان لاوے لون غنے کی بھرا مارے انگریزی بول رہے تھے۔ ان سب کا لباس سادہ تھا جیسا کہ امیر آدمیوں کا عموماً ہوا کرتا ہے لیکن انہیں اچھی طرح احساس تھا کہ وہ ایک بڑے سپر پاور ملک کے باشندے ہیں۔

ہوٹل میں داخل ہوتے ہی امریکی میزوں کے گرد بے تکلفی سے بیٹھ گئے اور ان کی آمدورفت ٹیلیٹس کی طرف ہونے لگی۔ ان کی میزوں پر ایک بڑی خوبصورت روسی لڑکی ویٹرس مقرر تھی۔ وہ روسی بھیکچی چائے، اتلے ہوئے انڈے ٹوسٹ کا آڈر لے کر چلی گئی لیکن امریکی عورتوں میں نہ جانے کیا بات تھی کہ روسی ویٹرس پلٹ پلٹ کر انہیں دیکھتی جاتی تھی۔

جب روسی ویٹرس بڑا ٹرے لیکر واپس آئی تو امریکی عورتیں اپنے آپکو تازہ دم کرنے کے مرحلوں میں تھیں۔ دینیٹس کھلے تھے۔ لمبی لمبی چمکدار لپ شکلیں چوڑے دبانوں پر پھیری جارہی تھیں۔ کولون کی بوتلوں سے چٹنی دار بازوؤں پر سپرے ہو رہا تھا۔ فلیڈ بوٹ

انارکار لمبی ریشمی جرابیں پہنی جا رہی تھیں۔ آنکھوں پر ماسکارا لگ رہا تھا۔ امریکی عورتیں سیاحوں کی سی بے تکلفی کے ساتھ بالوں کو برش کر رہی تھیں اور ان کے ساتھ آنے والے ان کی تصویریں کھینچ رہے تھے۔ انہیں پروا نہ تھی کہ یہ ان کا پرائیویٹ کمرہ نہیں۔ وہ امیروں کی آزادی کے ساتھ میک اپ کرنے میں مشغول تھیں۔

ویٹرس بہت خوبصورت تھی۔ وہ کسی ایکٹرس کی مانند تھی لیکن اتنا سامان آرائش دیکھ کر جیسے وہ بوکھلا گئی اور دودھ کا جگ اس کے ہاتھ سے پھسل گیا۔ پھر وہ ایکسپوز می کہہ کر پیچھے کی طرف کپڑا لینے بھاگی

پتہ نہیں کیوں لگتا تھا جیسے وہ اچانک احساس کمتری میں مبتلا ہو گئی ہے۔ اگر ساری امریکی عورتیں مل کر ایک عورت بنائی جاتی تو اس روسی ویٹرس جتنی خوبصورت نہ ہوتی۔ لیکن ایک معمولی لپ سٹیک ایک وابیات سینٹ سپرے۔ لمبی ریشمی جرابیں اس لڑکی کو شکست دے گئیں۔ ہو سکتا ہے دنیا کے تمام ملک مل کر بھی روس کی بڑی صنعتوں کو اس کی ہتھیار کاری کو، فلک بوس پروڈیکٹوں کو نہ ہرا سکیں۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک ڈن بل کا سگریٹ — ساری آئیڈیالوجی میں آگ لگا دے کیونکہ ہر فرد سب سے پہلے اپنے آپ سے محبت کرتا ہے اور پھر کسی اور سے۔

حالانکہ ملک سے بھی نہیں۔ مذہب سے بھی نہیں۔ یونیورسٹی میں میٹھل سے میں بہت بے تکلف تھا۔ وہ مجھ سے اپنے ٹاک گھڑ بو حالات، اپنے سابقہ معاشقے، اپنے سفر نامے بیان کر چکا تھا۔ میٹھل سے بات کرتے ہوئے مجھے ہمیشہ لگتا جیسے وہ بھی سندھی ہے اور سکھ کارہنے والا ہے۔ روس ہوٹل میں باتیں کرتے ہوئے اس نے اچانک مجھ سے پوچھا:

"سرد! کیا تمہیں کبھی کسی سے محبت ہوئی ہے؟"

"ہاں —"

”کس سے —؟“

”ایک لڑکی سے اور کس سے —“

”تمہارے ملک کی ہے —؟“ داریلنے سوال کیا۔

”نہیں میرے ملک کی نہیں ہے۔“

”پھر کہاں کی ہے —؟“

”بس ہے کہیں کی —“

پتہ نہیں کیوں میں داریا کو بتانا نہیں چاہتا تھا کہ میں اس کی ہوطن سونیا سے محبت کرتا ہوں۔

”کہاں رہتی ہے؟“

”بس یہیں کہیں —“

”یار مت پوچھو۔ یہ بتانا نہیں چاہتا — میں نے کہا۔“

میں ان دونوں کو کیا بتاتا کہ مجھے واقعی سونیا کا گھر معلوم نہیں۔ وہ اسکاؤڈ کی کس سڑک پر کس گلی میں رہتی ہے۔ اس کے گھر کے کتنے افراد ہیں۔ یہ تمام باتیں میں نہیں جانتا تھا۔ میں تو صرف چاند کے طلوع ہونے کا انتظار کیا کرتا ہوں اور جانتا ہوں کہ وہ او میں نظر پاتی بعد کی وجہ سے کبھی ایک ساتھ نہیں رہ سکتے — چاند اور میں!

اس روز میں اکیلا غنائش گاہ گیا۔ یہ غنائش گاہ اس لئے خوبصورت نہیں تھی کہ اسکی بڑی بڑی عمارتوں میں روس کی مصنوعات ہر وقت عام غنائش کے لئے رکھی رہتی ہیں بلکہ ساری غنائش گاہ ایک پارک تھی۔ اونچے اونچے سو راوک کے درخت، برچ کے درخت — قد آدم چیرٹھ اور بلوط کے درخت۔ اس غنائش گاہ میں چھوٹی سی ٹرین غائبس سواری چلتی تھی اور سیاح جیسے اس میں سوار ہو کر ایس ان وڈر لینڈ پہنچ جاتے تھے۔ غنائش گاہ بہت بڑے رتبے پر پھیلی تھی اس میں بڑی قد آور عمارتیں تھیں جن میں روس میں بننے

والی، اگنے والی، ساخت کی جانے والی مصنوعات ہر وقت غنائش کے لئے رہتی ہیں۔ جب کوئی سیاح اس غنائش گاہ میں داخل ہوتا ہے اسے اونچے گیٹ کے اوپر ایک دہقانہ جوڑے کابت نظر آتا ہے۔ بٹوں پر سونے کا پانی پھرا نظر آتا ہے اور ان کے ہاتھوں میں گندم کا گٹھا سورج کی روشنی میں جگہ جگہ چمکتا ہے۔

جس وقت میں غنائش گاہ کے اندر گیا اور ایردفلوٹ کے فل سائز ماڈل کے پاس سے گزرا سونیا میرے دل و دماغ میں کہیں نہیں تھی لیکن جس وقت میں گاڑی میں سوار ہو گیا تو یکدم کہیں سے سونیا کی خوشبو آئی۔ وہ میرے پاس سیٹ پر بیٹھی مسکرا رہی تھی اب ساری غنائش غائب ہو گئی۔ میرے ارد گرد صرف جنگل پھیل گیا اور مجھ میں کسی سو رکی روح آ بسی جو بارش کے بعد یکدم جنگل والوں کے لئے ناپنے پر مجبور ہو جاتا ہے — سونیا پاس تھی۔ روس اپنا تھا۔ ہر ایک شخص اسی داخلیت کا شکار ہو کر ایسی GENERALTTES

میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ پھر کبھی اسے مٹالے کا حوصلہ نہیں پڑتا۔ انسان اپنے تجربے کے ہاتھوں اس قدر مجبور ہے۔ اپنے ماحول کا یہاں تک پابند ہے کہ اس کا سارا تجزیہ اس کی فلاحی شاذ ہی ان دونوں چیزوں سے نکل سکتی ہے۔ میں سونیا کو دیکھ کر یہاں تک خوش تھا کہ میں نے دل میں عہد کیا کہ اب میں روس کے خلاف ایک لفظ نہیں بولوں گا اور پاکستان تو بھڑا میں جلتے مجھے اس سے کیا لینا ہے، یہاں کون دیکھ رہا ہے کہ میں پاکستان کے بارے میں کیا کہتا ہوں۔ کم از کم سونیا تو زمیں بوس ہو جائے گی۔ سورج اس کے بالوں میں سونے کے باڈر بن رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کیپسین سی کی نیلا ہٹ تھی۔ اس کے کندھے کسی نو بیاہن کی طرح جھکے ہوئے تھے اور اس کی جلد پر شرم کی ہلکی سی لالی تھی — اس وقت میرا کیونز م سے کوئی جھگڑا نہ تھا۔ میرے چڑھنے سے پہلے ہی سونیا نے میری ٹکٹ کے پیسے ادا کر دیئے ہیں نے اسے ڈیڑھ روپل دینا چاہا تو وہ ہنس کر بولی:

”یہ مت سمجھ لینا کہ تم ہی ایک مہمان نواز ملک سے آئے ہو۔ اپنے پاس رکھو آرام سے — اپنے روبرو۔“

ہمارے ارد گرد نمائشی عمارتیں بھاگی جا رہی تھیں۔ جنگل پہلے سے زیادہ گھنا ہو گیا تھا اور سونیا بلاوجہ ہلکے ہلکے ہنس رہی تھی۔

”میں یہ نمائش کئی بار دیکھ چکی ہوں۔ تمہیں جہاں بھی اترنا ہو بتا دینا ہم اتر جائیں گے لیکن میں اندر نہیں جاؤں گی۔“

”جب تم کسی عمارت کے اندر جانا نہیں چاہتیں تو پھر آئی کیوں ہو؟ —“

”مجھے یہ باغ اچھا لگتا ہے۔ درخت اچھے لگتے ہیں۔ یہ رائیڈ اچھی لگتی ہے۔“ وہ پھر ہلے ہلے ہنسنے لگی۔

”کیوں ہنس رہی ہو سونیا —؟“

”آج میں ہنستی رہنا چاہتی ہوں کہ کچھ میری ساگرہ ہے — آج میں تم سے جھگڑانا نہیں چاہتی۔“

”لیکن کیوں؟ — آخر جھگڑا کیوں ہوگا؟“

”بس ہوگا ناں — اگر میں اندر صنعت گا ہوں میں تمہارے ساتھ گئی تو تم بھڑک اٹھو گے — میں جانتی ہوں تم برداشت نہیں کر سکتے۔“

”کیا برداشت نہیں کر سکتا میں؟ —“

”بس یہی — روس کی صنعتی، معاشرتی، زرعی، خلائی ترقی — تم جلتے ہو روس

سے اسی لئے چھید نکالتے ہو۔“

جیسے یکدم سورج بادلوں میں چھپ گیا۔ اس روز میں بہت اداس تھا۔ روس میں طالب علم کی زندگی کو کہن کی زندگی ہے۔ اسے محنت کی چکی میں پینا پڑتا ہے۔ دو سال کی مسلسل محنت نے مجھے پرانی جراب کی طرح بودا کر دیا تھا۔ میں چپ ہو گیا۔ تین مرتبہ ہنسنے

روسی مصنوعات کی مختلف بلڈنگوں کے ٹکٹ خریدے اور بغیر اندر داخل ہوئے پھر گاڑی میں آ بیٹھے۔ اونچے اونچے درختوں میں سفر ہنتر تھا — پاس پاس گھٹنے، پاس پاس کندھے، بات کرتے وقت سانسوں کی ٹلی جلی خوشبو۔ اس سفر میں بہت آند تھا — اور باہر مری تھی۔

جب تیسری بار ہم نے جنگل کا پورا چکر کاٹ لیا اور اس جگہ پہنچے جہاں ایرڈفلو کا پورا جہاز بطور ماڈل کے کھڑا تھا تو سونیا اتر گئی:

”اتر آؤ سمرو — یہاں پر اس سٹینک کی نمائش ہے جو خلائی سفر کو گیا تھا۔ جب اپنے دیس جاؤ گے تو لوگوں کو بتانا کہ تم نے اپنی آنکھوں سے سٹینک دیکھا تھا۔“

اس کے اترتے ہی گاڑی میں گرمی نہ رہی۔ میں بھی بادلِ نخواستہ اتر ادا اس عمارت پر نگاہ کی جس میں خلائی سفر کے متعلق تمام انفرمیشن، مشینری، ہوابازوں کے سوٹ، راکٹ سب کچھ عوام کے لئے لگا تھا یہ ایک ہوائی جہازوں کے ہینگر جیسی جگہ تھی جس میں جا بجا گھڑیاں، کمپیوٹر مشینیں لگی تھیں جیسی امریکی فلموں میں مشینوں سے چکا چوند کا سماں ہوتا ہے۔ یہ جگہ بھی عام آدمی کو چھوڑا کرنے کے لئے کافی تھی۔ سونیا عمارت کے اندر میرے ساتھ نہ آئی بلکہ باہر کھڑی ہو کر آئس کریم کھانے لگی۔ شاید وہ سا آتی تو میں زیادہ دلچسپی سے انسان کے اس محرکے کو دیکھتا۔ لوگ باگ ٹکٹ خرید کر راکٹ کے اوپر تک جا رہے تھے لیکن میں ان مانے جی سے تمام مشینری کا چکر لگا کر واپس لوٹ آیا۔ یہ سارا سارا تو سامانِ خلا کی طرح ٹھنڈا اور بے جان تھا۔

جب میں باہر پہنچا تو سونیا کی آنکھوں میں فتمندی تھی۔

”دیکھا دیکھا — اب تو قائل ہو جاؤ — اب تو قائل ہو جاؤ کہ روس دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے۔“

”کیسے مان جاؤں — جب اپا لو گیا رہ میں سب سے پہلے تین امریکن چاند پر پہنچے۔ نیل آر مسٹر انگ، مائیکل کولنز، ایل ڈرن۔ اصلی بات تو انسان کا چاند پر پہنچنا تھا۔“ پتہ نہیں مجھے کسی امریکن سے کیا ملتا تھا پر سوینا کو جلدانے کے لئے میں نے کہا۔

مجھے انسان کے چاند پر پہنچنے سے کوئی غرض نہ تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ یہ جملہ سن کر بھڑک اٹھے گی۔ وہ یہ تو برداشت کر سکتی تھی کہ روس اور امریکہ ساٹ کی کانفرنسوں میں آپس میں بندر بانٹ پر ایک دوسرے سے لڑیں لیکن وہ یہ قتل عمد نہیں دیکھ سکتی تھی کہ ایک چھوٹے ملک کا آدمی روس کے مقابلے میں امریکہ کو ترجیح دے۔ وہ کسی زندانی کی طرح بھڑک اٹھی:

”تمہارا امریکہ — تمہارا امریکہ — انسانوں کو کچھ نہیں سمجھتا۔ وہ انسانوں کے ساتھ کھیل سکتا ہے۔ انہیں چاند پر بھیج سکتا ہے۔ ان پر تجربہ کر سکتا ہے — ہم انسانوں سے محبت کرتے ہیں۔ جب تک فضائی سفر ہر قسم کے خطرے سے پاک نہیں ہو جاتا ہم خلائی سفر پر انسان کو کیسے بھیج دیتے۔ پتہ نہیں جہاں کہیں صہ جمہوریت ہوتی ہے وہاں انسان کیوں اتنا بے وقعت ہو جاتا ہے۔“

یکدم مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں پھر سرحد عبور کر کے اس کی حدود میں ہتھیار بند پہنچ گیا تھا۔

آخر جب کبھی کوئی اپنی تخلیق پیش کرتا ہے تو اس کا مقصد تنقید حاصل کرنا تو نہیں ہوتا۔ سوینا نے مجھے اس لئے تو اندر نہیں بھیجا تھا کہ میں چھوٹے ہی روسی ٹیکنوجی کی ٹانگ گھسیٹنے لگوں۔ لیکن دوستی کا لمحہ نکل چکا تھا۔ اب خارششوں کی طرح ہم دونوں کے تیرغا پر کھڑے تھے اور ہم ایک دوسرے پر حملہ کرنے کو تیار کھڑے تھے۔

میں چونکہ تھرڈ ورلڈ کا آدمی تھا اور میں نے جمہوریت کو بہت سے سچے اپنے مذہب

سے بھی زیادہ اہمیت دے رکھی تھی اس لئے مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ جمہوریت مرد ملکوں کا شگوفہ ہے وہیں کھلتا ہے اور وہیں خوشبو دیتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ جمہوریت انسانی سوچ کا کرشمہ نہیں بلکہ کوئی آسمانی محیفہ ہے جو سیاسی حل نہیں الہامی حل ہے اس لئے سوینا کے جملے کو برداشت کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ تھرڈ ورلڈ کے تمام کالے، براؤن، پیلے، گندمی، سفید لوگوں کو پاؤڈر ملک کے ساتھ ساتھ جمہوریت بھی راس آگئی ہے۔

میں نے جل کر کہا:

”سوینا۔ جمہوریت اور کمیونزم میں کوئی فرق نہیں — یہ تم چھوڑ ہی دو۔ رہنے ہی دو۔ ورنہ انسان کی قدر یہاں ہے نہ وہاں —“

”تمہاری جمہوریت میں ایسے ہوگا — وہاں انسان صرف دوٹ ہے۔ ایک دوٹ — اجتماعی طور پر ایک طاقت اور فرداً فرداً کچھ نہیں۔ بے مایہ — بے حیثیت —“

میں اب مر رہنے کی حد تک ناراض ہو چکا تھا — پھر بھی میں نے مٹھا کر کہا — ”سوینا رانی! انسان دنیا کے کسی خطے میں ابھی اہم نہیں ہوا۔ نہ پہلے ہی کبھی اہم تھا اور نہ اب ہے — پہلے فرد بادشاہ ہوتے تھے اب حکومتیں بادشاہ ہیں۔ پہلے تاج شاہی پہننے والے کو کوئی پوچھ نہیں سکتا تھا اب اکثریتی پارٹی کی حکومت کو کوئی پوچھنے والا نہیں کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے کیوں ہو رہا ہے۔... پہلے بادشاہ متکون مزاج تھے اب حکومتیں، قانون، آئین، تلون کا شکار ہیں۔ انکا مزاج شانہ ہے — پرانے زمانے میں جب بادشاہ جنگوں سے لڑتے تھے تو داپسی پران کے ساتھ بہت سامان غنیمت ہوتا تھا۔ سکندر — محمود غزنوی — نادر شاہ کے ساتھ عورتیں، غلام، کارگاہ۔... خزانے تو ہوتے ہی تھے لیکن وہ

آرٹ کے خوبصورت نمونے بھی ساتھ لے جاتے تھے — تحت طاؤس ایسے ہی ایران پہنچا تھا۔ بادشاہوں کو وقت پر اپنا نام ثبت کرنے کی فکر ہستی تھی۔ وہ خوبصورت عمارتیں چھوڑ کر مرتے تھے تاکہ آئندہ نسلیں انہیں یاد رکھیں۔ ہتھارے لشکر کا بیویڈ اس لئے آباد ہے کہ کچھ روسی بادشاہوں نے غلام و تشدد سے آرٹ اور کچر کے یہ نمونے اکٹھے کئے ہیں — اب بھی حکومتوں کا یہی شانہ مزاج ہے — وہ بھی اپنے دور حکومت کا نام ابد کی لٹ میں لکھوانا چاہتی ہیں، آئندہ نسلوں کے ذہنوں پر — اور یہ چکا چوند وہ سائنسی شعبہ ہے اکٹھے کر کے پیدا کر رہی ہیں تمام دولت بادشاہ بھی فوجوں پر لگاتے تھے — اب بھی حکومتیں ملک کی کمانی ہتھیار کی فیکٹریوں پر ضائع کر رہی ہیں — نہ بادشاہوں کو انسان کی پروا تھی نہ حکومتوں کو۔ بادشاہ دولت سے عیش کرتے تھے۔ بڑی حکومتیں ہتھیاروں کی فیکٹریاں بناتی ہیں — خدائی سفروں کے انتظام کرتی ہیں — عام آدمی کی کسی کو پروا نہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ بادشاہ اپنی ان کی خاطر عام آدمی کے حقوق تلف کرتا تھا۔ حکومتیں عام آدمی کو اجتناب بنا کر یہ احساس دلا کر کہ وہ اس کے حقوق کا تحفظ کر رہی ہیں، اپنی شان بناتی ہیں۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے جو کچھ بادشاہوں نے تعمیر کیا، جمع کیا خوبصورت تھا۔ جو کچھ آج کل کی حکومتیں ذخیرہ کر رہی ہیں نہ خوبصورت ہے نہ دیر پا —

”یہ تم حکومتیں حکومتیں کیوں کر رہے ہو تمہارا مطلب ہے روس نے عام آدمی کے لئے کچھ نہیں کیا —“

”کیا ہے کیلے۔ بہت کچھ کیا ہے۔“

مجھے یاد آگیا کہ میں اس کی سالگرہ کے روز اس سے جھگڑ رہا تھا۔ ”لیکن —“

”لیکن کیا بولو — بولو اب کیوں چپ ہو۔ بولو —“

”تم ناراض ہو جاؤ گی — اور آج میں تمہیں ناراض نہیں کرنا چاہتا۔“

”نہیں بولو — میں ناراض نہیں ہوں گی —“ اس نے مکمل ناراضگی سے کہا۔

”تمہاری حکومت نے عام انسان کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ بہت زیادہ لیکن وہ اس سے بھی زیادہ کر سکتی تھی۔ اگر اس کے اتنے بڑے بڑے پلان نہ ہوتے تاج محل قسم کے۔ سونیا ذرا سوچو تو جو اپنی شان کے لئے چاند کو تسخیر کرنے کی سوچ رہے ہوں۔ انسان کو بیک جنبش صفحہ ہستی سے نیست کرنے کے لئے بم بنا رہے ہوں۔ وہ زمین پر چلنے والے انسان کے متعلق کیا سوچ سکتے ہیں۔ بڑے پلانز والا چھوٹی باتیں کیسے سوچ سکتا ہے —؟“

”تم دقتاؤسی تو ہو ہی سمرو — آج مجھے پتہ چلا تمہاری انفرمیشن بھی درست نہیں —“

”میں تو تمہارے ملک میں آکر، یورپ میں ہر جگہ گھوم پھر کر، امریکہ کے متعلق پڑھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ طاقتور ملکوں کی حکومتیں امیر ہوتی ہیں اور غلام غریب ہوتے ہیں اور چھوٹے ملک جو ایڈ پر چلتے ہیں فرض پر زندہ رہتے ہیں، انکی حکومتیں غریب ہوتی ہیں۔ وہاں افراد کافی امیر ہوتے ہیں۔ آسائش اور آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ میرے دیس میں چل کر دیکھو۔ ایک غریب گھر میں بھی تمہیں کافی افراط نظر آئے گی۔“

”تم دراصل یہ چاہتے ہو کہ افراد میں اونچے نیچے امیری غریبی ہو۔“

”میں تو ایسے نہیں چاہتا — پر ایسے ہوتا ہے۔ ہو رہا ہے ہر جگہ —“

”پھر تمہارا پلان بھی تو کچھ ہو گا — آخر تم دو مردوں پر اس قدر تنقید کرتے

ہو تو تم نے بھی ضرور کچھ سوچا ہو گا کہ بہتر راستہ کون سا ہے —“ سونیا نے

چڑھ کر کہا۔

”ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام ملک قریباً برابر ہوں۔ جہاں زبان بدلے

ملک بدل جائے۔ جہاں پرنچرل سرحدائے نئی سلطنت قائم ہو جائے۔ چھوٹے چھوٹے ملک ہوں۔ چھوٹی چھوٹی بستیوں، ایسی حکومتیں کہیں نہ ہوں جہاں سورج ملک کے کسی نہ کسی حصے میں طلوع رہتا ہو — دادا ابا کے رول سے جب تک بڑے ملک دست بردار نہیں ہو جاتے دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا —

”تمہارا مطلب ہے پچ وڈ پچ وڈ روس چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹ جائے پچ وڈ —“

”تمہارے کیونرزم کا دار و مدار اس مفروضے پر ہے کہ جب دولت کچھ لوگوں کے پاس اکٹھی ہو جاتی ہے تو وہ باقی لوگوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیتے ہیں۔ میرا مفروضہ یہ ہے سوئیا کہ جب دولت، مواقع، طاقت، کچھ ملکوں کی جاگیریں جاتی ہے تو تمہارا چھوٹے چھوٹے ملکوں کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے — پھر جس طرح غریب آدمی پستابے ایسے ہی غریب ملک کا استحصال ہوتا ہے۔ وہ اپنے فیصلے خود نہیں کر سکتا۔ کچھ لوگ ملک میں اپنی زبان بے وقعت ہو جاتی ہے۔ ان کا کچھرا مذہب، سب بیکار ہو جاتا ہے۔ تمہارے کیونرزم نے چھوٹے غریب آدمی کو آزادی دلائی ہے۔ اسے احساس کمتری سے چھڑانے کی کوشش کی ہے — لیکن ابھی ایسا میساج کوئی نہیں آیا جو چھوٹے ملکوں کو من حیث القوم احساس کمتری کے گڑھے نکالے — چھوٹے ملک کو بھی جینے کا حق ہے سوئیا — ساری تھرڈ ورلڈ اس کرب میں مبتلا ہے، تڑپ رہی ہے اور بڑے ملک.....“

”بس چپ کر و سمر و۔ آج میں نے اپنے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر سمر و مجھے مل بھی گیا تو میں اس کی کسی بات کا جواب نہیں دوں گی — تم پاکستانی اگر اس قدر امریکی پیٹھونہ ہوتے تو تمہیں نظر آ جاتا کہ روس کیا ہے اور اس نے عالم آدمی کے لئے کیا کیا ہے — نسوے دانیا —“

وہ گیٹ کی طرف چلنے لگی۔

”سوئیا۔ آج تمہاری سالگرہ ہے۔ آج میں تمہیں اس طرح جانے نہیں دوں گا۔“

”میرا بھی خیال تھا کہ میں تمہیں اپنے گھر لے جاؤں گی — لیکن —“

”میں تمہارے لئے ایک خریدوں گا —“

”نہیں اب نہیں — نسوے دانیا —“

”میں وعدہ کرتا ہوں —“

”میں بھی وعدہ کرتی ہوں لیکن میں جانتی ہوں کہ میں اپنے وعدے کی پابند نہیں رہ سکتی — کیونکہ میں روس سے محبت کرتی ہوں —“

”پھر کب ملو گی؟ —“

”یہیں کہیں — کسی روز اچانک — ریڈ سکوائر میں بولشویک چوک میں کارل مارکس کے بت کے سامنے — شاید لینن کی قبر کے پاس — کسی دن — شاید تب تک میں نارل ہو جاؤں —“

”ہو سکتا ہے تب تک ہم ایک دوسرے سے بات کرنا سیکھ جائیں —“

میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ایسے آنسو جن کا میری پیشانی سے گہرا تعلق تھا۔

دراصل میں تین سال روس میں غص پڑھنے کی غرض سے نہیں رہا بلکہ اس وجہ سے بھی ٹکارا کہ کسی طرح سوئیا سے میرا سمجھوتہ ہو جائے۔ کسی طرح میں روس کو سوئیا کی نظر سے دیکھنے اور سمجھنے لگوں۔ ہم دونوں کے درمیان جو ڈراپ سبن ہو جاتا ہے وہ پردہ اٹھا رہے — میں نہیں جانتا تھا کہ سوئیا کہاں رہتی ہے۔ میں یہ بھی اچھی طرح سے معلوم نہ کر سکا تھا کہ دراصل روس کہاں ہے؟ — میں نے ہمیشہ سوئیا کو نشان کیا ہمیشہ روس کو سمجھنے کی کوشش ہی نیت سے کی۔ خاص کر جتنی بار بھی میں لینن گراڈ گیا میں نے

اس شہر میں چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے سونیا کو ضرور ڈھونڈ نکالنا چاہا۔ دریاؤں، ہواؤں اور آدھی رات کے سورج کا یہ شہر عجیب طور پر مجھ پر اثر انداز ہوتا تھا۔ ہر بار یہاں پہنچتے ہی مجھے زکام ہو جاتا اور ساتھ ہی ساتھ میں مرضِ عشق میں مبتلا نظر آتا۔ ہر بار جب میں لاؤنج میں سوار ہو کر میٹرو کی گریٹ کا ٹکس دیکھنے جاتا اور لاؤنج گلف آف فن لینڈ کے سمندری پانیوں میں چل نکلتی تو نارنجی شیشیوں پر سے سورج کی روشنی اندر مسافروں کے چہروں پر منعکس ہوتی۔ ہر روسی لیوٹاؤڈ وڈزنجی کی تصویر بن جاتا۔ میں کسی اور زمانے میں کسی اور عہد میں کھسک جاتا جہاں میں دو ستر فکس کا احمق تھا، اس کا

POSSESSED

تھا۔ میں شہزادہ بھی تھا اور دیوانہ بھی۔ مجھ میں کسی پرانے پادری کی روح بھی تھی اور کسی رندِ مست کی آنکھیں بھی میرے جسم پر لگی تھیں۔ لیکن لینن گراڈ میں سونیا مجھے کبھی نہ ملی۔ شاید اس شہر میں کبھی وہ مجھے مل جاتی تو میں اس کا مرید ہو جاتا۔

ماسکاؤ میں تعلیم حاصل کرنا ایک سلسلِ عمل ہے۔ یہاں پڑھائی کلاسوں تک محدود نہیں بلکہ اپنے مضمون میں وسعت اور گہرائی پیدا کرنے کے لئے ہر وقت پڑھنا پڑنا ہے اتنی کڑی محنت کے بعد جو باقی وقت بچتا ہے وہ داریا اور میخل کی صحبت میں کٹتا۔ میخل طبعاً، عادتاً، فطرتاً شاعر تھا۔ پتہ نہیں وہ کس لئے فزکس میں بی ایچ ڈی کرنا چاہتا تھا جبکہ اس کے ہونٹ پکھڑپوں کی طرح شاعرانہ اور سبز آنکھوں میں واڈ کا بکھری ہوئی تھی۔ داریا بہت مختلف تھا۔ اس کے نظریات میں میری طرح بڑی قطعیت تھی۔ اس نے میرے ساتھ اپنے ملک اور کمیونزم کو کبھی زیر بحث لانے کی کوشش نہیں کی لیکن وہ ہر مسئلہ کا علاج یا تو واڈ کا یا لینن کی زندگی میں تلاش کر لیتا تھا۔ داریا کہا کرتا تھا کہ ان دونوں نے مجھے آج تک کبھی بالوں نہیں کیا۔

ہم تینوں کبھی کبھی اکٹھے کریملن جایا کرتے تھے۔ میخل ہیں لینن کی قبر کے پاس اپنی نظلیں سنایا کرتا۔ داریا باپ کے سے فخر سے یہ نظلیں سنا کرتا تھا۔ اس کی حضرت مسیح

جیسی صورت پر ایسے وقتوں میں بڑی حیا ہوتی۔

اس روز جب روس میں میرے قیام کو صرف دو عینے رہ گئے تھے ہم تینوں سرخ چوک گئے۔ یہاں ہر وقت، ہر موسم میں نارٹین آتے رہتے ہیں۔ کیمروں کی کلک کلک سنائی دیتی ہے۔ پچر لوسٹ کا ڈجیسی یہ خوبصورت جگہ کبھی لوگوں سے خالی نہیں ہوتی۔ داریا جس کی عادت تھی کہ ہر بات پر مسکرا کر چپ ہو جاتا اور لمبی سوچ بچار کے بعد مذکھوتا اس روز خوب بول رہا تھا۔

”میرا جی چاہتا ہے کہ ایک دن تمہیں واڈ کا میں ڈرلو دوں۔“ داریا نے کہا۔

”کیوں؟“

”جب تمہارے ہر ماں سے واڈ کا نکلے گی تو تم خود بخود سچ بولنے لگو گے۔“

”کیا اب میں جھوٹ بولتا ہوں۔ یعنی۔“

”نہیں تم جھوٹ نہیں بولتے لیکن جو سچ تم بولتے ہو وہ ہمارے لئے قابلِ قبول نہیں۔“ داریا نے مندی مندی آنکھوں سے کہا۔

”دیکھو لینن کی قبر کا سنگ مرمر کس قدر ٹھنڈا ہے۔ جس روز پہلی بار رقیب تمہاری محبوبہ کا بوسہ لیتا ہے اس روز کے بعد تمہاری محبوبہ کے ہونٹ کتنے سرد ہو جاتے ہیں تمہارے لئے۔“

میخل قبر کے چنگل کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ وہ ہم دونوں کی گفتگو میں بالکل شامل نہیں تھا۔

داریا فزکس میں پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہا تھا لیکن مجھے اس کی شکل دیکھ کر ہمیشہ لگا جیسے دراصل وہ پیرا سائیکلو جی کا طالب علم ہے۔ وہ کہیں اندر ہی اندر ٹیلی پیٹھی، سائیکو کائینس، کلیروائنس، ہیپ ناسس پر کام کر رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کا خوردبینی تجسس تھا حالانکہ اس کے ہونٹ شاذ ہی کھلتے تھے۔

”سچ بتانا سمر۔ تمہیں ہمارا روس کیسا لگا؟ — تمہارا ہر جواب میرے لئے قابل قبول ہو گا فقط دل رکھنے کے لئے جھوٹ نہ بولنا۔“

”ابھی میں وطن سے بہت دور ہوں۔ تین سال کی جدائی نے وہاں کارنگ نکھا رو دیا ہے۔ جب بھی میں روس کی تعریف کرتا ہوں مجھے لگتا ہے جیسے میں اپنے وطن کی حق تلفی کر رہا ہوں جیسے محبوبہ کے زانو پر سر رکھ کر اچانک بیوی یاد آنے لگتی ہے اور محبوبہ کی تمام خوبیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ بالکل ایسے ہی — مجھے چند سال واپس جا کر اپنے وطن میں رہ لینے دو داریا۔ پھر میں تمہیں روس کے بارے میں لکھوں گا۔“

”جھوٹ — جھوٹ سراسر جھوٹ — تمہیں روس پسند نہیں آیا۔“

”آیا ہے — آیا ہے — میں اگر چاہوں بھی تو باقی ماندہ ساری زندگی اسکے اثرات سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا۔“

داریا نے اپنی دور مار آنکھوں سے مجھے دیکھا اور ہولے ہولے بولا — ”تمہیں معلوم نہیں سمر — روس دنیا کا مستقبل ہے۔ کوئی شخص بھی اپنے مستقبل سے نفرت نہیں کرتا لیکن کبھی کبھی — سمر تو تم جیسے احمق مستقبل سے خوف زدہ ہو کر حال کو تباہ کر دیتے ہیں۔“

میں نے آہستہ آہستہ گلگنا شروع کر دیا۔ اپنی جادو بھری سامی آواز میں اس نے اپنی نظم سنائی:

”میرے دل کی گھاس پر ایک زرد ٹکڑا ہے

میں نے اسے آنسوؤں سے بہت سینچا

لیکن یہ گھاس کبھی ہری نہ ہوئی

یہ وہی جگہ ہے جہاں تم ایک شام کھنی ٹیک کر لیٹی تھیں

دل کا سارا لان سبز ہے

لیکن یہ زرد ٹکڑا سبز نہیں ہوتا
آنسو اس پر گرتے رہتے ہیں پھر بھی یہ زرد رہتا ہے

ہر رُت میں.....

سوئیا — سوئیا — یہ لڑکیاں بھی کیا بلا ہیں۔ ایک پل — کسی شام
دل کے لان پر زرد رنگ کا ٹکڑا چھوڑ جاتی ہیں جو کبھی تروتازہ نہیں ہوتا —
لینن کی قبر کے چھوڑے قلعے کی سمت پہرے پر مقرر دو سپاہی بڑے تواتر
سے ایک دوسرے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ رنگین کپڑوں جیسے گنبدوں والا آئی
دن دی TERRIBLE گر جا گھر بغداد سے گچی کر کے یہاں نصب کیا لگتا ہے
”جب تم پاکستان چلے جاؤ گے تو پھر ہم کس سے پوچھیں گے۔ بتاؤ ناں تمہیں
روسی کیسے لگے؟ روس کو چھوڑو —“

میں ان کو کیسے بتاتا میرے لئے تمام روسی سوئیا کے باعث پیارے تھے۔ دیگ
کا ایک ہی چادر کافی ہوتا ہے۔

”روسی بہت پیارے ہیں سب کے سب —“

”یہ سب جھوٹ ہے سمر — سچ بتاؤ تجزیہ کر کے — ان کی ایک
خصوصی بات —“ داریا نے جنونی نظروں سے مجھے دیکھ کر کہا۔

”روسی فرد پرست ہیں۔ ان کا سب کچھ لینن ہے حالانکہ ان کا سب کچھ کارل
مارکس ہونا چاہئے تھا —“

”پہلی بات یہ ہے سمر کہ کارل مارکس قبوری تھا۔ لینن نے اس کو علی جامہ پہنایا۔

عمل بہر کیف قول سے بڑا ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ الزام ہے اتنا کہ روسی فرد

پرست ہوتے ہیں — یہ غلط چارج ہے۔ ہم لینن کی بہت عزت کرتے ہیں لیکن

ہم لینن پرست نہیں —“

”ہم بھی فرد پرست ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہم مانتے ہیں کہ فرد کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ کوئی IDEOLOGY فرد کی مثال کے بغیر نہیں چل سکتی۔ تم لوگ مانتے نہیں۔“

”باتیں مت کرو سمر و داریا — دیکھو اس طرف سپاہیوں کا پہرہ بدلنے والا ہے۔ پتہ نہیں اس منظر سے مجھے کیوں لگتا ہے جیسے یکدم موسم بدلنے والے ہوں۔“ میغل نے فاصلے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”آدرش موجود ہو تو اس پر ہر وقت عمل کیا جاسکتا ہے۔“

”ہم مشرق والے — شاہ عبداللطیف بھٹائی کے ماننے والے اس بات کو جان گئے ہیں داریا کہ جب آدرش کو اپنے وجود سے مثال بنانے والا ختم ہو جاتا ہے تو آدرش فقط قول میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہمارے پاس بھی خدا کا بھیجا ہوا قرآن ہے آدرش موجود ہے لیکن ہر مٹ میں، ہر عہد میں، ہر ملک میں قطب ولی ابدال آتے رہتے ہیں۔ وہی آدرش کو علیٰ جامہ پہنا کر سمجھاتے رہتے ہیں — جب کمیونزم کے لینن آئے بند ہو جائیں گے تو کمیونزم بھی کتابوں کی زینت رہ جائے گا۔ پھر لوگ ماننا تو اسے بھی کریں گے لیکن اس پر عمل نہیں کریں گے۔“

”روس کا ہر فرد لینن ہے۔ ہم سب اپنے مسک پر رہبر کے بغیر بھی چلنے کی قوت رکھتے ہیں۔“

مجھے لڑکیوں کا وہ سکول یاد آگیا جس میں لینن نے پناہ لی تھی اور جس کے باہر اب بھی لینن کا بت نصب ہے۔ میں نے داریا سے کہنا چاہا اگر تم فرد پرست نہیں ہو — تو لینن کی یادوں میں ہل کیوں نہیں چلا دیتے؟ اس کے گھر کو میوزیم کیوں بنا رکھا ہے اس گھر میں جانے والے سیدھ کو وہ پاسپورٹ کیوں دکھاتے ہو جس پر لینن یورپ گیا تھا اور جس میں وہ معمولی مزدور کے لباس میں نظر آتا ہے۔ وہ کیاری جو لینن کے بت کے

ارد گرد پھیلی ہے اور جس میں ابہما اسے سرخ جرمینم کے پھول اُگتے ہیں۔ اس میں پھولوں کی اتنی نگہبانی کیوں؟

یہی تمام نشانیاں تو اس بات کی دلیل ہیں کہ کسی نہ کسی طرح فرد زندہ رہے۔ مثال زندہ ہوگی تو آدرش کے بے جان وجود میں گرم لہو دوڑتا رہے گا۔ کبوتر کے لئے مر مر میں جسم کا لہو ضروری ہے ورنہ آدرش صرف ایسے لفظوں میں ڈھل جئے گا جن کو سمجھنا بہت مشکل ہوگا۔

”چلو گم میں چلیں — یہ سرخ چوک اتنا بڑا ہے کہ اس میں ہمیشہ ہوائیں چلتی ہیں اور مجھے ہواؤں سے ڈر لگتا ہے۔“ میغل یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔

سرخ چوک کے تینوں طرف بڑی اونچی عمارتیں ہیں۔ ایک طرف قلعہ ہے دوسری جانب رنگ برنگی گیلریوں والا گرجا ہے اور تیسری جانب گم محل ہے جس میں آج کل بادشاہ شہزادے نہیں رہتے بلکہ ایک بڑا شاپنگ سنٹر آباد ہے

”سمر — پہلی مئی کو ضرور اس جگہ کو یاد کرنا — اتنے ناظرین — اتنے عقیدتمند یا تو مکہ معظمہ میں آتے ہیں یا یہاں — یہ دونوں جگہ عام آدمیوں کے قدموں سے آباد ہیں — تمہارا مکہ — اور ہمارا مکہ!“

ہم تینوں خاموشی سے گم کی طرف چلنے لگے۔ کچھ نا بیخبر باکے سیاحوں نے ہمارے سمیت اس پتھر پر چوک کی تصویریں لیں اور مسکرا کر ہمیں اپنی خوش دلی کا احساس دلایا —

”سمر — مجھے سندھ کے طاس سے تھوڑی سی مٹی بھیجنا —“ میغل نے کہا۔
”کیوں۔ مٹی کا کیا کر دے گا؟“

”چاند کی مٹی کیوں لائے تھے زمین پر — دیکھنا پڑتا ہے کہ روس کی مٹی اور پاکستان کی مٹی کے کیمیائی اجزاء کیا ہیں۔“

"اچھا تو کیمیکل فرق نکال کر کیا کر دگے —؟" میں نے سوال کیا۔

"پھر سمجھ جاؤں گا کہ سندھ میں کیوں سمرو پیدا ہوتے ہیں اور موسکاؤں میں کیوں

میخل پیدا ہوتے ہیں۔"

گم کے بازار میں بہت بھڑکتی۔ موٹی ردی عورتیں بھاری بھاری سفری تھیلے
چیز اور سناکپڑا خرید رہی تھیں۔ ہم تبا کو کی تلاش میں دوسری منزل پر گئے اور وہاں
سے ہم نے نچی منزل کی طرف دیکھا۔ ایک سیلاب تھا جو دوکانوں میں آ جا رہا تھا۔
ضرورت کی چیزیں — ہر ملک میں ہر جگہ عالم آدمی نے ساری معیشت کو —
CONSUMERS GOODS کے تابع کر رکھا تھا — حکومتیں خائف کر رکھی

تھیں۔ . . . !

"تم نے سمرقند نہیں دیکھا؟ —" میخل نے پوچھا۔

"نہیں!"

"دوشنبہ، سمرقند، تاشقند، بخارا — یہ روس کی الف یلوی میراث
ہیں۔ ان شہروں میں اب بھی شہزادیاں پھرتی ہیں۔ یہاں اب بھی لہریارنگوں کے
گاؤں پہنے، لمبی چوٹیاں لٹکائے ترچھی آنکھوں والی لڑکیاں انگور، خربازانی اور آٹو
نیچتی ہیں۔ سمرو اپنے دیسی لوٹنے سے پہلے وہاں ضرور جانا۔ سفید روس کا اور مزاج
ہے اور موسم ہے۔ جنوب کی آب و ہوا اور ہے جیسے اب بھی ریگستانی چوک سے
اونٹوں پر قافلے اٹھتے ہیں — جب تمہیں ماسکاؤ لینن گراؤ بالکل بھول جائیں گے
پھر بھی تمہیں سمرقند یاد رہے گا — جیسے بچپن کا دیکھا ہوا خواب —" میخل شاعر
تھا اور خوابوں سے محبت کرتا تھا۔

"میں تب چھوٹا تھا جب تمہارا خاتم پاکستان آئی تھی۔ میں نے اسے بھی نہیں دیکھا!
"نم ضرور جاؤ — وہ حصہ تمہارے قریب ہے — تمہیں اسے سمجھنے میں آسانی

ہوگی اور اسی رعایت سے روس کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔"
پتہ نہیں یہ میخل کا اصرار تھا کہ میری اندرونی آرزو لیکن کچھ دیر کے بعد میں ہزنی
روس کے لئے روانہ ہو گیا۔

میں بڑی امید کے ساتھ تاشقند کے لئے روانہ ہوا تھا۔ میں نے پچپن سے
تاجکستان ازبکستان کو دیکھنے کی آرزو دل میں ایسے پال رکھی تھی جیسے کنگارو مادہ اپنے
اسپر وبرا برہنہ کچے کو اپنی تھیلی میں پالتی ہے لیکن اسرپورٹ پر زرد ہواؤں میں ریت
تھی۔ گرمی، غربتی اور ان دونوں سے پیدا ہونے والا احساس کمتری ہر آنکھ سے ٹپک
رہا تھا۔ یہ لوگ زردی مائل سفید منگول تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کا حجاب
تھا جو میں سمجھ نہیں سکا۔ کبھی یہ لوگ سفید روس پر حملہ آور ہوا کرتے تھے — دھارے
مارتے تھے — سمرقند — تاشقند — بخارا —

یہ خال ہندوؤں بختم سمرقند و بخارا

جب بادشاہ عنایات کرتے تھے تو پھر خزانوں کا منہ کھول دیتے تھے۔ اس وقت
جب ہندو محبوب کے تل پر تاشقند و بخارا قربان کئے ہوں گے یہ ستم ایجاد شہر خانقاہ
کی شکل کے نہ ہوں گے بلکہ یہاں کی چہل پہل دولہا و دلہوت سے دھرتی کا کلیجہ ہل
جانا ہو گا۔ اب سمرقند اور تاشقند نور جہاں کے مقبرے کی شکل کے آثار الصنادید تھے۔
الغ بیگ کی OBSERVATORY تھی جس میں زمین کھود کھود کر تنچے تک زاویوں
اور ڈگریوں کا حساب لگا کر ستاروں کو دیکھنے کا انتظام تھا۔ بی بی جان کی مسجد ریگستانی
چوک — تینوں مسجدیں جن کے سامنے سے کبھی ہندوستان ترکی ایران کے لئے
قافلے جاتے ہوں گے — یہاں تیمورنگ کا مقبرہ تھا —

سب کچھ ماضی تھا — حال میں صرف کھنڈ رتھے۔ یہاں وہ خوبصورت میوزیم
نہیں تھے جو لینن گراڈ اور موسکاؤ کی زینت تھے — وہ آرٹ کے غولے بھی ماضی کے

آئینہ دار تھے لیکن وہ زندہ تھے جی رہے تھے۔ وہ میوزیم ہاشمی کا حصہ نہیں گتے تھے یہاں علی شیر نوائے میوزیم سے لے کر تمام تاریخی عمارتوں تک ایک اداسی محیط تھی۔ ایک کسمپرسی ایک دکھ — بہتہ نہیں سمرقند اور تاشقند میں مجھے کیوں سڑکوں پر مسلمانوں کا زوال نظر آیا؟ جیسے وہ اٹھنا چاہتے تھے لیکن انہیں معلوم نہ تھا کہ کیسے اٹھا جانا، جیسے وہ اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے اور اس کوشش میں اور الجھتے جا رہے تھے۔ خاکِ مذلت سے اٹھنے کے لئے انہیں کسی ایسے دست گیر کی ضرورت تھی جو ان کی طرح افتادہ تر نہ ہو۔

روس کے جنوب میں پہنچ کر مجھے مایوسی ہوئی — یہاں ہاشمی کی شان و شوکت نہیں تھی اس کا نوہ موجود تھا۔ ہر جگہ ہر چہرے پر — میں نے گھبرا کر یہاں کے تاریخی مقامات دیکھنے بند کر دیئے۔ کتب خانوں میں جلنے لگا۔ ان کی مسجدوں کو دیکھنے لگا۔ میں ان کے قلمی اثاثے میں اپنی وراثت کے آثار تلاش کرنا چاہتا تھا۔ یہیں انسٹی ٹیوشن آف اورینٹل سٹڈیز میں مجھے خانم شمع رولی۔

خانم شمع رولنے لہریئے رنگوں کا گھٹنوں سے پہنچے تک ڈھیلے سکرٹ عمارتیں ٹوب پہن رکھا تھا۔ اس کے بے بال لمبی چوٹی میں رنگ سہے تھے اور سر پر سبز رومال بندھا تھا۔ خانم شمع روسیفید گاچنی کے رنگ کی گرڈ یا تھی۔ اس کے رضا کی ہڈیاں اونچی اور انکھیں ابروؤں کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ میں ایک الماری کھولے انماک سے فصوص الحکم کا نسخہ دیکھ رہا تھا کہ وہ میرے پاس آئی۔ اس کے پیروں میں ایسے جوتے تھے جن کا کوئی شور نہیں ہوتا۔ مسلمان عورت کے جوتے!

”فرمائیے کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتی ہوں؟“ اس نے رواں کتبی فارسی میں کہا۔ ازبکستان کے لوگ اب بھی شاعر طبع ہیں۔ یہ ایرانی لب و لہجہ میں فارسی نہیں بولتے بلکہ ایسی فارسی استعمال کرتے ہیں جو ہمارے ہاں نصابوں میں ملتی ہے۔ عام باشندوں

کو بھی کئی کئی فارسی شعر زبانی یاد ہوتے ہیں جنہیں وہ بروقت استعمال کرتے رہتے ہیں۔ ”میں کسی ایسی کتاب کی تلاش میں ہوں جو کسی روسی سیاح نے لکھی ہو اور جس میں برصغیر کے واقعات بیان کئے ہوں۔“

وہ کچھ دیر اپنے موٹے ریشٹر کو دیکھتی رہی۔ پھر ایک نازک سی سیڑھی پر چڑھ کر اس نے سکرٹ کے کچھ سے سے عینک نکالی۔ لگائی اور ایک کتاب کو جھاڑتی ہوئی بچے اتر آئی۔

”یہ دیکھئے عبدالرزاق سمرقندی کی کتاب — سفر ہندوستان و شرح غرائب — میں شیعہ رو کے سامنے شرمندگی محسوس کر رہا تھا کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ میں مسلمان ہونے کے ناطے سے فارسی خوب سمجھتا ہوں۔ میں اسے سمجھانا چاہتا تھا کہ اب برصغیر کے مسلمان فارسی کی جگہ انگریزی میں گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن اس روسی لڑکی کے سامنے جو اب بھی فارسی بولتی تھی یہ کہنے کا حوصلہ نہ ہوا

شمع رو سے کتابوں کی باتیں کرنے کے بعد میں کتب خانے سے نکل آیا۔ شمع رولنے مجھے دوسرے دن ہوٹل ستارا میں دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا۔ میں وقت سے کچھ پیسے ہوٹل کی کھلی ٹیکس میں پہنچ گیا۔ ہوا میں سستی اور توازن کے ساتھ چل رہی تھیں۔ ہوٹل کی میزوں پر کپڑے اڑ رہے تھے۔ یہاں کے تاریخی مقامات کو یہ ہوائیں ہولے ہولے چاٹ رہی تھیں۔ سب کچھ کھنڈ میں بدل رہا تھا — یہاں کی نئی عمارتیں تمام انگریزوں کے ڈھانچے تھے جن کا اسلامی عمارت گری سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہاں کے میوزیم شمالی میوزیموں کے مقابلے میں فقیرانہ تھے۔ اپنے ہاشمی کی یاد میں گم گشتہ و حیران!

یہاں کے بچے حیدر آباد کے بچوں کی طرح غریب اور محتسب تھے۔ غریب آدمی ہمیشہ ان چیزوں کو غور اور تحسب سے دیکھتا ہے جن سے ایک آدمی دوسرے آدمی سے ممتاز ٹھہرتا ہے۔ کار — کپڑے — جوتے — ویڈیو — سگریٹ — ڈیٹا کس

تو وہ پانی نہیں پیا۔ لیکن نانی اسے سنبھال کر رکھتی ہے۔ وہ چاہتی ہے میں بھی چ کر دوں اور کسی ازبک سے شادی کروں۔“

”تمہارا آئیڈیل کون ہے شمع رو۔ ازبک کہ سفید روسی؟“
 شمع رو بہت خوبصورت تھی۔ اس کا رنگ بال آنکھیں تمام اتناہ کن تھے بھر بھی وہ جیسے ریتی مٹی پر پانی کی آس میں بیٹھی تھی۔

”دیکھو ناں۔ سفید روسی ہم سے خوبصورت ہوتے ہیں۔ پھر ان کی زبان روسی ہے ہماری قومی زبان۔ ہم لوگ تو فارسی بولتے ہیں۔ پھر وہ شمال میں رہتا ہوگا۔ شادی کے بعد میں موسکاؤ جابلسوں کی یا شاید لینن گراڈ چلی جاؤں۔“
 شمع بتانا سفید روسی ہم سے زیادہ مذہب ہیں ناں۔ تمہیں وہاں کے روسی زیادہ اچھے لگتے ہوں گے؟“
 ”شمالی روس۔ اور جنوبی روسی۔“

”کیسے ہو سکتا ہے۔ کیسے ممکن ہے بھلا سفید روسی کے مقابلے میں کوئی کیسے ہیں پسند کر سکتا ہے خواہ خواہ۔“
 ”ہو سکتا ہے ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ہم لوگ۔ متعصب ہوتے ہیں ہمیشہ اپنوں کو غیروں پر ترجیح دیتے ہیں۔“

”تمہارا رشتہ اسلام سے کٹ گیا ہوگا لیکن تم کبے کے بتوں کی طرح وہیں کے ہو جہاں کے ہم ہیں۔“ میں نے کہا۔

وہ چپ چاپ تنہے دیکھنے لگی جہاں برائیوں کے گھیرے میں دامن پھولوں کا گلہ ستہ لے مسکرا رہی تھی۔ ازبک مسلمان کی ازبک دامن۔

میں خانم شمع رو کو ایک واقعہ سنانا چاہتا تھا لیکن چپ رہا کیونکہ وہ روسی زبان کو فارسی سے بہتر سمجھتی تھی۔ شمالی سفید روسی کو اپنے سے شرف میں اعلیٰ جانتی تھی اور موسکاؤ اور لینن گراڈ کے شہر اس کی نظر میں بہشت سے کم نہ تھے۔ اس کا حال اس غریب پتو کی میں

یہاں بھی گرم ملک کے باشندوں کی طرح لوگ متجسس تھے اور دیکھتے تھے۔ غور سے اس طرح شمالی روس میں کوئی بچہ نہیں دیکھتا۔

خانم شمع رو کچھ دیر سے آئی لیکن اس کے آتے ہی لذیذ تیکے، انفیس نان اور سمرقندی پلاؤ آگیا۔ کھانا دیکھ کر روح کے تمام دکھ دور ہو گئے۔ میں نے رغبت کے ساتھ منہ پر سے بچوں کی طرح کھانا شروع کر دیا۔

ٹیرس سے بچنے دف بھائی لڑکیوں کے گھرے میں ایک مسلمان لڑکی عیسائی دامنوں کے لباس میں ہوٹل کی جانب آ رہی تھی۔ شادی کے مہمانوں میں کچھ مرد ناچ رہے تھے اور نفیری کی آواز میں مشرقی مڑتے۔

”آپ کی شادی ہو چکی ہے عثمان سمر؟“
 ”جی نہیں۔ لیکن لڑکی ماں پسند کر چکی ہے۔ جب میں واپس لوٹوں گا تو شادی ہوگی۔“

خانم شمع رو نے فارسی میں شعر پڑھا جو میں سمجھ نہ سکا۔
 ”اور آپ کی؟“

”میں ابھی سوچ رہی ہوں عثمان سمر کہ کس سے شادی کروں؟“

”انتی لمبی سوچ کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”میں اپنی بوڑھی نانی کے ساتھ رہتی ہوں۔ وہ پرانے خیال کی عورت ہے۔ اس کا خیال ہے مجھے کسی ازبک مسلمان سے شادی کرنی چاہیے اور میں کسی سفید روسی سے شادی کرنا چاہتی ہوں جو مسکاؤ میں رہتا ہو۔ جینز پہنتا ہو اور جس کی ڈاڑھی مکئی کے بالوں جیسی سنہری ہو۔“

”نانی ٹھیک کہتی ہے۔“

”وہ ابھی پچھلے سال چ کر کے آئی ہے میرے لئے بھی آپ زمرہ لائی تھی میں نے

بہنے والی لڑکی کا تھا جو اسلام آباد کو اپنی زندگی کی معراج سمجھتی ہو۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ وطن کی سرحدوں سے آگے، رجمی رشتوں سے علاوہ بھی ایک رشتہ ہوتا ہے جس میں بچہ سو سالوں سے خود بخود جان پڑتی رہتی ہے۔ جب انسان اپنوں میں گھرا ہوتا ہے اس کے ارد گرد رشتے ہی رشتے ہوتے ہیں تو اس چودہ سو سال پرانے پیوند کا احساس نہیں ہوتا لیکن جس وقت انسان کسی اجنبی فضا میں کسی مسلمان سے ملتا ہے تو دونوں قلب عجیب گرمی سے تازہ ہو جاتے ہیں اور آپس میں ایسے قرب کا احساس ہوتا ہے جو کسی اور کے ہمراہ محسوس نہیں ہوتا۔

دو شنبے سے قریباً ستر کومیٹر شمالی پہاڑوں میں اس علاقے کا بھی گھر تعمیر کیا گیا ہے اس کو دیکھنے کے لئے میں وہاں گیا تھا۔ دریا کافر نیل کے ساتھ ساتھ مٹرک بل کھاتی ادھر پہاڑوں کی طرف جاتی ہے۔ راستہ میں کھلے آراستہ کھیت، خرمائیوں سے لدے درخت اور زمین پر پھیلے ہوئے تاکستان نظر آتے ہیں۔ کافر نیل کانیکلوں پانی بھرتوں سے ٹکراتا سر پھوڑتا نشیب کی جانب جاتا نظر آتا ہے۔ جس وقت میں ہائیڈرو ایکٹرک شیش دیکھ کر لوٹ رہا تھا تو ہمارے ڈرائیور نے کار میں پانی بدلنے کے لئے گھڑی روکی۔ ہمارے پیچھے ہی ایک کھلی چھت والا ٹرک آ کر رک گیا۔ ڈرائیور اس چھتے پر پانی بھرنے کے لئے چلا گیا جو مٹرک کے کنارے ہی بہہ رہا تھا۔

کھلے ٹرک میں دیہاتی لوگ گھرے رنگوں کے سواتی قسم کے کھلے کرتے ٹخنوں پر تنگ پانچنے والی شلوار پہنے ہوئے تھے۔ لڑکیوں کی شکلیں افغانی سواتی قسم کی تھیں۔ اور ان کے سر دلوں پر چادریں تھیں۔ ہم بھی ٹیکسی سے اتر کر چشمنے میں منہ ماتھ دھونے لگے غالباً تمام دیہاتی لڑکیاں کسی شادی پر جا رہی تھیں کیونکہ ان کا لباس خوبصورت اور نیا تھا وہ دف بجاتی ہوئی گا رہی تھیں جس وقت میں چشمنے کے بر فیملے پانی میں انگور کے کاسنی خوشے دھو رہا تھا۔ ایک بوڑھا آدمی شادی کے گروہ سے کٹ کر میری طرف آیا۔

”یہ کہاں سے آئے ہیں؟“ باباجی نے ہمارے ڈرائیور سے سوال کیا۔
تھوڑی سی فارسی کے سہارے میں اس کی بات سمجھ گیا۔

”پاکستان — آغاز پاکستان آدم —“
”بلے بلے..... ہندی نیست۔“ باباجی نے پوچھا۔

”ناں ہندی نیست — مسلمان —“
”الحمد للہ — الحمد للہ —“

بوڑھے کے چہرے پر چینی قسم کی داڑھی تھی۔ اس کا چہرہ میرے دادا جان کی طرح بھریں سے بھرا تھا۔ اس کی آواز دھیمی تھی لیکن اب یکدم وہ مجھے جو انظر آنے لگا۔ اس کی چچاتی تن گئی۔ آنکھوں میں خوشی چمکنے لگی۔

”واللہ مسلمان میمان —“

اس نے کتنے سارے ترکی نام لئے اور مٹرک کے پار کھڑی لڑکیوں کو پکارا۔

”مسلمان میمان —“

لڑکیوں نے جھوپیاں پھیل کر مجھے پھل پیش کئے۔ وہ ہمارے پہاڑی علاقوں میں بسنے والی لڑکیوں کی طرح شرمیلی اور کھی کھی کر کے ہنسنے والیاں تھیں۔

بوڑھے بابا نے میرے خالی بائیں ہاتھ کو اٹھایا۔ اپنے ہونٹوں سے لگایا اور آہستہ آہستہ کوئی سورت پڑھی۔ پھر اس کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپک کر میرے ہاتھ پر گرا۔
”مسلمان میمان — مسلمان میمان —“

پتہ نہیں کیوں اس آنسو نے میری ساری روح بھگودی۔ ایک مرتبہ میری بڑی بہن سخت بیمار ہو گئی تھیں۔ میں جمعرات کی ساری رات شاہ عبد اللطیف بھٹائی کے دربار میں بڑے دردانہ سے کانڈا پکڑ کر کھڑا رہا تھا — اس رات میرے دل پر اب ہی گریہ طاری تھا جو اس آنسو سے موجزن ہوا۔

سایہ و جہت سے اپنا سامنے کی آرزو مندی میں میرے ہاتھوں پر ایسی باجی کا

سوینا ام ہارنی مقامات کے متعلق پوچھ رہی تھی۔ وہ انسان کے ہلکے پھلے ہوئے

وہ ہمیں پشکن کے بیڈروم میں لے گئی۔ پھر اس نے وہ چھوٹا سا کمرہ دکھایا جس میں پشکن، اس کی بیوی نتالیا، بیوی کی دو بہنیں اور ایک بہن کیسیتھرین کا فرانیسی شوہر رہتا تھا۔ گھراتا بڑا نہ تھا جس میں اتنے سارے لوگ سما سکتے۔ شاید اس طرح بہت قریب رہنے کے باعث ہی کیسیتھرین کا شوہر پشکن کی بیوی پر عاشق ہو گیا۔ پشکن کو دوبار سے منسلک رہنے کا شوق نہ تھا۔ وہ اپنی زندگی کسی دیہات میں ادبی مرگرمیوں میں گزارنا چاہتا تھا لیکن نتالیا دربار کی محفلوں کی جان تھی۔ اسی چھوٹے سے گھر سے یہ خوبصورت بہنیں خوبصورت گاؤں پہن کر دوبار روانہ ہوتی ہوں گی اور پشکن اپنی لائبریری میں بیٹھا سکاٹ بائرن کا مطالعہ کرنے میں مصروف رہتا ہوگا۔

پھر دوبار کے لوگوں نے پشکن کو ان باتوں سے آگاہ کیا ہوگا جو نتالیا اور جو رجیس کے مابین لذت کا باعث تھیں۔ جو رجیس کو پشکن نے غیرت کے باعث ڈوئل میں لٹکا دیا اور جو رجیس جو فوج میں تھا پشکن پر غالب آیا۔ پشکن کو زخموں سمیت اس صوفے پر لا کر ڈال دیا گیا۔ جس کے ارد گرد کتا بیٹھیں۔ ایسی کتا میں جن کو پڑھنے کا ابھی وقت نہیں آیا تھا۔

ایسی کتا میں جو پڑھی جا چکی تھیں لیکن ذہن سے اتر گئی تھیں۔ ایسی کتابوں کے درمیان جو اس کے ادبی تشلس کا ایک حصہ تھیں۔ پشکن نے جان دیدی۔

پشکن جس میں ایسے سینا کے بسنے والوں کا لہو تھا کیونکہ اس کی ماں ہسٹری کی بیٹی تھی اور ہسٹری بال: میڈری گریٹ کا غلام تھا۔ پشکن نے مرنے سے پہلے ضرور سوچا ہوگا کہ کبھی کبھی انسان کو ایسی باتوں کے لئے بھی مرننا پڑتا ہے جو اس کے لئے بالکل اہم نہیں ہوتیں۔

ہم تینوں بہت اداس بیرونی دروازے تک پہنچے۔ فضا میں پشکن کی آخری سانسیں تھیں۔ چھیالیس سالہ روسی عورت کی انگریزی ختم ہو چکی تھی۔ اب وہ سوئیا کے

آنسو تر تھا۔

”مجھے دوستوں کی کا سادہ اور خوبصورت گھر پسند آیا۔ جانتی ہوں اگر وہ صرف جہنم کی اتنی جامع تعریف ہی پھوٹ جاتا جو اس نے پھوڑی ہے تو ہمیشہ زندہ رہتا۔“
”کیا تعریف کی ہے اس نے جہنم کی؟“ سوئیا نے سوال کیا۔
”تمہارا دوستوں کی کتنا ہے جس شخص میں محبت کرنے کی صلاحیت نہیں وہ دوزخ کی آگ میں جلتا رہتا ہے۔“

”اس کے علاوہ؟“ اور —؟“ اس نے پُر امید نظروں سے میری جانب دیکھ کر کہا۔

”پاکستان جانے سے پہلے ضرور بتاؤں گا سوئیا —“

”نہیں۔ ابھی بتاؤ —“

”ابھی نہیں بتا سکتا ناں ورنہ پاکستان نہیں جاسکوں گا۔“

ہم دونوں اکٹھے پشکن کے گھر میں داخل ہو گئے جس کے پہلے کمرے میں ایک کھڑی کرسی پر ایک چھپا سی برس کی بوڑھی عورت بیٹھی تھی۔ اس کے سر پر سیس کا سکارف تھا۔ وہ ہمیں سب سے پہلے پشکن کی لائبریری میں لے گئی۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر انگریزی میں بولی۔

”یہ پشکن کی لائبریری ہے۔ پشکن روس کا وہ شاعر ہے جس نے روسی زبان کو ادبی بنایا۔ وہ ایک ایسا شعلہ نوا شاعر تھا جو حقیقت سے کبھی دور نہیں ہوا۔ یہ اس کی لائبریری ہے۔ یہ اس کا میز ہے۔ یہ اس کا وہ قلم ہے جس کے ساتھ اس نے جلاوطنی کے دور میں نظمیں لکھیں۔ یہاں اس صوفے پر اسے ٹایا گیا۔ جب وہ اپنی بیوی نتالیا کی خاطر ڈوئل میں زخمی ہوا۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ پشکن کی موت کیسے واقع ہوئی؟“
”نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

ساتھ روسی میں باتیں کر رہی تھی اور کبھی کبھی مجھے مسکرا کر دیکھ لیتی تھی۔

دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے سونیا سے روسی میں پوچھا — "اس سے پوچھو سونیا۔ کیا وہاں سردی پڑتی ہے جہاں یہ رہتا ہے؟ —"

میں نے اس کی بات سمجھ کر کہا — "نہیں ماں۔ ہمارے ملک میں تو ہمیشہ سورج چمکتا ہے۔ قریباً ساڑھے سال گرمی پڑتی ہے —"

تو پھر تمہاری ماں کے جوڑوں میں تو درد نہیں ہوتا ہوگا —"

"نہیں ماں — اللہ سائیں کی مہربانی ہے اس کے جوڑوں میں بھی درد ہوتا ہے۔ کیونکہ یہی بڑھاپے کا عمل ہے۔"

بوڑھی عورت نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا — "بیٹے تو نے میرا بڑا دکھ دور کر دیا۔ میں سمجھتی تھی جو گرم ملکوں میں رہتے ہیں ان کے جسم میں درد نہیں ہوتا — میں انہیں خوش قسمت سمجھتی تھی۔ اب پتہ چلا کہ میرے حضرت عیسیٰ کا نظام ہر جگہ ایک سناچلتا ہے۔ ٹھنڈے گرم ملکوں میں ایک سا —"

"تسوے دانیاماں —"

"تسوے دانیاماں — دیکھو ہر وقت خدا کو یاد رکھا کر دو — دیکھتے نہیں خدا نے پشکن کو کیسی شہرت دی۔ لازوال، اور پھر اسے کیسی دکھ بھری موت کے حوالے کر دیا — وہ سب کچھ کر سکتا ہے کرتا ہے — ٹھنڈے ملکوں میں بھی اور گرم ملکوں میں بھی —"

جب ہم مڑنے لگے تو وہ اپنی کٹری کی کرسی پر جا بیٹھی اور کسی اور سیاح کے انتظار میں گھٹنوں پر ٹکیاں مارنے لگی۔

"اب تو میں گھر جانے والا ہوں سونیا — کیا اب بھی تم مجھے نہیں بتاؤ گی تم کہاں رہتی ہو؟"

"اب کیا فائدہ تہمرد — اب تو تم گھر ہی چلے جاؤ گے —"

وہ میرے پاس سے اچانک ہاتھ ہلاتی روانہ ہو گئی۔ ایک دوسرے کو چھونے چومنے لپٹنے کا موقع قریب آ کر آگے چلا گیا جیسے رات کے وقت کار کی بتیاں کھبے کو روشن کر کے آگے نکل جاتی ہیں۔

شاید اسے مینل سے میری فلائٹ کا پتہ چلا کیونکہ وہ مجھ سے پہلے اسٹریپٹ پر موجود تھی۔ میرے ساتھ داریا اور مینل ٹیکسی سے اترے لیکن سونیا کو منتظر پا کر جلد ہی رخصت ہو گئے۔ ان دونوں نے جس وقت مجھ سے ہاتھ ملائے تو پہلی بار مجھے احاس ہوا کہ وہ میرا ہاتھ اپنے ساتھ ہی لے جا رہے ہیں۔ مینل کی آنکھوں میں نمی تھی اور داریا اپنی مونچھوں کے بال منہ کے اندر رکھے انہیں چبا رہا تھا۔ ہم نے کوئی اوداعی جملے استعمل نہ کئے۔ خطا کہنے کھانے کی فرمائش نہ کی اور چپ چاپ رخصت ہو گئے۔

سونیا کے پاس میں سامان بک کرنے، پاسپورٹ جمع کرانے اور فلائٹ کاٹام پوچھنے کے بعد پہنچا۔ شام کے وقت عمارتوں میں جلی بنیاں بہت اداسی پیدا کرتی ہیں۔ حسب معمول اسٹریپٹ پر بہت رش تھا۔ کوئی فلائٹ نئی نئی آئی تھی۔ اس پر سے افریقہ کے حبشی کندھوں پر گٹا رنگائے جیمز پینے پیروں میں فلیٹ پہنے کمارٹ کے سروں میں ہنستے اوپر والی مٹیرہیوں سے اتر رہے تھے۔ سونیا دونوں مٹھیاں بھینچے منہ پٹا کئے سونے پر آگے ہو کر بیٹھی تھی۔

"کبھی پاکستان آؤ تو میرے پاس ٹھہرنا سونیا۔ یہ میرا ایڈریس ہے —" میں نے اسے اپنا پاکستانی کارڈ دیتے ہوئے کہا۔

"پھر روس آؤ گے — تو.... تمہیں اس سے محبت ہو جائے گی۔ ایسے ہی ہوتا ہے، ہمیشہ — میں نے دیکھا ہے۔"

"مجھے روس سے بڑی محبت ہے سونیا — روس نے دنیا کو بہت کچھ دیا ہے

کم از کم اس نے ڈیکو کر لسی کا وہ ظلم عام نہیں کرنے دیا جو جمہوریت کے خمبہ میں موجود تھا۔

”لیکن ابھی تم یہ نہیں مانتے ناں کہ اب ساری دنیا کا مستقبل سوائے کمیونزم کے اور کچھ نہیں۔“ ایک دن آئے گا مان لو گے۔

اگر کافر نیاں کے کنارے بابا جی کا آنسو میرے ہاتھ پر نہ گرا ہوتا تو شاید اس لئے اور کچھ نہیں تو اس کا دل رکھنے کے لئے میں اس سے اتفاق کرتا۔ لیکن یہ نہیں کیوں اب میں اس آنسو سے غداری نہیں کر سکتا تھا، ہمیشہ کے لئے اس نے میرے کئی اندیشے ختم کر دیئے تھے۔

”کچھ دیر کے لئے ہاں، ہو سکتا ہے چند صدیوں کے لئے کمیونزم ہی ساری دنیا کا واحد علاج ہو۔ پر کوئی انسان ساختہ ازم ہمیشہ کے لئے انسان کے دکھوں کا علاج نہیں ہو سکتا سو نیا۔ آدمی جو کچھ اپنے لئے سوچتا ہے اس میں سقم ہوتا ہے نقص ہوتا ہے۔ نا پاؤں دار کوئی پاؤں دار حل نہیں سوچ سکتا۔ جب تک آدمی اپنی رضا سے خوشی سے ہانسنے کا فن نہیں سیکھتا۔ خدا کی راہ میں دینے پر راضی نہیں ہوتا تب تک برابری کا کمیونزم سے بہتر طریقہ کوئی نہیں ہے۔“

”کمیونزم ہمیشہ کے لئے آیا ہے اور ہمیشہ ٹھہرے گا دنیا کے ایک ایک کونے میں۔“
”بھولی لڑکی۔ معصوم روح۔ پہلے فرش دھلائے جاتے ہیں۔ تالین بچھتے ہیں۔ جھنڈیاں لٹکاٹی جاتی ہیں۔ اصلی دو لہا آخر میں آتا ہے۔ حالانکہ بہت پہلے سے اس کے لئے تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ یہ تمام ازم تیاریاں ہیں۔“

”اور اصلی دو لہا کون ہے؟“

”اسلم!“ سفید چینی داڑھی والے خاموش بابا جی نے مجھ سے کھلوا لیا۔
”جیسا اسلم پاکستان میں آیا ہوا ہے۔ افغانستان ایران میں رائج ہے۔ سعودی عرب

میں جیسے اسلام کی خبریں گرم ہیں۔ وہ؟

میں نے پہلی مرتبہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ ایسے بدکی جیسے میں چڑی مار تھا اور چڑیا کپڑے کر جال میں ڈالنے والا تھا۔

”سونیا۔ یہ بھی کوششیں ہیں ادھوری ادھوری۔ نقائص سے بھری لیکن جس نظام کی میں بات کر رہا ہوں اس میں انسان کسی انسان کے خوف سے، سزا کے ڈر سے، کسی خفیہ ایجنسی سے مغلوب ہو کر اپنے حقوق نہیں چھوڑے گا بلکہ اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے ہر قربانی دے گا۔ اسے علم ہو گا کہ مخلوق کے لئے اول و آخر خالق کا حکم ہی درست ہے۔ اس نظام میں عام آدمی کو معلوم ہو گا کہ سب کچھ سچ کر ہی اللہ کا قرب حاصل ہو سکتا ہے۔ چھوٹے آدمی جنت کے لالچ میں سب کچھ چھوڑیں گے بڑے آدمی رضائے الہی کو مد نظر رکھ کر سب کچھ قربان کریں گے۔ انسان کے بنائے ہوئے کسی نظام میں یہ امید نہیں۔ بغیر امید کے نیکی کا عمل مشکل ہو جاتا ہے۔ کمیونزم میں مالی منفعت جاتی ہے۔ اس کے عوض غریبی مزدور ملتی ہے لیکن کسی قسم کی جزا کی امید نہیں ہوتی۔ ایسے نظاموں میں جب آدرشی آدمی موجود ہوتا ہے تو نظام چلتا ہے پھر ایک جنرلیشن اپنی ملکیت کی قربانی دیتی ہے۔ دوسری جنرلیشن ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ اس کو دبا کر زبردستی مناکر آدرش پر چلانا پڑتا ہے لیکن تیسری پود تک زنجیر کی کڑیاں ٹوٹنے لگتی ہیں۔ جگہ جگہ اختلاف رائے مراٹھانے لگتا ہے۔ چوری چوری۔ جگہ جگہ سوال پوچھے جاتے ہیں لیکن جواب دینے والا کوئی نہیں ہوتا۔ بتاؤ سونیا۔ عام آدمی۔ معمولی آدمی کیوں آدمی لالچی حریص۔ اس دنیا کی آرزوؤں کا پتلا۔ وہ بھلا وعدے کے بغیر کیسے نیک ہو سکتا ہے۔ کتنی دیر تک نیک رہ سکتا ہے۔“

چاہے وہ وعدہ وعدہ فردا ہی کیوں نہ ہو۔

وہ گڑ بڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ رات کی بیٹیوں میں اس کا چہرہ بہت ہی زرد

نظر آنے لگا۔

”مجھے معلوم نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔۔۔ لیکن اب اتنا ضرور ہوگا دنیا کو اپنے وسائل برابر کرنے پڑیں گے۔ غریب انسان ہمیشہ مظلوم نہیں رہ سکتا۔“
”انشاء اللہ۔“

”کیونکہ ہم ہی واحد علاج ہے۔ ساری دنیا اس کی لپیٹ میں آئے گی۔“
”ہاں آئے گی۔“

”جب تم مانتے ہو تو پھر جھگڑتے کیوں ہو۔۔۔؟“ اس نے بی سی ہانک سکڑ کر کہا۔
”اس کی لپیٹ میں آئے گی ضرور لیکن ہمیشہ نہیں رہے گی۔ جب لینن جیسے آدمی آنے بند ہو جائیں گے۔ جب مثال باقی نہ رہے گی۔ پیغام بے اثر ہو جائے گا۔۔۔۔۔“
”ہم تمہاری طرح فرد پرست نہیں ہیں۔“

”تم بھی فرد پرست ہو سو دنیا در نہ لینن لینن نہ ہو رہی ہوتی سارے روس میں۔“
”اچھا تمہارے پیغمبر کو گزرے تو چودہ سو سال ہوئے۔ تمہارے پاس تو اب مثال موجود نہیں ہے۔“

”میں نے محسوس کیا کہ بابا جی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور نظروں میں مجھے اکسایا۔“

”اول تو یہ انسان کا ساتھ ازم نہیں کہ یہ مثالوں کا محتاج ہو۔ اور پھر ہمارے لئے تو قطب ابدال ولی۔ اللہ کے نیک بندے ہر وقت آنے رہتے ہیں۔ پھر احیائے اسلام کے لئے مہدی آئیں گے۔ ہم سب حرص کے بندے مادہ پرستی چھوڑ دیں گے کیونکہ ہمیں معلوم ہوگا۔۔۔ وہاں اوپر ہمارے لئے جنت میں کوٹھیاں بن رہی ہیں یہاں دنیا میں ہمیں تقویٰ کے شناختی کارڈ ملنے والے ہیں۔“

اس نے لمبی آہ بھری اور بولی۔ ”مجھے معلوم تھا کہ مسلمان ہمیشہ متعصب ہوتا ہے۔“

”جہاں کہیں یقین کامل ہو وہاں تعصب نہیں ہوتا فقط نظر آتا ہے۔“
وہ چپ ہو گئی اور اس وقت تک چپ رہی جب تک میری روانگی کی اناؤنٹ نہیں ہو گئی۔

ہم دونوں پنج سے ایک ساتھ اٹھے۔

”میرا خیال تھا۔۔۔“ سونیانے آہستہ سے کہا۔

”میرا بھی خیال تھا۔۔۔“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

”میرا خیال تھا تم مجھے پاکستان چلنے کو کہو گے؟“ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی گلابی نمی تھی۔

”میرا خیال تھا تم مجھے ہمیشہ کے لئے روس میں رہنے کو کہو گی۔“

”آدمی کی زندگی بڑی سہولت سے گزر رہی ہوتی ہے۔ ہر طرح کا آرام میسر ہوتا ہے مینجی ٹھیک کہتا ہے کہ جب بہار باغ میں پورے جوبن پر ہوتی ہے تو کہیں سے ایک کالا ناگ نکل کر آتا ہے اور سب سے اونچی شاخ پر بنے ہوئے گھونسلے تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر پھولوں کی خوشبوؤں میں، پھلوں کے بوجھ سے لدی ڈالیوں پر رنگ ہی رنگ کے درمیان وہ گھونسلے کے تمام انڈے پی جاتا ہے۔ سونیا بولی۔

”کالا ناگ میں ہوں سونیا۔۔۔؟“

”تم نہیں۔۔۔ نہیں تم نہیں۔۔۔ وقت!“

ہم دونوں کے ہاتھ ایسے پورستہ تھے جیسے ڈالی کے ساتھ پتے۔ پھر میں نے اسے ہلکا سا جھکا دے کر اپنی طرف گھسیٹا۔ وہ میرے سینے سے آگے جیسے وہ الاسٹک کی بنی ہوئی تھی۔ چند ثانیے وہ میرے ساتھ لگی رہی۔ یہ وقفہ ہر قسم کے اختلافات سے پاک تھا۔ ہم دونوں اتنے قریب تھے جتنا نظرت نے ہمیں پیدا کیا تھا۔ پھر اس نے اپنا توازن درست کیا۔ میں نے اس کے روسی بالوں کو بوسہ دیا۔ اس نے اپنی گھڑی کو

درست کہتے ہوئے کہا:

”جاؤ سمرود — بہت دیر ہو گئی ہے۔“

ہوائی جہاز کی آخری سیڑھی پر پہنچ کر میں نے ایئر پورٹ کی طرف دیکھا —
میں روس سے پنی اپنی ڈی کی ڈگری اور ایک گہری الجھن لے کر اپنے وطن لوٹ رہا تھا۔
ساری طرف روس نہ تھا۔ ایک ادا کی تھی۔ آمدورفت کی اداسی۔

میں نے لمبی سانس کے ساتھ اپنی سیٹ پر بوجھ ڈالا۔

جہازات کی بھی کوئی انتہا نہیں — یہ پردے ہمیشہ دلوں کے درمیان حائل
رہے۔ رسم و رواج — مذاہب — ماں باپ اور بیسویں صدی کے نیم پختہ مرد عورت
کے لئے نظریات — شاید وہ ایسی کمیونسٹ نہ تھی جس کا عمل پختہ ہو۔ میں ایسا مسلمان
نہ تھا جو شمالی کھلائے — ہم دونوں کے مسک فقط نظریے تھے — لیکن بیسویں
صدی میں نظریے کی شکست میں سارے انسان کی شکست تھی۔

ہم دونوں اپنے اپنے نظریے کی وجہ سے لہروں کی طرح ٹکرائے اور پھر لوٹ
گئے — لیکن پتہ نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا جیسے وہ ترکی بڑھا کافرین کے کنارے
خم ٹھونک رہا ہو — داد دے رہا ہو کہ پٹے خوب لڑے تم!

طیارہ رات کے اندھیرے میں روس کو بہت تینچھے چھوڑ چکا تھا۔ تینچھے کہیں
اکادکار و شنیاں شہر کی سرحدوں پر روشن رہ گئی تھیں — سونیا کہیں اس اندھیرے
میں کسی بس پر کھڑکی میں بیٹھی گھر لوٹ رہی تھی۔ اس کا چھوٹا سا گیلہ رومال مٹھی میں بند
تھا اور وہ سوچ رہی تھی شکر ہے آج میں نے تھرڈ ورلڈ کے اس آدمی سے اتفاق نہیں کیا
جو میرے نظریے سے محبت نہیں کرتا تھا —

اس شکر کے باوجود جو میرے دل سے اٹھ رہا تھا اور اس اعتراف کے باوجود جو سونیا
کے دل سے نکل رہا تھا، مجھے میخیل کی ایک نظم آہستہ آہستہ یاد آ رہی تھی۔ وار یا، میخیل او

میں ”اجنبی شہید“ کی قبر دیکھنے گئے تھے۔ قریب ہی ایک نو بیا ہتا جوڑا کھڑا قبر سے
نکلنے والی پھوٹی سی جولا کھی کو دیکھ رہا تھا۔ یہ خوبصورت شعلہ قبر کے اوپر چھوٹے
سے ستارے میں جل رہا تھا۔ داریا نے مجھے بتایا تھا کہ نو بیا ہتا عموماً اس قبر پر
خراج تحبیں ادا کرنے آیا کرتے ہیں۔ پھر دلمن نے اپنی شادی کا گلہ ستہ قبر کی پائنتی
رکھا اور وہ دونوں بڑی عقیدت سے رخصت ہو گئے۔

میخیل نے اس گلہ ستے سے ایک پھول توڑ کر مجھے دیا اور اپنی نظم سنلے لگا:
”سمرود — سنو یہ نظم میں نے کسی کو نہیں سنائی۔ اس کا مسودہ بھی میں پھاڑ چکا
ہوں — لیکن یہ نظم نذرانہ ہے — نوہ — سنو۔“

میں تمہاری یاد کو اس طرح پیار کرتی ہوں
جیسے ایک پھوٹی سی لڑکی اپنی مردہ بی کو گود سے نہیں اتارتی۔
بی جو مر چکی

یادیں جو ختم ہوئیں
لیکن ابھی دفن نہیں ہو سکیں
انسان کی بد قسمتی ہے کہ اسے
ٹوٹے ہوئے گلاسوں سے
ایئر پورٹ کے مسافروں سے
اور لینن گراڈ کے ان پھولوں سے محبت ہو
جو کسی سپاہی کی قبر پر مر جھائے پڑے ہوں —

میں نے سونیا کو کبھی کوئی تحفہ نہ دیا — اس کی سالگرہ پر بھی نہیں۔
لیکن اب مجھے لگا جیسے وہ میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہو۔ میں دیر تک اسے یہ

یہ نظم کا تحفہ بار بار اُسے سناتا رہا کہ سارا روس گہرے ساندھیرے میں ایسے ڈوب گیا جیسے
 رات میں سمندر کا وجود اور اس میں سونیا کا وجود — پتیر تار رہا — — — برج کی لکڑی کا
 چھوٹا سا سفید بجرا — — — ہو لے ہو لے ڈوتا — — — پچکولے کھاتا — — — بے پوار —
 میں نظم سناتا رہا — — —

اور یہ وہ میرے ساتھ والی سیٹ پر سوئی — — —